چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

Oct 2020

سالگرہ نمبر

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

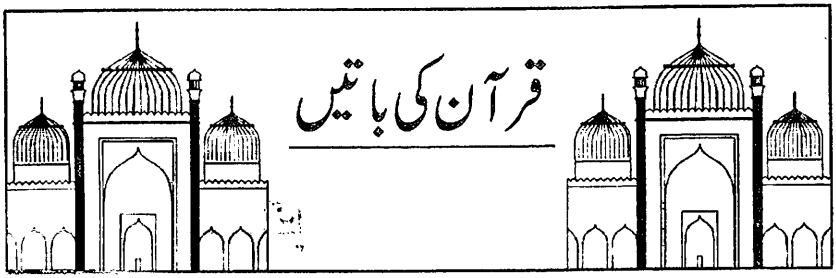

☆ آخرکار ہم نے ان پر طوفان بھیجا۔ ٹڈی دل چھوڑے۔ سرسریاں پھیلائیں۔ مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں مگر وہ سرکشی کئے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 133)

☆ مگر جو ظالم ہیں بے سمجھے اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں تو جس کو اللہ گمراہ کرے اسے کون ہدایت دے سکتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔ (سورۃ روم 30 آیت 29)

☆ اے ایمان والو نہ تو اللہ اور رسولؐ کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو اور تم ان باتوں کو جانتے ہو۔ (سورۃ انفال 8 آیت 27)

☆ اور (اے پیغمبرؐ) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو کہہ دو کہ میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہئے وہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 186)

☆ اے ہمارے رب ہم پر اپنے ہاں سے رحمت نازل فرما اور ہمارے کام میں دوستی کے سامان مہیا کر۔ (سورۃ کہف 18 آیت 10)

☆ اور بہت سے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ہی ان کو رزق دیتا ہے اور تم کو بھی اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ (سورۃ عنکبوت 29 آیت 60)

☆ اے اہل ایمان اللہ کا بہت ذکر کیا کرو اور صبح اور شام اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 41 سے 42)

☆ زمین اور آسمانوں کی پیدائش اس کی نشانیوں میں سے ہے اور یہ زندہ مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہے وہ جب چاہے انہیں اکٹھا کر سکتا ہے۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 29)

☆ اور وہی تو ہے جس نے سمندر کو تمہارے اختیار میں کیا تاکہ اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ۔ اور اس سے زیور موتی وغیرہ نکالو جسے تم پہنتے ہو (سورۃ نحل 16 آیت 14)

☆ میں قسم کھاتا ہوں پلٹنے اور چھپ جانے والے ستاروں کی، اور رات کی، جبکہ وہ رخصت ہوئی اور صبح کی، جب اس نے سانس لیا۔ (سورۃ تکویر 81 آیت 15 سے 18)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 22 شمارہ نمبر 1 اکتوبر 2020ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

مینجنگ ایڈیٹر خالد علی
چیف ایڈیٹر آصف حسن
ایڈیٹر شاہد علی
سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/90 روپے
سالانہ قیمت -/1500 روپے

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہوسکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

سکندر حبیب
16
پرانا اسکول
مشہور و معروف رائٹر کے زور قلم کی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران کردے گی

خلیل جبار
35
جنگل کا آسیب
ایک آسیب کا دل دہلاتا ناقابل یقین اور ناقابل فراموش خونچکاں شاخسانہ

رابعہ آفرین
39
زندگی
خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن دل خراش اور دل فگار دل دہلاتی خوفناک کہانی

ناصر محمود فرہاد
43
نیلا بندر
خوف کے افق پر جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی خوفناک دہشت ناک ... لرزاتی کہانی

احسان الحق
51
مہلک مرض
ایک عجیب و غریب حقیقی واقعہ جو کہ پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈال دے گا

سنبل وسیم سیالوی
55
تتلی
خراماں خراماں دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی سبق آموز کہانی

مریم فاطمہ
63
بے بس وجود
سوچ فکر اور اچنبھے میں ڈالتی عجیب و غریب ناقابل یقین حقیقت پر مبنی کہانی

افشاں رمضان
69
سچ یا وہم
دل و دماغ میں ہلچل مچاتی اور جسم و جاں میں خون منجمد کرتی خوفناک کہانی

راشد نذیر طاہر
74
جہنمی دروازہ
رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

روبینہ عبدالقدیر
99
کالی
حقیقت پر پردہ ڈالتی اچھوتی اور انوکھی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی کہانی

عنیزہ فضل داد
101
خونی پیاس
ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد، دلوں کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانی

زیبا حسن مخدوم
105
کوٹھری کا جن
کبھی کبھار مذاق بھی حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے کہانی ضرور پڑھ کر دیکھیں

کائنات رشک تنویر
108
زندگی کا ڈر
خود غرضی اور مطلب پرستی کے سمندر میں غوطہ زن دل کو مبہوت کرتی سبق آموز کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے نستی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

124 — **رقص اجل** — ہما خان
لمحہ لمحہ دل و دماغ پر سکتہ طاری کرتی خوفناک دہشت ناک کہانی

130 — **موت کی سرگوشی** — مظہر الحق علوی
ایک ایسے شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت سے نکل آیا تھا

155 — **بھٹکتی روح** — شہزاد خان
ایک عجیب و غریب خونچکاں بھونچکاں حیرتناک اور تحیر انگیز لرزہ براندام کرتی کہانی

165 — **چیل** — محمد رضوان قیوم
اس کہانی کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی خوفناک کہانی ہے

173 — **محبت ایک سایہ** — نثار فاطمہ
دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ماورائی مخلوق کی لرزہ براندام کرتی شاہکار کہانی

177 — **آسیبی بلی** — ایس امتیاز احمد
خوف و ہراس [illegible] عجیب و غریب دل پر ہیبت طاری کرتی کہانی

187 — **خونخوار بلیاں** — مرزا صہیب اکرام
[illegible] اندھیرے [illegible] خوفناک کہانی

191 — **اندھیری رات کا مسافر** — ضرغام محمود
اچھی اور بہترین کہانی، مرکزی خیال رشین ناول "ریٹرن آف دی سولجر" سے ماخوذ

203 — **آخری وعدہ** — زمر خان
دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی اور جسم کو سہلاتی ہوئی لرزیدہ لرزیدہ خوفناک کہانی

208 — **خونی سڑک** — رضوان علی سومرو
اکثر انسان مستی اور خرمستی کی وجہ سے موت کو گلے لگا لیتا ہے، دل نگار تحیر انگیز کہانی

225 — **درندگی** — محمد عثمان اشرف
ایک سفاک شخص کی درندگی کی داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کو لرزا کر رکھ دے گی

230 — **انتقام** — حافظہ مومن بخاری
خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اور دہشت پھیلاتی ایک روح کی عجیب کہانی

240 — **ایلومیناٹی** — عثمان غنی خان
ایک حقیقت پر مبنی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کر دے گی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیہارا دو بازار کراچی: 32744391

خطوط

السلام علیکم!

قارئین کرام! آپ کے ہاتھ میں سالگرہ نمبر ہے، آپ سب کی کوشش اور محنت کی وجہ سے ڈرڈائجسٹ رواں دواں ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت وتندرستی دے، خوشیوں سے نوازے، زور قلم اور دے کہ آپ سب ہر دل عزیز بن جائیں (آمین) قارئین کرام! 2020ء شروع ہوا تو ہم لوگوں پر اس کا کوئی اچھا اثر نہیں پڑا بلکہ غور کیا جائے تو پوری دنیا کے لئے 2020ء پریشانیاں لے کر آیا، ''کورونا'' نے پوری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا، بے شمار لوگ لقمۂ اجل بن گئے، لاتعداد لوگوں کو پریشانی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہی نہیں بلکہ طرح طرح کی تکالیف سے بھی واسطہ پڑ گیا، آیئے ہم سب مل کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم وکرم فرمائے۔ قارئین کرام دعاؤں میں بہت اثر ہے دعاؤں سے انسان بڑی بڑی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے، اگر غور کیا جائے تو ''کورونا'' عام وبا نہیں تھا بلکہ یہ عذاب الٰہی تھا، جو کہ پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آ گئی، نئی ایجادیں اور دوائیں دھری کی دھری رہ گئیں، انسانی بچاؤ کسی کام نہ آیا، بلکہ دعائیں کام آئیں اور لوگ آہستہ آہستہ مصیبت سے چھٹکارہ پانے لگے، دنیا کا ہر انسان اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے، اللہ سے بڑھ کر کوئی طاقتور نہیں، اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اللہ ہی کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے انسان کیا تجھ میں ایسی طاقت ہے جو تو بارش برسا دے، زمین سے اناج پیدا کر لے، سورج اور چاند کو اپنے قبضہ میں کر لے، اے انسان کیا تو موت سے بچ سکتا ہے۔ تو قارئین کرام یہی حقیقت ہے کہ صرف اور صرف اللہ ہی سب سے بڑھ کر ''طاقتور'' ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فبای الاء ربکما تکذبن ۔ ترجمہ: ''تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' قارئین کرام ہم انسان کو باہمی پیار ومحبت سے رہنا چاہئے، ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے، کسی کو حقیر اور چھوٹا نہیں سمجھنا چاہئے، اللہ عزوجل ہمارے پاکستان کو خوش وخرم اور خوشحال رکھے، پاکستان زندہ باد۔

خالد علی

مینجنگ ایڈیٹر ڈرڈائجسٹ

ھما خان کوٹ رادھا کشن سے، السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ سب سے پہلے ''قرآن کی باتیں'' سے آغاز کیا۔ ''قرآن کی باتیں'' ہدایت اور مشعل راہ کا ذریعہ بنیں۔ پھر خطوط کی محفل میں آئی۔ سب کے خطوط عمدہ تھے۔ بے چین روح، خوفناک منظر، نفسیاتی، تو دہ، خوفناک راز، پراسرار آوازیں، جلتے گلاب، بھیانک تجربہ، پراسرار دلہن، قصہ ایک رات کا، مکافات عمل، زرعون، موت کی سرگوشی، بھیانک عذاب، چڑیل کتھا، سرپرائز، خالی گھر، موت کا سلسلہ، سیڑھیاں تمام بہترین اور ڈراؤنی کہانیاں ثابت ہوئیں۔ مجموعی طور پر شمارہ اچھا تھا۔ اسی کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

☆☆ ہما صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، آئندہ ماہ بھی دلکش خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہو جائیں۔

کائنات رشک تنویر لاہور سے، السلام علیکم! تمام قارئین کو میرا سلام، اور ایڈیٹر صاحب کو بھی پلیز میرا خط ضرور شائع کرنا۔ ایک اور بات کہ میں اگست کا ڈائجسٹ نہیں پڑھ سکی، پرسنل اشو کی وجہ سے، لیکن مجھے بے حد دکھ ہوا ہے کہ آپ نے میری کہانی دو ماہ سے لائن میں نگار کھی ہے۔ اگر اسٹوری زیادہ لمبی ہے تو آپ اسے قسط وار کر دیں، باقی سب رائٹرز کو سلام، امید ہے کہ آپ سب ٹھیک ہونگے۔

☆☆ کائنات صاحبہ: آپ کا دلکش خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، امید ہے اب آپ آئندہ ضخیم کہانی نہیں لکھیں گی۔ خیر خوش ہو جائیں سالگرہ نمبر میں کہانی شامل اشاعت ہے، خوش ہو جائیں۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم.....!!! ماہ ستمبر کا ڈرڈائجسٹ بہت جلد مل گیا۔ ٹائٹل اس بار بہت ہار رتھا۔ عظیم انکل شکریہ۔۔۔!! خیر اس ماہ کا ڈر جلد مل گیا، پہلے قرآن کی باتیں پھر خطوط کی طرف چلی آئی۔ میرے خط کو پسند کرنے پر سب کی شکر گزار ہوں۔۔۔!! سب سے پہلے ڈرڈائجسٹ کو دل کی گہرائیوں سے۔۔۔!! اللہ ڈر کو سدا اسی طرح کامیابی سے ہمکنار کرتا رہے، آمین، ادارے سے وابستہ افراد سدا خوش رہیں۔۔۔!! جہاں بھی رہیں۔۔۔!! اللہ آپ کو خوشیاں دے۔۔۔!! اور ہنستے مسکراتے

[illegible]۔۔۔۔!! سب سے پہلے بات کرتے ہیں، آج کل کے خراب حالات کی وجہ سے پوری دنیا میں عجیب حالات ہیں۔ لکھا گیا ہے [illegible] کرونا کی وجہ سے چھ فٹ کا فاصلہ رکھیں، سوشل ڈسٹنس بہت ضروری ہے، مساجد میں چھ چھ فٹ کا فاصلہ، بوڑھوں کی مساجد آمد پر پابندی، اسپتالوں میں لوگ مریض کے ساتھ نہیں جاسکتے تھے۔ مریض اپنا چیک اپ کرانے خود جایا کرے، اور ڈاکٹر چھ فٹ کے فاصلے سے اسے دیکھتا ہے۔ یہ سب تو ٹھیک تھا، لیکن ایک دم سے 14 اگست کو کرونا کا ڈرامہ کم پڑ گیا، اخبارات کی سرخیوں میں آیا، اگر بیرونی دنیا کرونا کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے، تو پاکستان سے سیکھ لیں، پاکستان نے اسمارٹ لاک ڈاؤن کرکے کرونا کا خاتمہ کردیا اور اب ایک دم سے پاکستان کے روشنیوں کے شہر کراچی میں عجیب سا سیلاب آ گیا۔ جس کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں اور سیلاب اگر ہوتا تو صورتحال مزید خراب ہوسکتی تھی، اب کہاں گیا کرونا؟ کیا سیلاب کی پانی کی وجہ سے کرونا ڈر کر چھپ گیا۔ ہاؤ اسٹرینج فار دس؟ بس ایک ڈرامہ تھا، جو پاکستان کے حکمرانوں نے خوب ساتھ دے کر اسے سچ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، خیر یہ اللہ کا عذاب ہے۔ اس کا مقابلہ اب کرکے دکھائیں۔ معمولی سی بارش کا دنیا مقابلہ نہیں کرپائی۔ اس لیے کہتے ہیں اللہ سب سے بڑا پلانر ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہلتا ہے۔ جلتے گلاب آخری قسط، عثمان غنی خان کی طرف دوڑ پڑے۔ آخری قسط اتنا عمدہ لکھنے پر دل سے مبارکباد قبول کریں۔ آخری قسط میں دونوں کو ملا کر بہت اچھا اختتام کردیا ہے۔ روح کا انتقام معیاری تحریر ہے۔ سانپوں کا مسکن نے بھی بہت متاثر کیا۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: آپ کی تمام باتیں حقیقت پرمبنی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اللہ ہی دین دنیا کا خالق و مالک ہے، اللہ سے کوئی بھی مقابلہ نہیں کرسکتا، اور اللہ ہی سب سے بڑھ کر پلانر ہے، لیکن کچھ لوگ ہیں جو کہ خود کو بڑا اور طاقتور سمجھتے ہیں، حقیقت میں یہ عذاب الٰہی تھا جو کہ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، خیر اللہ ہماری کوتاہیوں اور گناہوں کو معاف کردے۔ (آمین)

عثمان غنی خان پشاور سے السلام علیکم، سب سے پہلے تو ڈر ڈائجسٹ کو دل کی گہرائیوں سے سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ ڈر اس ماہ کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ مگر چونکہ آج کل کرونا وبا کی وجہ سے گھر میں فراغت تھی، تو دو دن میں سارا ختم کرلیا۔ سب سے پہلے تو کرونا جیسے عذاب سے پورا ملک دوچار ہوگیا، پھر 14 اگست پر لاکھوں کروڑوں لوگوں کا ہر صوبے میں نا ختم ہونے والا سیلاب اُمڈ آیا۔ [illegible] موت کے منہ میں اتر گئے۔ پشاور کے حالات کچھ اچھے ہوئے۔ لوگ سیر و سیاحت کرنے چلے گئے۔ جہاں [illegible] حالانکہ بار بار سب کو منع کیا گیا تھا۔ مگر سب جیسے گھروں میں بند رہ کر تنگ آگئے تھے۔ پھر [illegible] میں شدت کی بارش و طوفان [illegible] کو [illegible] کر رکھ دیا۔ میرے جتنے بھی کراچی کے رائٹرز و ریڈرز ہیں۔ پلیز وہ اپنی خیر و عافیت سے آگاہی دیں۔

☆☆ عثمان غنی صاحب: آپ کا قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے، جب اچھے لوگ ملک کی باگ دوڑ سنبھالتے ہیں تو ملک خوشحال ہوتا ہے، عوام سکھ کا سانس لیتی ہے۔ خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک ہدایت دے۔ نئی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے، صحت و تندرستی دے۔ (آمین)

ضرغام محمود کراچی سے، تسلیمات! امید ہے مزاج گرامی بخیریت ہونگے حالانکہ موجودہ حالات میں کراچی کے باشندوں کی خیریت مفقود ہے حالیہ بارشوں نے تو کراچی کے باشندوں کو پانی پانی کردیا۔ ماہ اگست عموماً پاکستانیوں کے لئے خوشی کا مہینہ ہوتا ہے مگر اس مرتبہ کا 14 اگست میرے لئے اور میرے گھر والوں کے لئے غم کا دن بن کر آیا میرے محترم والد صاحب 14 اگست والے دن دوسری دنیا سدھار گئے ان کے گھر میں ہونے سے مجھے بہت ڈھارس رہتی تھی اب میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کررہا ہوں، والد صاحب کو قبر میں اتارتے وقت ضبط کا بندھن اس بری طرح ٹوٹا کہ بس کچھ نہ پوچھئے بار بار خیال آتا کہ ان کی گود میں کھیل کر میں جوان ہوا ان کے مشورے تھے جس نے مجھے زندگی میں کامیابی کی شاہراہ پر گامزن رکھا مگر اب لگتا ہے جیسے میں کڑی دھوپ میں بغیر کسی سائبان کے کھڑا ہوں قارئین سے التماس ہے کہ میرے والد کے لئے دعا فرمائیں۔ ماہ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ پہلی ستمبر کو میرے ایک دوست نے مجھے لاکر دیا ورنہ میں تو پوسٹ آفس میں پوچھ پوچھ کر تھک گیا تھا ان کا جواب ہمیشہ نفی میں آتا تھا آخر کار ایک دوست سے کہا تو اس نے مجھے نہ جانے کہاں سے لاکر دیا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی خطوط کی محفل پر چھلانگ لگائی اور خطوط پڑھے۔ تقریباً ہر خط میں میرے پچھلے مہینے شائع ہونے والی کہانی ''قصہ ایک رات کا'' کو ایک انڈین فلم کی اسٹوری بتایا گیا میں قارئین کو بتادوں کہ یہ کہانی ہندی کے مشہور جاسوسی ناول نگار جناب گلشن نندہ کے ناول مرڈر کیس کا ترجمہ تھی اور یہ بات میں نے کہانی کے ماتھے پر لکھ بھی

دی تھی مگر شاید ڈر ڈائجسٹ کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ وہ ماخوذ، تلخیص یا ترجمہ کے بارے میں بتانے اس لئے کہانی شائع کرتے وقت ایڈیٹر صاحب نے ترجمے والی بات نہیں لکھی اس کی وجہ سے کئی قارئین کو غلط فہمی ہوئی۔ جیسے اس ماہ شائع ہونے والی کہانی ''اندھیری رات کا مسافر'' رشین ناول ''دا ریٹرن آف دی سولجر'' سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے اور میں نے کہانی کے شروع ہی میں یہ بات لکھ بھی دی ہے یہ اور بات ہے کہ ایڈیٹر صاحب رسالے میں شائع کرتے وقت اس بات کو حذف کر دیں۔ باقی سب خیریت ہے رسالہ ابھی پڑھا نہیں ہے لہٰذا پڑھنے کے بعد تبصرہ کروں گا امید ہے آپ میرا یہ خط من وعن شائع کر دیں گے۔ شکریہ۔

☆☆ ضرغام صاحب: خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا، والدین سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ اہم نہیں ہوتا، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام اہل گھر کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین) اب جو شکایت ہوئی ہے آئندہ نہ ہوگی۔

عاصمہ خان اسلام آباد سے، ماہ ستمبر کا ڈر بہت جلد مل گیا۔ قرآن کی باتیں بہترین ہیں، خطوط کی محفل بے حد پسندیدہ ہے جہاں آپ سے اور باقی سب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ آج کل سیاسی صورتحال ملک کی ابتر ہے۔ بلقیس خان، عثمان غنی خان، کے خطوط دل کی گہرائیوں سے پسند آئے، آپ سب کو سلام! ڈر کا شمارہ اس ماہ کا اچھا تھا، جتنا پڑھا اس پر تبصرہ کر دوں، جلتے گلاب پڑ [illegible] بعد میں عثمان غنی خان کی کریزی فین بن گئی ہوں۔ حقیقی کھیل مریم فاطمہ کی بورنگ رہی، یہ تو ایسا لگا جیسے اس میں پتہ بھی [illegible] نہیں ہو، موٹر سائیکل مجھے بالکل بھی پسند نہیں آسکی، پیشین گوئی بالکل بھی..... آخری مرحلہ بہت نائس تھی۔ شیطانی رقص بہت بہت اچھی تھی۔ گیارہویں کوئل بھی ٹھیک تھی۔ جہنمی دروازہ کی نئی قسط کافی مزے دار ہے۔

☆☆ عاصمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، کبھی کبھار کوئی ہلکی کہانی شائع ہو جاتی ہے وہ اس لئے کہ نئے لکھنے والے مزید محنت کریں اور جب تنقید ہوتی ہے تو انہیں دل کی گہرائی سے اس پر غور کرنا چاہئے اور یہ حقیقت ہے کہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ آئندہ ماہ بھی خط لکھنا نہ بھولئے گا۔ Thanks۔

ایم عبدالوہاب کوئٹہ سے، السلام علیکم......!!! ڈر ڈائجسٹ ستمبر کا شمارہ جلدی مل گیا، ٹائٹل اچھا تاثر دے رہا تھا، بہت بھیانک تھا، کہانیوں کی فہرست دیکھی، پھر خطوط کی محفل میں آ گئے۔ عثمان غنی خان بھائی جو کچھ بھی کہا، ٹھیک کہا۔ باقی سب کے خطوط بہت اچھے تھے، عزازیل کہانی مصری پس منظر میں لکھی ایک اچھی کہانی ہے، پرانی حویلی بہت امیزنگ اسٹوری تھی، اچھی کہانیوں میں یہ کہانی شامل ہے۔ جلتے گلاب آخری قسط عثمان غنی خان بہت شاندار اختتام کیا ہے، سب کچھ ٹھیک کر دیا۔ بہت اعلیٰ کہانی ہے، ایسی کہانیاں لکھاری حضرات بہت کم لکھتے ہیں، سوہا اور زین کو ملا کر جیسے گویا ہمارا دل جیت لیا ہے۔

☆☆ عبدالوہاب صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کو کہانیاں پسند آئیں اس کے لئے اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کریں۔

عبیرہ فرمان کوہاٹ سے، ڈر کا ٹائٹل بہت خوبصورت تھا لڑکی بہت پیاری تھی۔ ادارے نے جو قرآن کی باتیں دی تھیں، پہلے وہی پڑھیں۔ پھر خطوط کی طرف چلے آئے، ارے واہ، عثمان غنی خان آپ کا تبصرہ بھی بہت مثبت ہوتا ہے۔ باقی سب کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ اب ہو جائے کہانیوں پر تبصرہ، اس مہینے کے شمارے میں پہلے صفحات پر کہانی عزازیل بہت اچھی تھی۔ عثمان غنی خان کی جلتے گلاب کی قسط زبردست تھی۔ کہانی کی آخری قسط بہت انٹرسٹنگ لگی، کچھ سین کہانی کے بہت جاندار تھے، کہانی پر آپ کی گرفت آخر تک قائم رہی۔ ڈاکٹر عاشر کا کردار شروع میں مجھے بہت اچھا لگا۔ مگر آخر میں اس سے نفرت ہوگئی۔ سوہا اور زین کو ملا کر دل میں ٹھنڈک کی لہریں اتر گئی ہیں۔ اب ایک اور جاندار کہانی جلدی سے لکھ کر ہمارے دل کی ٹھنڈک برقرار رکھیے گا۔ شیطانی رقص ایک جاندار اور اچھی کہانی تھی، گیارہویں کوئل اس جیسی کہانیاں خاص ہوتی ہیں، حقیقی کھیل بھی بس گزارہ لائق تھی۔ آخری مرحلہ امتیاز احمد کی بے حد خوب تر رہی، ایک رات کی بات بہت مزے دار کہانی تھی، روح کا انتقام بہت پیاری تحریر تھی۔ تپاشی بھی بہت اچھی تھی۔ گورکن اچھے انداز میں لکھی تھی۔ پرانی حویلی کہانی میں مزہ نہیں تھا۔ یہی حال اماوس کی رات کا تھا۔

☆☆ عبیرہ صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، پلیز آئندہ بھی خط اور اپنی رائے ارسال کرنا بھولئے گا مت، یہ ضروری نہیں کہ ہر کہانی سب کو پسند آئے، یعنی ''پسند اپنی اپنی'' غور کیجئے گا۔ Thanks۔

امرحہ خان ملتان سے، ماہ ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ جلدی مل گیا۔ ٹائٹل پیج بہت پیارا تھا۔ ویمپائر کی تصویر اچھی لگ رہی تھی، عثمان غنی

خان آپ نے جو بھی لکھا بہت خوب لکھا، آپ کا خط بے حد پسند آیا۔ واقعی ہمارے ملک کی صورتحال بہت ابتر ہے، خطوط میں جتنے بھی لوگوں نے تبصرے کیے تھے سب بے حد پسند آئے۔ عزازیل خوبصورت کہانی ہے۔ کچھ اس کہانی کے الفاظ بہت مشکل تھے، جو شاید قدیم مصری زبان سے لیے تھے، بٹی بیکاٹ کہانی بھی اچھی لگی۔ آخری مرحلہ ایس امتیاز احمد بھائی کی لاجواب رہی، پلیز ترجمہ کہانی کو ترجمہ کہا کریں۔ آخری صفحات پر جلتے گلاب کی آخری قسط، عثمان غنی خان کو پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ یہ ایک بھرپور لوا سٹوری ہے۔ جس میں لو ٹرائی اینگل کو خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ عثمان غنی خان، پہلی قسط سے لیکر آپ نے آخری قسط تک کہانی پر بہت مضبوط گرفت رکھی۔ کہانی بہت انٹرسٹنگ تھی، ہر کردار بہت پاور فل تھا۔ مجھے آخری قسط بہت زیادہ پسند آئی، لالچی انسان آمیزنگ کہانی ہے۔ حقیقی کھیل بہت اچھی کہانی لکھی ہے۔ گورکن بہت نائس کہانی ہے۔ اماوس کی رات چونکانے والی تحریر رہی، موٹر سائیکل اچھی کہانی ہے۔ ثنا اے شیخ، لیڈی ٹیکسی ڈرائیور کا تیسرا حصہ گیارہویں کوئل بہت خوب لائیں، مجھے ایسا لگتا ہے، اس کہانی کے مزید حصے بھی آئیں گے۔ روح کا انتقام کہانی بے حد عمدہ رہی۔

☆☆ امرحہ صاحبہ: بہت بہت شکریہ کہ آپ کو کہانیاں اور ٹائٹل پسند آیا اس کے لئے شکریہ قبول کریں، آئندہ ماہ بھی دلکش خط لکھنا یاد رکھئے گا۔ اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

انعم شاہ حسین بدین سے، السلام علیکم! ڈرڈائجسٹ ستمبر کا شمارہ ملا تو دل خوشی سے جیسے پاگل ہو گیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، کافی دل کو سکون عطا کر گئیں۔ پھر خطوط کی محفل میں چلے گئے، سب خطوط بہت اچھے تھے، عثمان غنی خان آپ کے حد اچھا لکھتے ہیں، آپ کا لکھا دل کو اچھا لگتا ہے۔ ویسے باقی سارے خطوط بھی اچھے تھے۔ دل نور آپ نے اچھا لکھا آپ اچھا لکھ رہی ہیں۔ پہلی عزازیل کہانی بہت پیاری تھی، لیلیٰ کا کردار بہت مزے کا تھا، کہانی آخر میں بالکل بورنگ ہو گئی، مگر سب ٹھیک ہو گیا۔ آخری مرحلہ نے نیا انداز اپنا کر دل خوش کر دیا۔ پیشین گوئی بہت اچھی لگی۔ حقیقی کھیل یہ کہانی گزارے کی ہے۔ روح کا انتقام کہانی خوب تر رہی، تپاشی بہت ہی پیاری تحریر رہی، سبق۔ شیطانی رقص بھی بس اچھی تھی۔ گیارہویں کوئل کہانی ایسے روانی میں پڑھی۔ کیونکہ یہ تیسرا پارٹ تھی، اس کے پہلے دو پارٹ بھی بہت نائس تھے، گورکن نائس اسٹوری ہے، کہانی عثمان غنی خان کی آخری قسط جلتے گلاب کے کچھ سین نے دل مٹی میں لے لیا۔ ایسا لگا کہ زین نے خود کو مار دیا، مگر نہیں، وہ صرف ایکٹ تھا، جلتے گلاب کا بہت شاندار اینڈنگ تھا، مجھے دل سے بہت زیادہ پسند آئی۔ ایسی کہانیاں بہت کم لکھی جاتی ہیں۔ ویڈن، اب جلدی سے کوئی اور قسط لکھیں۔

☆☆ انعم شاہ صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی رائے پڑھ کر اچھا لگا اور قوی امید ہے کہ آئندہ بھی قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا خط ضرور ارسال کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔

ہاشم محمد خان چارسدہ سے، السلام علیکم ستمبر کا ڈرڈائجسٹ جلدی مل گیا، اس ماہ کا ٹائٹل کافی شاندار تھا۔ خطوط میں بلقیس خان، عثمان غنی خان کے تبصرے دل کو چھو گئے، عثمان غنی خان سب سے پہلے جلتے گلاب کی آخری قسط پڑھی، بے حد اچھی تھی، کہانی کا اختتام بہت اچھا کیا، دو دلوں کو ملا کر جیسا کہ دل جیت لیا۔ کہانی کا مین تھیم بہت یونیک تھا، ہر کردار نے اپنی الگ انفرادیت دکھائی۔ مجھے تو دل سے پسند آئی، شاندار کامیاب کہانی پر بہت بہت مبارک باد قبول ہو، حقیقی کھیل کہانی اچھی تھی۔ آخری مرحلہ بھی خاص تحریر ہے، بٹی پسند نہیں آئی۔ گیارہویں کوئل، لیڈی ٹیکسی ڈرائیور اور گیارہواں ستون کی کامیابی کے بعد اس کا تیسرا عمدہ پارٹ بہت زبردست رہا، لالچی انسان ایک بہت پیاری کہانی تھی۔ گورکن بالکل بھی پسند نہیں آسکی، ایک رات کی بات میں بھی نکھاری نے خوب تھرل ڈالا، یہ اچھی کہانی تھی۔ تپاشی بے حد پسند آئی۔ روح کا انتقام اچھی کہانی ہے۔ پیشین گوئی کا وہی روایتی سا اینڈ تھا۔ اس ماہ کی مغربی کہانیاں بہت زبردست تھیں، ہر کہانی پر بہت محنت کی گئی تھی۔ اس لیے تو کچھ رائٹرز صرف مغربی طرز تحریر لکھ کر دل جیت لیتے ہیں۔ باقی مشرقی کہانیوں میں عزازیل، شیطانی رقص اور گیارہویں کوئل قابل تعریف ہے۔

☆☆ ہاشم صاحب: آپ کا قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل خوش ہوا، ٹائٹل کی اچھائی، کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ آئندہ ماہ بھی خوبصورت خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

کشف حسین لاہور سے، ڈرڈائجسٹ ستمبر کا جلدی مل گیا، ٹائٹل اچھا تھا جو کہ بار تاثر دے رہا تھا۔ پہلے قرآن کی باتیں دل و دماغ کو فرحت بخش سکون دے گئیں، پھر خطوط کی محفل میں چھلانگ لگا دی، عثمان غنی خان صاحب، بلقیس خان، کومل عزیزی کے

تبصرے دل کو چھو گئے، بلقیس خان کا لکھنے کا انداز بہت اچھا ہے، آپ کیوں کہانیاں نہیں لکھ رہی ہیں۔ قوس قزح کا سلسلہ بہت اچھا ہے، نئے لوگوں کے کام بہت اچھے ہیں۔ سب لوگ بہت محنت سے ڈرکی محفل میں شرکت کررہے ہیں اول کہانی عزازیل بے پسند آئی، آخری مرحلہ اچھی کہانی تھی۔ گورکن پسندیدہ رہی، روح کا انتقام بہت اچھی کہانی رہی۔ گیارہویں کوئل کہانی کافی اچھی لگی، یہ غالباً اس سلسلے کی تیسری کہانی تھی۔ حقیقی کھیل بالکل بھی اچھی نہیں تھی۔ سانپوں کا مسکن اسٹوری بورنگ رہی، ایسی کہانیاں بہت لکھی ہیں جبکہ یہی حال اماوس کی رات اور پرانی حویلی کا بھی تھا، ملتی جلتی ایسی کہانیاں ڈر میں کافی شائع ہوچکی ہیں، تپائی بہت پیاری تحریر تھی، ایک رات کی بات گڈ اسٹوری لکھی عثمان غنی خان جلتے گلاب کی آخری قسط نے کمال کردیا۔

☆☆ کشف صاحب: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی ڈر کی کہانیوں کے لئے تنقیدی اور اصلاحی رائے پڑھ کر دل خوش ہوا، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

خرم عباس فیصل آباد سے، ستمبر کا منتظلی ڈر اس بار جلدی ملا، خطوط کی محفل میں اچھے خطوط تھے۔ عثمان غنی خان آپ کا خط بہت اچھا ہے۔ سب دوستوں کے خطوط اچھے اور پسند آئے، سب کے اشعار و انتخابات بھی بہت بہت پسند آئے۔ آرٹیکل بھی اچھے لگے۔ لطائف بہت پیارے تھے۔ ٹائٹل کور اس بار ہار اور پیارا تھا۔ اول صفحات سے ڈر کو شروع کردیا، عزازیل کہانی بس ٹھیک تھی، اس رائٹر کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں۔ عثمان غنی خان جلتے گلاب کی آخری قسط خاص کر اینڈ لاجواب تھا۔ پسند آئی، گیارہویں کوئل آپ بہت زیادہ اچھا لکھتی ہیں۔ شیطانی رقص، ایک رات کی بات، روح کا انتقام گورکن، اچھی کہانیاں رہی۔ آخری مرحلہ لاجواب کہانی تھی۔

☆☆ خرم صاحب: موسٹ ویلکم ان ڈرڈائجسٹ، اور مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ بھی دلکش خط ضرور ارسال کریں گے۔ اس کے لئے شکریہ قبول کریں۔ Thanks۔

محمد اویس شاہ بخاری سید و شریف سے، قرآن کی باتیں ہمیشہ کی طرح سب سے بہترین ہیں، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے، اس کے بعد فہرست پر نظر ڈالی، پھر سب سے پہلے خطوط کی بات کرتے ہیں۔ عثمان غنی خان آپ نے کمال کا تجزیہ لکھ کر ادارے کا دل ہی جیت لیا ہے۔ ڈر کی یہ محفل بہت پر رونق ہے، دوستوں کو خوش آمدید.....! سب کو سلام۔ خط صرف جلتے گلاب کی شاندار اینڈنگ کی وجہ سے لکھ رہا ہوں، اس کے لکھاری عثمان غنی خان کو میں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دینا چاہتا ہوں، اتنی عمدہ تحریر لکھ کر دل جیت لیا ہے، کھیل حقیقی بہت خوبصورت کہانی ہے۔ گیارہویں کوئل واقعی بہت زبردست آمیزنگ کہانی تھی۔ روح کا انتقام اچھی لگی ہے، ایک رات کی بات بھی زبردست تحریر تھی۔ تپائی بھی پسند آئی۔ شیطانی رقص اچھی تھی، عزازیل بہت اچھی تھی۔

☆☆ اویس صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا، کم لکھا لیکن بہت لکھا، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کیلئے تھینکس اینڈ ویری تھینکس۔

ماہ نور شاہ ٹھٹھہ سے، ماہ ستمبر کا ڈرڈائجسٹ بہت جلد ملا اور اس بار کور بہت پیارا تھا، ماہ ستمبر کا ڈر جلد ملنے کی خوشی بہت ہوئی اور اس ماہ خطوط کافی سارے تھے۔ سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے شروعات کی، پھر خطوط کی محفل میں آئی، ارے واہ بہت اچھے تبصرے تھے، سب کو خوش آمدید اور سب کو سلام، اس بار خطوط میں عثمان غنی خان نے اچھا اور مثبت تبصرہ لکھ کر لیڈ کرلیا۔ آپ کا تبصرہ دیکھ کر خوشی سے بے حال ہوگئی۔ سب سے پہلے گیارہویں کوئل پڑھی اچھی مزے دار کہانی ہے۔ آخری مرحلہ بہت عمدہ لکھا۔ تپائی آخر تک اچھی لکھی۔ عثمان غنی خان جلتے گلاب کی آخری قسط بہت زیادہ پسند آئی، شکر ہے سوہا کا کومہ ختم ہوگیا اور بلا خرہ زین کو مل گئی۔ روح کا انتقام بہت بھرپور رہی۔ ایک رات کی بات نئی کہانی نے بہترین کہانیوں میں اپنے آپ کو منوایا اور کامیاب رہی۔ حقیقی کھیل بہترین کہانی اچھی لگائی۔ گورکن گزارہ لائق تھی۔ پرانی حویلی باقی کہانیوں میں قابل ذکر و غیرہ ہے۔

☆☆ ماہ نور صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ نئی ہیں اور آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھا لگا تو آپ نے تعریفی خط لکھا اس کے لئے آپ کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

مہربینہ غلام علی بدین سے، کراچی میں آئے سیلاب کے بعد یقیناً ادارہ بخیر و خیریت ہوگا، ڈر کا نیا شمارہ جلدی مل گیا، بلقیس نے اچھی باتیں لکھ کر سب کا دل جیت لیا۔ عثمان غنی خان، آپ میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ پہلی کہانی عزازیل بہت بے مثال تحریر ہے۔ آخری مرحلہ مدتوں یاد رہے گی۔ بیٹی کہانی بھی اچھی تھی، عثمان غنی خان جلتے گلاب کی آخری قسط آپ نے بہت پیاری لکھی ہے۔ گیارہویں کوئل بھی شاہکار کہانی خاص الخاص تحریر ہے۔ یہ ٹیکسی ڈرائیور کا تیسرا پارٹ ہے۔ شیطانی رقص بس کہانی کو جلدی ختم کیا،

پسند نہ آسکی۔ ایک رات کی بات میں نے اس کہانی کو دل سے انجوائے کیا۔ روح کا انتقام بھی اچھے موضوع پر لکھی گئی ہے، تپائی مجھے بے حد بہترین لگی، گورکن بھی بیسٹ تھی۔ باقی سب کہانیاں پڑھی نہیں، کیونکہ ملکی ماحول کی وجہ سے کچھ بھی صحیح سے مکمل نہیں ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں جان بوجھ کر کرونا کا چرچہ کیا گیا کیونکہ جو کرونا تھا وہ تو ختم ہو گیا، مگر ملک کی ابتر صورتحال ابھی تک قائم ہے۔

☆☆ مہرینہ صاحبہ: آپ کا خط دل کو چھو گیا، آپ کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کرونا ختم ہو گیا اور ملکی حالات دیگر گوں ہیں، ہر طرف پریشانی کا دور دورہ ہے۔ اللہ خیر کرے۔

مسز وجاہت حسین چکدرہ سے، اس ماہ کا ڈرڈائجسٹ بہت جلد ملا اور اس بار کور بہت پیارا تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے شروعات کر دی۔ پھر خطوط کی محفل میں آئیں، سب کے خطوط اچھے تھے، بلقیس خان میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں، کیونکہ ڈر کی سالگرہ ہے اور ملک میں سیلاب کی تباہ کاریاں بہت زیادہ جان لیوا ہے۔ عثمان غنی خان کا خط بے حد پسند آیا، سب کو خوش آمدید.....!!! خطوط میں کافی اچھی باتیں کی گئی تھیں۔ سب کے تبصرے مثبت تھے، عزازیل قابل قدر تحریر تھی، آخری مرحلہ گڈ پیاری دل سے سراہنے والی تحریر ہے۔ گیارہویں کوئل بہت اچھا نیا موضوع ہے۔ کھیل حقیقی بھی اچھی کہانی ہے، جلتے گلاب آخری قسط سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ مگر مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے مجھے پھر بھی اس کہانی کا اگلے ماہ انتظار رہے گا۔ بہت زیادہ یونیک سی کہانی تھی، دوسری کہانیوں سے کافی ہٹ کر لکھی ہوئی تھی۔ ایک رات کی بات مجھے دل سے پسند آگئی ہے۔ تپائی پسند آگئی ہے، روح کا انتقام اچھی اور پیاری کہانی تھی: باگورگن بہترین کہانی رہی۔ پرانی حویلی کہانی بہت بہت اچھی لگی۔ اماوس کی رات بے حد اچھی ہے۔

☆☆ مسز وجاہت صاحبہ: ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کو ڈرڈائجسٹ اچھا لگا تو آپ نے اپنا تجزیہ ارسال کیا اس کے لئے شکریہ قبول کریں، اور آئندہ ماہ کے لئے بھی شکریہ قبول کریں کہ آپ آئندہ بھی خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

شبینہ حسین کوہاٹ سے، جیسے ہی ستمبر کا ڈرڈائجسٹ ملا تو دل خوشی سے جیسے باغ باغ ہو گیا۔ قرآن کی باتیں بہت خوبصورت اور دیدہ زیب لگیں، دل میں سکون پہنچانے کا سبب بن گئیں، خیر خطوط کی محفل میں پہنچے۔ تبصرہ بلقیس خان نے بے حد عمدہ لکھا تھا۔ ویلڈن بلقیس خان۔ عثمان غنی خان کا خط بہت پیارا لگا۔ روبانیہ خط آپ اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔ سب کو سلام قبول ہو۔ اس ماہ ستمبر کی کہانیاں کافی اچھی ہیں۔ اس ماہ کے اچھے لکھاری عثمان غنی خان، ایس امتیاز احمد نے بہترین تحریریں لکھیں۔

☆☆ شبینہ صاحبہ: آپ کا خط پڑھ کر دل بہت خوش ہوا، ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانیوں کے متعلق آپ کی رائے پڑھ کر اچھا لگا، اور امید ہے کہ آئندہ بھی دلکش تجزیہ ضرور ارسال کریں گی۔ شکریہ۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! پچھلے دنوں جو حالات رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ زندگی تھی کہ جیسے تھم سی گئی تھی، حالات کا جو تقاضا تھا وہ ہر کام اور ہر شے کے آڑے آیا تھا۔ خیر اللہ نے رحم کیا اور حالات کو اس قابل کیا کہ زندگی ایک بار پھر رواں دواں ہو جائے، کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد ڈر کی بزم میں شرکت کر رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ ایڈیٹر صاحب، ڈر کی تمام ٹیم، اس کے رائٹرز اور اس کے تمام چاہنے والے بخیر ہوں گے گو کہ 2020ء کچھ زیادہ اچھا ثابت نہ ہوا مگر آگے اللہ رب العزت سے بہتری کی امید ہے! اب بات ہو جائے ڈر کی تو ڈر نے دو دہائیوں سے اپنے ترقی کے سفر کو، اپنے معیار کو خوب سے خوب تر کر کے بہت محنت سے طے کیا ہے اور اس کا کریڈٹ محترم شاہد علی اور ڈر کی محنتی ٹیم کو جاتا ہے۔ جنہوں نے ہر طرح کے حالات میں ہمت و محنت سے اس سفر کو رکنے نہیں دیا اور خوبصورتی سے اسے جاری و ساری رکھا۔ آج پورے سال میں سے وہ وقت قریب آ پہنچا ہے جس کا مجھے انتظار تھا اور وہ ہے ''ماہ اکتوبر'' یعنی ''ڈر کی سالگرہ'' اور کیا ہی خوشگوار اتفاق ہے کہ میں بھی اپنا برتھ ڈے اسی منتھ سیلیبریٹ کرتی ہوں یعنی اکتوبر میں! میں محترم خالد علی، محترم شاہد علی، ڈر کی ٹیم اور تمام رائٹرز کو ڈر کی سالگرہ کی مبارکباد پیش کرتی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ ''ڈر سدا یونہی کامیابیوں کے افق پر ماہتاب بن کر چمکتا رہے!'' (آمین) یہاں میں محترم شاہد علی صاحب کا ذکر خصوصی طور پر کرنا چاہوں گی۔ بلاشبہ ان کا اخلاق بہترین ہے اور وہ جس طرح سے نئے لکھنے والوں کی بھرپور انداز میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں وہ ان کا بڑا پن ہے جن کا ثبوت کئی نامور رائٹرز کی صورت میں سب کے سامنے موجود ہے۔ تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ شاعری کا بھی جواب نہیں۔ امید ہے کہ یہ تمام دوست خیریت سے ہوں گے۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: آپ کا قلمی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ میری اور قارئین کی

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں سے نوازے اور آپ کی مما کو اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی دے۔ اگر میری محنت سے کسی کو خوشی ملتی ہے تو یہ میری خوشی ہے۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔ شکریہ۔

ماریہ مسعود باتھ گوجر خان سے، السلام علیکم ماہ اگست کا ڈرڈائجسٹ 25 جولائی کو ملا، اتنے وقت بعد ڈرڈائجسٹ کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، امید ہے سب خیریت سے ہونگے۔ اور سب کو عید مبارک، کہانیوں میں ابھی چند ہی پڑھی ہیں باقی ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ سب سے پہلے مریم فاطمہ کی پراسرار آواز پڑھی بہت اچھی کہانی تھی۔ باقی عنیزہ فضل داد کی خوفناک منظر، پیاسحر کی خوفناک راز، پراسرار دلہن شہزاد خان کی، بھیانک عذاب امر شہزادیہ سب اچھی کہانیاں تھیں، موت کی سرگوشی اور جلتے گلاب دونوں کی قسطیں مس ہو چکی ہیں باقی بھی امید ہے سب کہانیاں اچھی ہوں گی اور سب کے خط بھی اچھے تھے۔

☆☆ ماریہ صاحبہ: سب سے پہلے سوری کہ آپ کی کہانی شامل اشاعت نہ ہو سکی، پلیز دو تین کہانیاں ارسال کر دیں۔ تاکہ ریگولر ہو جائیں۔ نئی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

نثار فاطمہ بہلول پور سے، السلام علیکم! میں امید کرتی ہوں کہ ڈر کا تمام اسٹاف، قارئین اور رائٹر حضرات سب خیر و عافیت سے ہوں گے سب کو میرا سلام، بہت ٹائم کے بعد خط لکھ رہی ہوں، کچھ مصروفیت کی وجہ سے نہیں لکھ سکی، لیکن مصروفیت اپنی جگہ رہی جو مصیبت کرونا وائرس جیسی مہلک بیماری کی وجہ سے پوری دنیا میں آئی ہوئی ہے، اللہ اس سے سب کو محفوظ رکھے اور ہمیں اس عذاب سے نجات دلائے۔ آمین۔ گزشتہ شمارے کی تمام کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں، کسی ایک کی تعریف کرنا سراسر زیادتی ہوگی، آپ برائے مہربانی میری کہانیاں بھی شائع کر دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

☆☆ نثار فاطمہ صاحبہ: آپ گھبرائیں نہیں، باری آنے پر آپ کی کہانیاں بھی شائع ہوں گی۔ بچوں کے میگزین کے لئے میں نے کہا تھا کہ انبیا علیہ السلام کی کہانیاں نہ لکھیں مگر آپ مصروف عمل ہیں، ویسے ڈر کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھتی رہیں، جب چھوٹی چھپ جائیں تو پھر بڑی لکھنا۔ خیر کہانی شامل اشاعت ہے۔

رابعہ آفرین لاہور سے، ہیلو ایوری باڈی! کیسے ہیں آپ سب؟ دعا ہے کہ خیریت سے ہوں، ویسے ستمبر کا شمارہ 21 کو ہی مل گیا تھا، کریڈٹ گوز ٹو ڈر اسٹاف! سب سے پہلے اس بار خلاف معمول خطوط پڑھے، جانے کیوں لیکن اس بار سب نے ہی کافی عقلمندانہ خطوط لکھے۔ پھر جمپ کیا سیدھا قوس قزح کے اشعار میں سب نے خوب رنگ جمایا اور غزل کے پورشن میں سب ہی مجھے لاجواب لگے، کسی ایک کو کہنا ناانصافی ہوگی۔ پھر حسب معمول کہانیوں کی طرف آئے تو ہر کہانی قابل تعریف ہے، کسی ایک کی تعریف کرنا ٹھیک نہیں، ہر کہانی زندہ باد، اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: قلمی نگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر اچھا لگا، امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولیں گی نہیں، کہانی تو شائع ہو گئی لیکن آئندہ پلیز خیال رکھئے گا کہ کہانی ہر طرح سے ہار، خیر اللہ تعالیٰ آپ کو زور قلم اور دے۔ Thanks۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا، اور ماہ ستمبر کا شمارہ سامنے ہے، ٹائٹل دلفریب اور خوب صورت رہا۔ Story's کا انتخاب لاجواب رہا، نئے لکھنے والے آ رہے ہیں! ڈر کا پلیٹ فارم نو آموز رائٹرز کی خوب صورت نمائندگی کر رہا ہے۔ خوب صورت لوگوں کی خوب صورت تحریر اچھ لگتی ہے۔ خوب سے خوب تر لکھنے والے خوب صورت رائٹرز کو دل کی گہرائیوں سے اچھا لکھنے پر خراج تحسین ہماری طرف سے اسٹاف کو دعا سلام اور تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ووپورز کو دعا سلام۔

☆☆ امتیاز صاحب: میٹرز جھپنے پر شکریہ قبول کریں، امید ہے قلمی نگاؤ سے لکھا ہوا تجزیہ ضرور ارسال کریں گے۔ Thanks۔

محمد عثمان اشرف راولپنڈی سے، السلام علیکم امید کرتا ہوں کہ محترم ایڈیٹر، ڈر کی ٹیم، اس کے رائٹرز اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو میں ادارہ کا بہت شکر گزار ہوں، جس نے میری پہلی کہانی انجام شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں نے تو بے شک چند بے ترتیب الفاظ لکھے۔ جس کو آپ نے سنوار کر اسے کہانی کا درجہ دیا ہے۔ جس جس نے میری کہانی کو پسند کیا۔ سب لوگوں کا بہت بہت شکریہ۔ ویسے بھی میں ڈر تقریباً 2012ء سے پڑھ رہا ہوں، میں اپنی دو کہانیاں انوکھی سزا اور فیصلے بھیج چکا ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئیں گی۔ میں اب انشاءاللہ ہارر کہانیاں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ اگر

ا پ کا تعاون رہا تھا۔ تو انشاءاللہ میرا اور ڈر کا ساتھ مزید گہرا ہو جائے گا۔ آخر میں ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ عثمان صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، متواتر کہانی ارسال کرتے رہیں، نا کہ ایک دو کہانی بھیج کر بیٹھ رہنا مناسب نہیں، آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

عامر شہزاد نگانہ صاحب سے، السلام علیکم! امید ہے کہ تمام معزز رائٹرز، ریڈرز اور ڈر کا اسٹاف خیریت سے ہوگا اگست کا شمارہ جلد مل گیا، جو مطالعہ کے بعد زیر تبصرہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ماریہ مسعود، رابعہ آفرین، محترم عثمان غنی، ذیشان سمیر، امرحہ خان، بلقیس خان، بسما خان اور سائرہ خان نے بہترین تبصرہ نگاری کر کے دل خوش کر دیا، بے چین روح، خوفناک منظر، نفسیاتی، پراسرار آوازیں، خوفناک راز، جلتے گلاب، زرغون، چڑیل کتھا، خالی گھر اور سیڑھیاں اس ماہ کی عمدہ کہانیاں ثابت ہوئیں جو واقعی ہی ڈر رسالے کے معیار کے عین مطابق ہیں۔ بقیہ کہانیاں بھی زبردست ہیں۔ کائنات رشک، ضیاب عالم، عبدالرؤف، ازمیر شاہ، موصل خان، شاہین اسلم، عمیرہ گل احمد اور ثریا کنول کو ڈر میں خوش امدید، ماریہ مسعود، ذیشان سمیر، بلال تابش، امرحہ خان، بلقیس خان، گریٹ بسمہ خان اور سائرہ خان میری کہانی پسند کرنے پر آپ سب کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ۔ آخر میں دعائے خیر ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔ (آمین)

☆☆ عامر صاحب: حسب وعدہ کہانی موصول نہیں ہوئی، غور کیجئے گا، خیر خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کیلئے بہت بہت شکریہ قبول کریں۔

اسامہ عزیز کوٹھا کلاں سے، امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے اس بار محسن بھائی ڈر ڈائجسٹ ستمبر کا جلد لے آئے۔ ٹائٹل بہت خوفناک تھا۔ پھر قرآن کی باتیں پڑھیں جو دل کو کافی سکون عطا کر گئی۔ خط سب نے بہت اچھے لکھے تھے۔ پھر گئے کہانیوں کی طرف تو عامر شہزاد کی کہانی اماوس کی رات اچھی لگی۔ مریم فاطمہ کی حقیقی کھیل پسند آئی۔ صائمہ شاہد کی کہانی موٹر سائیکل بس اچھی تھی۔ پیشین گوئی بھی اچھی تھی۔ بیٹی اچھی تھی۔ عجیب گل کی کہانی لالچی انسان پسند آئی۔ روح کا انتقام آس یراعہ کی کہانی بھی اچھی تھی۔ سانپوں کا مسکن کہانی اچھی تھی۔ شہزاد خان، گورکن، واہ کمال کر دیا۔ ثریا کنول کی کہانی پرانی حویلی آپ نے بھی بہت پیارا لکھا۔ Good اب آ گئے جلتے گلاب کی طرف واہ کیا بات ہے۔ بہت اچھا اینڈ کیا بھائی عثمان غنی نے۔

☆☆ اسامہ صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں ضلع قصور سے، السلام علیکم تمام ڈر اسٹاف، ریڈرز اینڈ رائٹرز کو ہماری طرف سے چاہت بھرا اسلام، اللہ تعالیٰ سب کو صحت و تندرستی دے اور سب کی پریشانیاں دور کرے۔ آمین۔ ستمبر کا شمارہ ملا اچھا تھا۔ کئی ماہ سے خطوط میں انٹری نہ ہو سکی۔ نادیہ ڈسکو، کومل عزیزی، نیلم خان، ہنیش اسلام، جہانگیر درانی، پریشے شیخ، سمیرہ فیصل، عائشہ عالم، ارشاد خان، آپ سبھی کو ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید۔ کہانیاں بہترین تھیں۔

☆☆ محسن صاحب: آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا اور خوشی ہوئی، جناب کہانی رہ گئی۔ امید ہے غور کریں گے، کیوں ٹھیک ہے ناں، آئندہ خط لکھنا بھولنا نہیں۔ شکریہ۔

محمد اویس بلوچ میرپور ماتھیلو سے، السلام علیکم، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہونگے، جیسا کہ میں ڈر ڈائجسٹ کا پرانا قاری اور شاعر دونوں ہوں، 2016ء اور 2017ء میں، اویس نور بلوچ کے نام سے ڈر میں مستقل لکھتا رہا ہوں۔ لیکن پھر 2017ء کے بعد ڈر ہمارے شہر کا راستہ ہمیشہ کے لئے بھول گیا۔ اس طرح سے ڈر اور میرے درمیان دراڑیں پڑ گئیں اور ہماری دو سالہ دوستی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ڈر نے تو بھولے سے بھی یاد کرنا قطعی پسند نہیں کیا، لیکن میں نے ایک دو دفعہ ڈر کو اپنی کاوش ای میل کی تھیں مگر بے سود، ڈر نے تو جواب تک دینا گوارا نہیں سمجھا۔ خیر اب دوبارہ ڈر سے ایک بار پھر دوستی کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ امید ہے اس دفعہ ڈر مجھے مایوس نہیں کرے گا۔

☆☆ اویس صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، چلئے پرانی باتیں چھوڑتے ہیں اور نیا سلسلہ جوڑتے ہیں، آپ ا سالانہ خریدار بن جائیں تو ہر ماہ آپ کو گھر بیٹھے رسالہ مل جایا کرے گا۔ اگر کوئی میٹرای میل کرتے ہیں تو فون کر دیا کریں۔ ای میل ایڈریس ڈر پر موجود ہے۔

☆☆

پرانا اسکول

سکندر حبیب- گجرات

اچانک ایک استخوانی ہاتھ خوبرو حسینہ کے کندھے سے رینگ کر گلے کی جانب آنے لگا ایسا خوفناک ہاتھ کسی نے زندگی میں نہیں دیکھا تھا.....

مشہور و معروف رائٹر کے زورِ قلم کی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران کر دے گی

فروری کے شروع ایام میں مجھے شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ شادی میرے جگری دوست عارف محمد خان کی تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی آرمی، ایس، ایس جی کمانڈر کی ٹریننگ لے رہے تھے۔ عارف بڑا ہنس مکھ اور ملنسار شخصیت کا حامل انسان تھا۔ ایک ماہ قبل ٹریننگ کے دوران اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی شادی طے ہوگئی ہے۔ تمہیں ہر حال میں آنا پڑے گا۔ پہلے تو میں بہت ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ مگر اس کے بے حد اصرار پر مجھے راضی ہونا پڑا۔ اس کا گاؤں سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ علاقے میں تھا جہاں میں ایک بار پہلے جا چکا تھا۔

دعوت نامہ ہاتھ میں لیے بڑے صاحب قدردان کے حضور جا کھڑا ہوا۔ میری ایڑیاں مکانیکی عمل کے تابع آپس میں مل گئیں۔ اور ہاتھ سیلوٹ کے لیے اٹھ گیا۔ بڑے صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اور بولے۔ میں تمہاری اور عارف کی دوستی کو خوب جانتا ہوں۔ اس لیے تمہاری چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ جاؤ اسے میری طرف سے بھی مبارکباد کہہ دینا۔

"تھینک یو سر.....!" میری ایڑیاں پھر آپس میں ملیں اور میں مسرت و گیان کی ملی جلی کیفیت سے باہر آ گیا۔

میں ایک سال قبل عارف کے گاؤں آیا تھا۔ اس وقت یہ اتنا عام نہ تھا۔ ایک بار میں نے سنا تھا یہ گاؤں مغلوں کے دور کا ہے۔ مگر اب کی بار اس میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب ہو چکا تھا۔ اس کی زمین کافی زرخیز تھی۔ جس کی بدولت اطراف میں لہلہاتے کھیتوں کا ایک وسیع سمندر میلوں پھیلا ہوا تھا۔

عارف کا گھر گاؤں کی بڑے نکڑ میں تھا۔ مجھے سامان سے لدا پھندا دیکھ کر اس کی بانہیں میرے استقبال کے لیے اٹھ گئیں۔ اس کے گھر والے قریباً سبھی مجھے جانتے تھے مگر ایک بار پھر اس نے سب کے سامنے میرا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا۔

رات کو رسم حنا منعقد ہوئی۔ سب کی دیکھا دیکھی میں نے بھی عارف کے سر پر تیل لگایا اور مٹھائی کھلائی۔ یہ رسم پنجاب کے بیشتر علاقوں میں مقبول ہے۔ مایوں بیٹھنے کے بعد دولہے کو مہندی لگائی جاتی ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے باری باری سر پر تیل لگانے کے بعد مٹھائی کھلاتے ہیں۔ ساتھ میں اس کی ہتھیلی پر پیسے رکھنے کا بھی رواج ہے۔ جس سے دولہے کی اچھی خاصی رقم بن جاتی ہے۔ مایوں کی تقریب رات گئے تک جاری رہی۔

Bar

سویرے سے بارات کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ میں بن ٹھن کر چھت پر آ گیا۔ چھت کی منڈیر پر بنی چارفٹ کی دیوار پر بازو جمائے۔ میں اپنے خیالوں میں محو تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں ایک ہلکا سا نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو مبہوت ہی رہ گیا۔ کیونکہ میرے سامنے ایک حسن و جمال کا لاجواب شاہکار تھا جس کی سیاہ زلفیں ہلکی ہلکی لہراتی اس کے چمکتے گالوں کی بوسہ کشی کر رہی تھیں۔ یاقوتی ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے وہ پری پیکر کھڑی تھی۔ وہ تخت شاہی جس کو پانے کے لیے کئی شہنشاہ اپنی زندگی کے چراغ گل کر چکے ہوں۔ وہ لڑکی واقعی حسن و شباب کا مجسمہ تھی۔

''ارے فوجی صاحب کن خیالوں میں ڈوب چکے ہو۔ اس کی مترنم آواز کے ساتھ چوڑیاں بھی کھن کھن بجنے لگیں۔

''جی میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' میں نے اس کے گلابی سوٹ کا سراپا جائزہ لیا۔

''جان پہچان..... وہ مسکرائی، یہ بھی کر لیں گے فی الحال آپ کو نیچے عارف بھائی یاد کر رہے ہیں۔ نیچے آیا تو مہمانوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ مہ جبینوں کے قہقہے ہر سو گونج کر اس تقریب میں جان ڈال رہے تھے۔ ہاتھوں میں موتیاں کی کلیاں ڈالے تتلیوں کی طرح ادھر ادھر چہکتی شوخیاں بھرتی لڑکیاں، جن کی موتیا کلیوں سے بھینی بھینی خوشبو نے پورے گھر میں طلاطم برپا کر رکھا تھا۔ رنگا رنگ تقریب کا کیا عالم تھا۔ سب کے ہونٹوں پر مسرت کے پھول کھلے ہوئے تھے عارف سج دھج کر ایک بڑے صوفہ نما کرسی پر بیٹھا ہوا آج وہ دولہے کے روپ میں کتنا وجیہہ شکل تھا۔ ورنہ آرمی میں رہ کر یہ حالت کہاں بنتی ہے۔ آس پاس کھڑی رشتے دار اسے سہرا بندی کی رقم دے رہی تھیں۔ جسے پاس بیٹھا ایک لڑکا پوری ایمان داری سے لکھ رہا تھا۔ یہ بھی پنجاب کی ایک پرانی رسم ہے۔

''دلاور! بڑی خالہ کو تم سے کوئی ضروری کام ہے۔ وہ سامنے کمرے میں ہیں۔'' عارف بولا۔ میں ان کے پاس کمرے میں چلا گیا۔ یہ عارف کی سب سے بڑی خالہ تھیں۔ ایک بار :ب میں اس کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بڑی دلدار اور اچھے اخلاق کی خاتون تھیں۔ جوانی میں کبھی خوبصورت رہی ہوں گی مگر پچاس سالہ عمر نے بڑھاپا عیاں کر رکھا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی اپنی ہم عمر کی خاتون سے گپ شپ لگا رہی تھیں۔

میں نے بلند آواز میں سلام کیا اور ان کا حال احوال پوچھا۔ انہوں نے پرتپاک طریقے سے سلام کا جواب دے کر اپنے پاس ہی بیٹھا لیا۔

''ریحانہ یہ اپنا دلاور فوجی ہے۔ عارف کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ بڑا نیک اور شریف بچہ ہے میں ایک بار اس سے مل چکی ہوں۔'' خالہ نے شفقت سے سر پر ہاتھ بھی پھیر دیا۔ اب ایک سال بعد صورت دیکھائی ہے اس نے۔''

''بڑا سہونا گبھرو جوان ہے آپا شالا جوانیاں مانے پتر۔'' دوسری خاتون نے ٹھوس پنجابی لہجے میں بلائیں لینے لگی۔

''دلاور بیٹا۔ باقی باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ موبائل تو چیک کرنا۔ خالہ ہو میں نا جانے اس کم بخت کو کیا ہو گیا ہے۔ نا کال آ رہی ہے نا جا رہی ہے لینی لے گئی تھی معلوم نہیں کلموہی کیا کر لائی ہے۔ چل ہی نہیں رہا۔ عارف بتا رہا تھا دلاور موبائل ٹھیک کر لیتا ہے۔'' انہوں نے ایک نیچ اسکرین والا مہنگا سا موبائل مجھے پکڑا دیا۔

''میں اکثر موبائل رپیئرنگ کر لیتا تھا۔ یہ کام میں نے ایک دوست سے سیکھ لیا تھا جس کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔

''ارے آپا آپ لڑکیوں کو موبائل دیتی ہی کیوں ہیں۔'' دوسری خاتون خالہ سے مخاطب ہوئیں۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں موبائل شرم کی بات ہے۔ توبہ

توبہ، اللہ بچائے آج کل کی لڑکیوں سے، ایک نمبر کی شیطان اور نٹ کھٹ ہوتی ہیں ذرہ بھی شرم حیا باقی نہیں رہی۔ فیشن کرتی ہیں تو ایسا لگتا ہے۔ بندر میاں بن سنور کر سسرال جارہے ہیں۔''

''سچ کہا نصرت! خالہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔ کیا بھلا دور تھا۔ ہمارا تمہارا جوان لڑکیاں جب کسی غیر مرد کو دیکھ لیتی تو فوراً گھونگھٹ نکال لیتیں۔ باہر نکلتیں تو اپنا باپ دادا کیا۔ محلے کا دوسرا آدمی دیکھ کر فوراً سر پر دوپٹہ اوڑھ کر نکل جاتیں۔ شرم وحیا اتنی تھی کہ کبھی کبھی اپنے ہی مرد سے لاج آنے لگتی۔ اور آج کے دور کی لڑکیاں..... اُف اللہ.....'' خالہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔'' دوپٹے کو یوں خود سے الگ کر کے پھینک دیا ہے جیسے کوئی مکروہ شے ہو۔ اب میری لبنیٰ کو ہی دیکھ لو چھ بھائیوں کی اکلوتی ناز ونعم سے پلی بہن۔ مجال ہے جو میری ایک بات بھی مانتی ہو۔ صبح سے بن سنور کر کبھی ادھر تو کبھی ادھر پھدک رہی ہے میں کہتے کہتے تھک گئی۔ لڑکی سر پر دوپٹہ لے لو۔ ادھر ادھر مت پھرو۔ پرائے مرد دیکھ کر کیا سوچیں گیں۔ کتنی بے شرم لڑکی ہے۔ لیکن ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا کر رفو چکر ہو جاتی ہے۔''

''آپا! آپ کی لبنیٰ کیا، میری نجمہ تو اس سے دو دو ہاتھ آگے ہے۔'' نصرت خالہ بھی شروع ہو گئیں۔ پیروں میں پازیبیں ڈال کر چھن چھن کرتی پھر رہی ہے۔ بہت روکا بہت ٹوکا، مگر کہتی ہے امی یہ تو آج کل کا فیسن ہے۔ اب بھلا پیروں میں ہجڑوں کی طرح گھنگھرو باندھنے کو فیشن کہتے ہیں۔

میں دونوں خواتین کی دلچسپ باتیں سن کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دل چاہا قہقہہ لگاؤں سمجھ نہیں آرہا تھا۔ یہ اپنی بیٹیوں کی عیب جوئی کر رہی ہیں۔ یا فیشن کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار..... بہر حال میں نے موبائل ٹھیک کر کے ان کو پکڑا دیا۔

''اللہ تجھے خوش رکھے بچے۔ میری بہت بڑی مشکل آسان کر دی۔ مگر میرا مزید ایک کام کر دو۔ ساتھ والے گھر میں جانا لبنیٰ وہاں پر ہے۔ اس سوٹ کیس کی چابی تو لے آنا۔ میں عارف کے لیے سونے کی انگوٹھی لائی ہوں۔ سوچتی ہوں ابھی پہنا دوں۔ پھر وقت لگے نہ لگے۔''

''خالہ یہ لبنیٰ کون ہے، میں تو اسے نہیں جانتا۔'' میں نے خالہ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ارے تو کتنا بھولا ہے۔ وہ تمہیں جانتی ہے۔ تم اسے نہیں جانتے جب تم پہلے یہاں آئے تھے تو وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ جو ابھی تجھے چھت پر بلانے گئی تھی۔ وہی لبنیٰ ہے۔ اگر پھر بھی معلوم نہ ہو تو کسی سے وہاں پوچھ لینا۔''

لبنیٰ عارف کی خالہ کی بیٹی تھی۔ بتول خالہ وہ مجھے جانتی ہے۔ ہوسکتا ہے میں جب پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا ہو۔ میں وہاں سے ساتھ والے گھر میں آ گیا۔ یہ عارف کے چھوٹے چچا کا گھر تھا۔ یہاں مہمانوں کی خطیر تعداد نے ادھم مچا رکھا تھا۔

''باجی سنیے! یہ بڑی خالہ کی بیٹی لبنیٰ کہاں ہو گی۔'' میں نے عارف کی بڑی بہن سے پوچھا۔

''ہاں وہ اوپر ہے۔ مگر خیریت تو ہے۔'' انہوں نے ہونٹوں پر تبسم بکھیرا اس کے پاس بکس کی چابی ہے۔ مجھے خالہ نے بھیجا ہے۔ وہ چابی اس سے لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ میرے پیچھے آؤ۔'' وہ آگے بڑھیں تو میں ان کے تعاقب میں چل پڑا۔ ہم ایک طرف بنے بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ میں نے دیکھا وہ مہہ جبیں نازنین ستم گر اپنے سڈول ہاتھوں میں مہندی لگا رہی تھی۔ جس کے بازو گلشن بہار کا موسم پیش کر رہے تھے۔

لبنیٰ دلاور کو بریف کیس کی چابی دے دو۔ بے چارا خالہ کا حکم سن کر تمہارے پیچھے بھاگا چلا آیا ہے۔'' باجی طنز ومذاق کے جملے بول کر وہاں سے نکل گئیں۔

''چابی ہی چاہیے تھی نا۔ تو باجی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اکیلے نہیں آسکتے تھے۔ سچ ہی کہتے ہیں لوگ۔ فوجی ہوتے ہی پاگل ہیں۔'' اس کے سحر انہ آواز میرے اعصاب پر مسلط ہونے لگی۔ اس نے چابی

میرے ہاتھ میں رکھ کر میری آنکھوں میں ناجانے اس کی طلسماتی آنکھوں میں کونسا جادو تھا۔ جس کے بھنور میں ڈوبتا چلا گیا۔

''اب یہاں بت بنے کیوں کھڑے ہیں۔ جائیں ورنہ امی نے پورا گھر سر پر اٹھا لینا ہے۔'' اس نے میرے بازو سے پکڑ کر ہلکا سا ہلایا۔

''آپ کی شخصیت ہی ایسی ہے۔ لبنیٰ جی جو ایک بار دیکھے بس آپ کا ہی ہو کر رہ جائے۔'' میری بات سن کر اس کے چہرے پر دھنک کے سات رنگ مچلنے لگے۔ میں نے چابی مٹھی میں دبائی اور خالہ کے پاس آ گیا۔

کچھ دیر بعد کسی چشم براہ نے سب کو اطلاع دی۔ برات تیار ہے۔ بمشکل جلد ہی برآت کی روانگی ہوگئی۔ اور مغرب کے بعد اس کی واپسی ہوئی۔

دلہن کو عجلہ عروسی میں بیٹھا کر عارف کچھ کزنز جن کو خالہ زاد پھپھو زاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایک ڈھولکی پر جت گئیں۔ بے چاری ڈھولکی سراپا احتجاج چیخ چیخ کر اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کی دہائی دے رہی تھی۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند مجھ پر حاوی ہونے لگی۔ میں چھت پر سونے کے لیے چلا گیا۔

صبح کی پہلی کرن جب میرے پاس دستک دینے لگی تو میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو سبھی غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ پتہ نہیں رات کتنی دیر تک انہوں نے ڈھولکی کو ٹارچر کیا تھا۔ میں نے نیچے آ گیا۔ ایک طرف بیٹھے چند بڑے بزرگ دعوت ولیمہ کے لیے مشاورت کر رہے تھے۔ میں نے چہرے پر پانی کے دو تین چھینٹے مارے اور گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر شبنم کے ننھے ننھے قطرے گھاس کے اوپر بکھرے پڑے تھے۔ جن کے اوپر آفتاب کی دھوپ ہفت رنگی شعاعیں ڈال رہی تھی۔ میں جس جگہ کھڑا تھا۔ یہ گاؤں سے باہر ایک چوراہا تھا۔ جہاں سے ایک پکا راستہ کھیتوں کی جا رہا تھا۔ میں اس راستے پر چل پڑا۔ اچانک میری نظر ایک پرانے سے کھنڈر پر پڑی۔ جو وہاں سے پانچ چھ ایکڑ کے فاصلے پر ہوگا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ یہ کھنڈر بالکل الگ تھلگ اور عجیب سا تھا۔

''لگتا ہے یہ کوئی پرانی عمارت ہے۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں اپنے تئیں بولا۔ اور قدم اس طرف بڑھا دیئے۔ اس بارہ فٹ کا یہ راستہ گاؤں والوں نے کچی اینٹوں سے جوڑ دیا تھا۔ جس کے اطراف میں ہری بھری فصل اپنی بھرپور ٹھنڈک پیش کر رہی تھی۔ سامنے سورج مشرق سے سر اٹھا رہا تھا۔ جس کی دھوپ سے فصل پر پڑے شبنم کے قطرے ہیروں کی مانند چمک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میں عمارت کے پاس پہنچ گیا۔ دو کنال پر مشتمل وہ واقعی کوئی بہت پرانی مگر وسیع عمارت تھی اس کی آٹھ نوفٹ کی چار دیواری اب بھی قائم و دائم تھی۔ صرف ایک طرف سے دیوار کا کچھ حصہ گر چکا تھا۔ جہاں کانٹوں والی تار دیوار کی پورت میں نصب تھی۔ یہ شاید گاؤں والوں نے لگائی ہوگی۔ تاکہ کوئی جانور وغیرہ اندر داخل نہ ہو سکے۔ میں اتنا تجسس پسند آدمی تو نہیں تھا مگر نا جانے میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس عمارت کو قریب سے دیکھوں۔ میں چلتا ہوا دیوار کے پاس آ گیا۔ جہاں اس کی اونچائی کچھ کم تھی۔ پھر ادھر ادھر دیکھا اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک کافی بڑا احاطہ تھا۔ جس پر بھنگ، سرپوٹ، دت اور نا جانے کون کون سی بوٹیوں کی بہتات تھی۔ جڑی بوٹیاں اس قدر قد آور تھیں کہ اگر دن کے وقت بھی کوئی ان میں چھپ جائے تو آسانی سے ملنا مشکل تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت اس قدر خستہ حال تھی کہ بیرونی دیواروں کا جگہ جگہ سے پلستر ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ اوپر والی منزل پر دو ہی کمرے نظر آ رہے تھے۔ جن کی کھڑکیوں کے پٹ ٹوٹ چکے تھے۔ اب صرف خالی کوڑ ہی رہ گئے تھے۔ میں کچھ دیر تک اس کو یونہی دیکھتا رہا پھر بوٹیوں کو ہاتھ سے ہٹاتا ہوا اس راہداری کی طرف بڑھ گیا جو اندر داخل ہوتی تھی۔ بالائی منزل چار کمروں پر محیط تھی۔ جس کے درمیان میں لمبی راہداری تھی۔ یہ راہداری سامنے دیوار پر ختم ہوتی اور پھر وہیں سے چھت کی طرف سیڑھیاں نکل جاتیں۔ دو دو کمرے

راہداری کے دائیں بائیں تھے۔

پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا۔ضرور یہ کوئی بہت پرانا اسکول ہے۔ پھر میرا اندازہ اس وقت صحیح نکلا۔ جب میں راہداری پر پاؤں دھرتا اندر داخل ہوا میرے بائیں ہاتھ پر بنے کمرے میں بہت سارے ڈیسک اور بینچ پڑے تھے۔ یہ ڈیسک اور بینچ اس دور کے معلوم ہوتے تھے۔ جب کبھی پاکستان قیام میں نہیں آیا تھا۔ میں اس کمرے میں داخل ہوگیا۔ لکڑی کے بنے مضبوط ڈیسک اور بینچوں پر آج اس قدر مٹی اور دھول کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جن پر بیٹھ کر کسی زمانے میں طلبہ اور طلبات پڑھتے ہوں گے۔ سامنے دیوار پر قریباً تین فٹ کی اونچائی پر ایک بلیک بورڈ نصب تھا۔ جس پر کبھی لکھا جاتا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کمرے میں اور کچھ خاص نہ تھا۔ ان کو کچھ دیر دیکھنے کے بعد اس کے سامنے والے کمرے میں آ گیا۔

اس کمرے میں چار پانچ پرانی سی کرسیاں اور ایک میز رکھا ہوا تھا۔ ان پر بھی مٹی اور گرد اس قدر پڑی تھی۔ جیسے برسوں سے کوئی نہ آیا ہو۔ ضرور یہ اس اسکول کا اسٹاف روم تھا۔ جہاں دوپہر کو اساتذہ آ کر گپ شپ لگایا کرتے ہوں گے۔ وہاں سے نکل کر اس کے ملحقہ کمرے میں آ گیا۔ یہاں پر ایک لکڑی کی الماری ایک بڑے سی کرسی اور ایک چھوٹا سا میز رکھا تھا۔ یقیناً یہ کمرہ ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کا ہوگا۔ الماری بند تھی۔ اس کی کنڈی پر زنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا اس تالے کو توڑ کر دیکھوں۔ الماری کے اندر کیا ہے۔ لیکن کچھ توقف کے بعد ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس میں فائلیں یا رجسٹر وغیرہ ہوں گے اس کے بعد راہداری کو عبور کر کے آخری کمرے میں آ گیا۔

یہاں پر تاریکی تھی۔ لہٰذا مجھے موبائل کی ٹارچ روشن کرنا پڑی۔ یہاں پر بھی ڈیسک اور بینچ موجود تھے۔ یہاں پر مٹی اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ جیسے کوئی ہاتھوں سے ڈال کر گیا ہو۔ در و دیوار پر اتنے جالے تھے۔ دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔ لگ تو ایسے رہا تھا۔ پورے گاؤں کے کیڑے یہاں آباد ہو گئے ہوں۔ اس کمرے کی نسبت پہلے کمرے صاف تھے۔ میں نے ایک پل بھی وہاں رکنا گوارہ نہ کیا اور راہداری میں آ گیا۔ یہاں سے سیڑھیاں اوپر کی طرف جاتی تھیں۔ موبائل کی روشنی آن رکھے، سیڑھیوں پر پاؤں دھرتا اوپر آ گیا۔

یہاں بھی دو کمروں کے وسط میں چھوٹی سی راہداری تھی۔ ابتدائی کمرے میں ڈیسک اور بینچ موجود تھے، مگر یہاں کی تعداد کم تھی۔ ایک انوکھی بات یہ تھی۔ کہ یہ کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ نہ کوئی جالا، نہ دھول مٹی غلاظت..... ڈیسک اور بینچ جس ترتیب سے رکھے تھے لگ تو ایسا رہا تھا کہ روز کوئی پڑھنے آتا ہے۔ یہاں پر بھی دیوار میں تختہ سیاہ نصب تھا۔ اس کمرے کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں آمنے سامنے دو کھڑکیاں تھیں۔ جس کے دونوں پٹ نا جانے کب سے ٹوٹ چکے تھے۔ میں ایک طرف کھڑکی کے پاس آ گیا۔ یہاں کواڑ سے سارا گاؤں اور کچھ کھیت کھلیان دکھائی دینے لگے۔ ایک دو پل وہاں رکنے کے بعد اس کی متفاد کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس ٹوٹے کواڑ سے اسکول کا احاطہ، چار دیواری اور دور دور تک کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اوپر سے منظر اوپر سے منظر کافی دلکش اور دلفریب تھا۔

سورج کی کرنیں کواڑ سے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ دو چار منٹ وہاں رک کر میں نے اگلے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کا دروازہ کافی آگے نکڑ میں تھا۔ یہ انوکھی بات تھی صرف اسی روم کا دروازہ تھا۔ باقی اوپر نیچے والے ایسے ہی تھے۔

لکڑی کے بنے بوسیدہ دروازے پہ کچھ عجیب طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ موبائل کی روشنی میں بھی واضح نہ ہوئے۔ ایک طرف کسی زبان میں کچھ لکھا ہوا نظر آیا مگر میں وہ پڑھ نہ سکا میں نے موبائل بائیں ہاتھ میں پکڑ کر دائیں ہاتھ سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ چرچراہٹ اور عجیب سی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا مجھے تو ایسا لگ رہا تھا جیسے اکھڑ کر میرے اوپر ہی آ گرے گا۔ اندر اس قدر اندھیرا تھا۔ جیسے گہری قبر ہو۔

میں نے موبائل کی روشنی اندر ڈالی۔

اُف خدا کی پناہ..... بہت ساری چمگادڑیں، چھت کے ساتھ لٹکی ہوئی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی لال آنکھیں روشنی سے ایسے چمکنے لگیں۔ جیسے چھوٹے چھوٹے انگارے ہوں۔ روشنی پڑتے ہی وہ یک دم سے پھڑ پھڑانے لگیں۔ ان کی چوں، چوں، چیں، چیں جیسی آوازیں سن کر مجھے ایسا لگا۔ جیسے ابھی مجھ پر جھپٹ پڑیں گی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ چمگادڑوں کی اتنی خطیر تعداد اگر مجھ پر حملہ کر دے تو شاید کوئی میری مدد کو نہ آتا، دیہاتی ہوتے ہی توہم پرست ہیں۔ بھوت پریت کا چکر سمجھ کر الٹا مجھے کوس ڈالتے۔ میں فوراً نیچے آ گیا۔ احاطے میں کچھ دیر رک کر ایک بار پھر میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اسکول کافی پرانا تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی۔ اس کا سامان ابھی تک موجود تھا۔ ابھی تک کسی چور اچکے کی نظروں سے کیسے محفوظ رہا۔ یہ بات ہضم نہ ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے ہی دیوار پھاندی اور باہر آ گیا۔ ابھی میں وہاں سے دو قدم ہی واپسی کی طرف چلا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز نے مجھے روک لیا۔

وہ کوئی بوڑھا سا دیہاتی تھا جس نے کندھے پر ایک چولا سا لٹکا رکھا تھا۔ اور دور سے ہاتھ میں درانتی (گھاس کاٹنے والا آلہ) اس انداز میں پکڑ رکھی تھی جو آس پاس کے کھیتوں سے گھاس کاٹ کر اپنے چولے میں ڈال رہا تھا۔

''پتر کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' وہ اپنی بوڑھی نگاہوں سے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اپنے اور عارف کے تعلقات کے بارے میں بتایا۔ اور یہ بھی کہا کہ میں یہاں مہمان آیا ہوں۔ صرف عمارت کو دیکھنے کی غرض سے اندر گیا تھا۔

''پتر شاید تجھے پتہ نہیں۔ یہ جگہ بڑی منحوس ہے۔ آئندہ کبھی اس کے اندر مت آنا۔'' بوڑھے نے نصیحت آمیز انداز میں کہا۔

''مگر بزرگو! ایسا کیا ہے اس عمارت میں.....'' میری تجسس حس پھڑکنے لگی۔

''پتر! یہ انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا اسکول ہے۔ مگر ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے یہ جگہ ہندوؤں کے مندر کی تھی۔ انگریزوں نے یہاں قبضہ کر لیا پھر مندر مسمار کر کے یہاں اسکول بنا دیا۔ وہ تو یہاں سے چلے گئے مگر یہ ویران ہو گیا۔ مسلمان ان سے نفرت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا الگ اسکول بنا لیا۔

جب بھی رات ہوتی ہے تو یہاں سے بڑی عجیب عجیب سی آوازیں آتی ہیں۔ اوپر والی کھڑکی کے پاس کسی نوجوان لڑکی کو بھی دیکھا گیا ہے۔ اس کی پازیبوں کی آواز رات یہاں سے گزرتے بہت سے لوگوں نے سنی ہے۔ چند ایک آدمیوں نے اسے یہاں باہر اس جگہ پر کھڑے دیکھا ہے۔ سنا ہے لڑکی بڑی خوبصورت ہے۔ بڑے مہنگے زیور اور قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ مگر کچھ لوگوں نے ایک بدصورت و خوفناک چڑیل کو بھی یہاں اکثر دیکھ چکے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دونوں روپ ایک ہی لڑکی کے ہیں۔ اب اللہ ہی جانے کیا سچ ہے کیا جھوٹ.....ہم تو دن کے وقت بھی اس کے اندر نہیں جاتے۔ رات کو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ہمارا مویشی جانور اس کے اندر جاتا ہے تو ہم اس کے پیچھے بھی نہیں جاتے پچھلے دنوں مسلسل بارشوں کی وجہ سے اس کی ایک دیوار گر چکی تھی۔ لہٰذا گاؤں والوں نے مل کر وہاں کانٹے دار تار کی باڑ لگا دی۔ تاکہ کوئی انسان تو کیا جانور بھی اندر نہ جا سکے۔''

''بابا جی! آپ کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ آج کل کے دور میں یہ من گھڑت قصے کہانیاں محض سنی سنائی باتیں ہیں۔ میں ایسی دقیانوسی باتوں کو ہرگز نہیں مانتا۔ جو تو ہم پرستی پر مشتمل ہوں۔ یہ صرف آپ لوگوں کا وہم ہے اندر کا ڈر ہے اور کچھ نہیں۔ میں نے بے یقینی سے انداز میں جواب دیا۔

اگر تجھے میری باتوں پر یقین نہیں تو جا کر عارف کے ابا سے پوچھ لے اب میں چلتا ہوں۔'' وہ بزرگ وہاں سے ایک طرف چلا گیا۔ مجھے اس کے دماغ پر

دلاور اور ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ سجا کر گھر آ گیا۔

دعوت ولیمہ کی تیاریاں پورے جوش و خروش پر تھیں۔ سب لوگ بیدار ہو چکے تھے۔ کیونکہ اب سورج اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ گھر میں وہی افراتفری کا سماں چھایا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا۔ اس بوڑھے کی باتوں کو نظر انداز کر دوں۔ پھر نہ جانے تجسس کی ایک موسوم سی لہر میرے دماغ میں پلنے لگی۔ اسکول کے دورازے سے پردہ اٹھانا چاہیے۔ اس سلسلے میں مجھے عارف کے ابا سے ملنا تھا مر شاید ابھی یہ پوچھنا مناسب نہ تھا۔ ہوسکتا ہے مہمانوں کی موجودگی میں اس کے ابا کو مناسب جواب نہ دے پائیں۔

''دلاور صاحب صبح سے کہاں گم تھے۔ بڑی خالہ تمہیں نہ جانے کب سے ڈھونڈ رہی ہیں۔ ان کے پاس تو جانا۔'' عارف میرے پاس آ کر پیغام دے کر گھر سے نکل گیا۔ اسی اثناء میں میری نظر لبنیٰ پر پڑی۔ میں نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ سجائے میرے قریب آ گئی۔

''لبنیٰ عارف کہہ رہا تھا تمہاری امی مجھے بلا رہی ہیں؟'' میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ تو صبح سے آپ کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ پتہ نہیں آپ کہاں چلے گئے تھے اللہ جانے آپ نے ان پر کون سا جادو کر دیا ہے۔ آپ چھت پر چلے جائیں۔ وہ وہاں پر بیٹھی ہیں۔ میں آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔'' اس نے مدبرانہ انداز میں تبسم بکھیرا۔

''میں نے مسکراہٹ اور شکریہ کے ملے جلے الفاظ کا اظہار کیا اور چھت پر آ گیا۔ خالہ اور وہی خاتون غالباً جن کا نام نصرت تھا۔ کرسیوں پر بیٹھی حسب معمول گفتگو میں محو تھیں۔

''کہاں آوارہ لفنگوں کی طرح مٹرگشت کرتا پھر رہا ہے۔ لگتا ہے عارف کی طرح تیرے پیروں میں بھی شادی کی بیڑیاں ڈالنی پڑیں گی۔'' مجھے دیکھتے ہی خالہ نے الفاظوں کے تانے بانے جوڑنے شروع کر دیئے یہ اور بات تھی انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگا دیا تھا۔

''آپ ہمارے بڑے ہیں جو فیصلہ کریں گی ہمیں منظور ہوگا۔'' میں ان کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

''نصرت دیکھو اس دور میں اب اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ شرابی، کبابی چور، اچکے ہر جگہ نظر آنے لگتے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں۔ لبنیٰ کی نسبت اس کے ساتھ طے کر دوں۔ عارف سے میں نے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ اچھا خاندان ہے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ اس کے بزرگ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں۔ اور اوپر سے اس کی تنخواہ بھی اچھی ہے۔ آج کل ذات برادریوں کو کون دیکھتا ہے۔ بس شریف اور کماؤ پوت ہونا چاہیے۔'' خالہ جیسے جیسے بول رہی تھی۔ مجھے یوں لگنے لگا جیسے کوئی میرے دامن میں مہنگے موتی ڈالتا جا رہا ہو۔ میری روح آسمان کی دہلیز پر پرواز کرنے لگی۔ لبنیٰ جیسی حسین و جمیل لڑکی میری زندگی کا حصہ بنے جا رہی تھی۔ میرا دل چاہا خالہ ایک بار پھر سے یہ بات دہرائیں مگر کسی شریف بچے کی طرح سے سر جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔

''آپ نے صحیح فیصلہ لیا ہے آپا..... میں نے تو پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ لڑکا سلجھا اور سمجھدار ہے۔ نشے پانی سے بالکل بے عیب۔ میں بھی اپنی نجمہ کے لیے ایسا ہی لڑکا ڈھونڈ رہی ہوں۔ دعا کریں اللہ ہمیں بھی کوئی سبب لگا دے۔'' خالہ نصرت بھی تسلسل سے بولنے لگیں۔

اسی دوران لبنیٰ ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائے ہمارے پاس آ گئی۔ جس میں گرم گرم حلوہ پوری اور چائے تھی۔ اس نے پاس پڑا۔ پلاسٹک کا میز اٹھا کر ہمارے آگے رکھا پھر ٹرے اس پر رکھ دی۔

''امی ناشتہ کر لیں۔ صبح سے آپ باتوں میں لگی ہیں۔'' لبنیٰ نے خفگی سے منہ بنا کر نصرت خالہ کی طرف دیکھا۔ شاید اسے ان کا اپنی ماں کے ساتھ بیٹھنا ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

''چپ کر جا ادھر جا کر بیٹھ بڑوں کی باتوں میں مداخلت نہیں کرتے۔'' خالہ نے اسے ڈانٹا تو وہ منڈیر پر

بنی دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ پہلے تو میرا دل چاہا ایک بلند قہقہہ لگاؤں۔ مگر اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی۔

''بیٹا! تم ناشتہ کرو۔ ہم ابھی آتی ہیں۔'' دونوں خالہ نیچے چلی گئیں ناشتے سے فارغ ہو کر میں لبنیٰ کے پاس چلا گیا۔ جو منڈیر کی دیوار پر بازو پھلائے گاؤں کا نظارا کر رہی تھی۔

میں نے ہنکارا بھرا اور اس کے ساتھ جا کھڑا ہوا اگر بڑے ڈانٹ دیں تو ان کا برا نہیں ماننا چاہیے۔'' میں نے دیوار سے ٹیک لگالی اور منہ مخالف سمت کر لیا۔

''اگر گلاب کے پھول کو ہزار بار بھی سونگھا جائے تو اس کی خوشبو میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے لیے ماں باپ کا پیار بھی ایسا ہی ہے۔ وہ ڈانٹتے ضرور ہیں مگر یہ بھی ان کے پیار کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''تم جتنی خوبصورت ہو لبنیٰ باتیں اس سے بڑھ کر کرتی ہو۔ میرا دل کہتا ہے تم جس گھر میں جاؤ گی۔ وہ گھر نہیں جنت کہلائے گا۔'' میں نے اس کی بات کو سراہا۔

''دلاور گھر جنت اس وقت بنتا ہے جب سب مکینوں میں برداشت کرنے کی شدت ہو۔ ایک دوسرے میں پیار بانٹیں۔ سب کا احترام کرنا بھی گھر کو جنت بنا دیتا ہے۔ جو لڑکی ماں باپ کے گھر سے اچھی تربیت اور بہتر اخلاق سیکھ کر آتی ہے۔ وہی گھر کو سجا سنوار دیتی ہے۔''

''بہت خوب، اچھی سوچ ہے تمہاری.....؟ اور شاید انہیں یہ بھی معلوم ہوگا۔ خالہ میری اور تمہاری شادی کی بات کر رہی تھیں۔'' میں نے اپنا رخ بدلا اور دیوار پر بازو رکھ کر بظاہر گاؤں دیکھنے لگا۔

''ہا..... ہا مجھے معلوم ہے۔'' اس نے میری طرف پہلو بدلا۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے دل میں کوئی اور ہو اور خالہ زبردستی مجھ سے تمہیں جوڑ رہی ہوں۔ دیکھو لبنیٰ رشتوں کی بنیاد کبھی جھوٹ پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ جب اس کی اصلیت آشکار ہوتی ہے تو پیچھے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان ایسی کوئی خلش نہ رہے۔ جو کل کو ہمیں پچھتانا پڑے۔

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ دلاور؟'' وہ کافی حد تک سنجیدہ ہو گئی۔

''لڑکیاں تو ماں باپ کے حکم کی تابع و فرماں بردار ہوتی ہیں۔ انہیں تو ان کا حکم آنکھیں بند کرکے ماننا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ماں باپ اولاد کے بارے میں کونسا برا سوچتے ہیں۔ ان کی تو تمنا ہی ہوتی ہے۔ ان کی بیٹی اپنے گھر میں راج کرے صدا سکھی اور ہنستی بستی رہے۔''

ویسے بھی دلاور! شادی کوئی دو جسموں کا ملاپ نہیں شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ جیسے روحیں جوڑتی ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے رفیق ہوتے ہیں۔ محبّ من ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے قدم ملا کر چلنا ہی شادی کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہر دکھ سکھ میں شریک! اچھے برے حالات کا مقابلہ کرنا ہی اصل زندگی ہے۔ چھوٹی بڑی غلطیاں معاف کرنا ہی خوشگوار زندگی کی علامت ہے۔ مجھے آپ سے شادی کرنے پر کیا اعتراض ہو گا.....؟''

''مجھے تم پر فخر ہے لبنیٰ تم اتنی اچھی سوچ کی مالک ہو۔ اور واقعی تمہاری باتوں میں ایسی صداقت ہے۔ جن پر عمل درآمد کرکے ہر انسان اپنے گھر کو پرسکون بنا سکتا ہے۔ خیر چھوڑو۔ یہ باتیں اب تو زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ مجھے تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو.....؟''

''آپ حکم کیجیے سمجھنے سمجھانے والی کوئی بات ہے۔'' وہ اپنائیت سے بولی۔

''آج صبح میں ایک پرانے اسکول کو دیکھ کر آ رہا ہوں۔ جو شاید انگریزوں کے زمانے ہیں۔ مجھے وہاں پر ایک بوڑھے بزرگ نے بتایا یہ اسکول عجیب و غریب ہے۔ یہاں رات کو لڑکیاں دیکھی گئی ہیں۔ کیا واقعی یہ حقیقت ہے یا ایویں افواہ اڑائی گئی ہے۔''

''ہاں یہ بالکل حقیقت ہے۔ خود عارف کے ابو کے ساتھ وہاں ایسا واقعہ پیش آچکا ہے۔ جس کی وجہ سے دو ماہ تک ان کی طبیعت خراب رہی۔ بڑی مشکل سے ان کی صحت بحال ہوئی تھی۔''

''مگر یہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ سب وہم ہو، کسی نے لوگوں کو ہراساں کرنے کے لیے یہ جھوٹی خبر پھیلا دی ہو۔'' میں نے بے یقینی سے لہجے میں کہا۔

''آپ فوجی ہو نا بات کے دوسرے پہلو کو دیکھ رہے ہو۔ مگر یہاں کے سبھی لوگوں کا یہی ماننا ہے پھر عارف کے ابو یہ جھوٹ کیوں بولنے لگے۔ ہمیں تو اس پرانے اسکول کا نام سن کر ہی جھرجھری آجاتی ہے۔'' اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائی دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے۔ میں نے لہجے سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کے ذہن سے اسکول کے سوال جوابات مٹا دیئے۔ اس کے نیچے جاتے ہیں میری سوچوں نے نئے طریقے سے ابھرنا شروع کر دیا۔ اگر اس اسکول میں واقعی کوئی لڑکی ہے۔ جس کی پازیبوں کی آوازرات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں گونجتی ہے تو مجھے اس کو ہر حال میں دیکھنا ہوگا۔ مجھے قلبی طور پر ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر کوئی انجانی سی قوت میرے تجسس کو ابھار رہی تھی۔ پھر دل ہی دل میں میں نے مصمم ارادہ کر لیا اس اسکول کا راز جان کر ہی رہوں گا۔ یقیناً ایسے محیر العقول واقعات رات کی تاریکی میں ہی رونما ہوتے ہیں۔ اسکول کی حقیقت فاش کرنے کو میرا من باؤلا ہوا جا رہا تھا۔ دوپہر کو عارف کے سسرال والے آئے شام ڈھلنے سے پہلے دعوت ولیمہ کی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ عارف اپنے سسرال والوں کے ساتھ چلا گیا۔ نزدیکی مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ میں نے مصنوعی اداکاری سے عارف کی امی سے جانے کی اجازت مانگنے لگا۔ مگر انہوں نے بڑی سختی سے منع کر دیا۔ حد یہاں تک کہ انہوں نے میرا سامان بھی غائب کر دیا ان کا ارادہ مجھے دو تین دن واپس بھیجنے کا نہیں تھا مارف نے بھی جاتے ہوئے تاکید کی تھی۔

شام کے دھندلکے ہر سو پھیل چکے تھے۔ دن کا تھکا ماندہ سورج مغرب کی گود میں جو سویا۔ رات کی سیاہی کا جال روئے زمین پر پھیل گیا۔ عارف کی والدہ کو یہ بتایا کہ پاس والے گاؤں میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ اس سے ملنے جا رہا ہوں ایک دو گھنٹے بعد واپس آجاؤں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے رات وہیں رکنا پڑے اس لیے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

میں جس وقت گھر سے نکلا کافی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ میں ایک کریانہ اسٹور پر گیا اور وہاں سے ایک چھوٹی سی ٹارچ طلب کی مگر ٹارچ وہاں دستیاب نہ تھی۔ دکاندار نے ایک لائٹر دیکھایا۔ جس کی نچلی طرف ایک چھوٹی سی لائٹ تھی۔ میں سگریٹ کو چھوتا تک نہ تھا۔ مگر کچھ توقف کے بعد وہ لائٹر لے لیا۔ لائٹر جیب میں ڈال کر میں اسی راستے پر آ گیا جو اسکول کی طرف جاتا تھا۔ چاند کی مدھر روشنی ہر سو پھیل چکی تھی۔ غالباً یہ چودھویں کا چاند تھا۔ فروری کے مہینے میں ویسے بھی چاندنی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ جس سے دور دور کا منظر صاف وشفاف دیکھائی دیتا ہے۔

میں جس جگہ کھڑا تھا قرب وجوار کا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ وہاں انسان تو کیا جانور بھی پر نہیں مار رہا تھا۔ ہاں حشرات الارض کی مدھم سی آوازیں ضرور سنائی دینے لگیں۔ ہوا جو کچھ دیر پہلے بند تھی اب پچھم، سے پورب دھیرے دھیرے چل پڑی۔ جس سے ماحول میں ایک سرشاری سی پیدا ہو رہی تھی۔ ماحول کا قدرتی امر شاید میرا اہم سفر بنے جا رہا تھا۔ ایک لمحہ رک کر میں نے اپنی جہاندیدہ نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کوئی میرے تعاقب میں تو نہیں..... لیکن یہاں کون بھٹکنے والا تھا۔ لوگ شاید ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔ میں نے اپنے اندر کے کمانڈو کو باہر نکالا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اسکول کی طرف بڑھنے لگا۔

قریباً دو ایکڑ چلنے کے بعد میری نظر ایک چمکتی چیز پر پڑی۔ جو راستے کے بالکل درمیان میں پڑی تھی۔ میں نے عیاں طور پر دیکھا تو وہ لوہے کا گیلن تھا۔ جس

میں دیہاتی لوگ ڈیزل وغیرہ لاتے ہیں۔ اس کا ڈھکن کھول کر دیکھا تو وہ لبالب ڈیزل سے بھرا تھا۔ جس میں دو لیٹر کے قریب تیل ہوگا۔ پہلے میں نے سوچا اسے یہاں ہی پڑا رہنا دوں مگر اتنی رات کو یہاں کون آئے گا۔ یہ سوچ کر میں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ میں جیسے جیسے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے کی سعی کرنے لگیں۔

اب چاند کی چاندنی میں اسکول کی عمارت نظر آنے لگی تھی۔ کچھ لمحوں کی مسافت کے بعد جب میں اس عمارت کے قریب پہنچا تو نہ جانے دہشت کا ایک جھونکا آیا اور میرے اعصاب پر مسلط ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے اسے قابو کر کے نکال باہر کیا۔ ایک فوجی کو یہ شبہ نہیں دیتا۔ وہ اپنے اوپر کسی قسم کا خوف و ہراس کو غالب آنے دے۔ پوری عمارت تاریکی میں ڈوبی خاموش کھڑی تھی۔ میں نے ایک لمبا چکر کاٹ کر اس کے اطراف سے اچھی طرح جائزہ لیا۔ کوئی مشکوک افراد تو نہیں مگر کچھ نہ تھا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ اپنے مقاصد کے لیے ایسی جگہوں کا استعمال کرتے ہیں اور ایسی افواہیں اڑا دیتے ہیں تاکہ لوگ اس طرف آنا جانا بند کر دیں۔ مگر یہاں پر ایسا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے جس راستے سے اندر گیا تھا وہ ہی منتخب کیا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر میں نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا اور اسے پھاند کر اندر کود گیا۔

''دھڑک'' یہ میرے بوٹوں کی آواز تھی۔ جو پورے احاطے میں گونج اٹھی۔ بوٹوں کی دھمک تاریک کمروں کی خاموشی توڑنے لگی۔ میں دم سادھے اکڑوں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بیٹھے رہنے کے باوجود بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ صرف قریب چلاتے کیڑے مکوڑے ہی خاموش ہوئے ابھی میں اٹھنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ اوپر والی کھڑکی پر اٹھ گئی۔ جس کے ٹوٹے ہوئے کواڑ سے ایک سفید کپڑوں میں ملبوس خلیہ سا دیکھائی دینے لگا۔ جیسے یہاں پر کسی نے میری موجودگی محسوس کر لی ہو۔ ایک دو گھڑیوں کے بعد وہ سایہ نما ہیولہ غائب ہوگیا۔ اب میرا یقین پختہ ہونے لگا یہاں ضرور کچھ نہ کچھ ہے۔

احاطے میں چاندنی چھن چھن کر پڑ رہی تھی۔ پورا احاطہ روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ مگر جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں دیوار کا لمبا سایہ تھا۔ میں وہاں سے اٹھا اور دبے پاؤں راہداری کی طرف بڑھنے لگا۔ دو منزلہ عمارت کا سایہ کچھ کچھ احاطے میں اور باقی باہر کھیتوں میں پڑ رہا تھا پوری راہداری اور کمرے گھپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے راہداری میں پاؤں رکھا تو خاموش۔ سناٹے میں اس کی بازگشت سنائی دی میں نے جیب سے لائٹر نکال کر اس کی لائٹ جالو کر لی۔ چھوٹی سی لائٹ مگر کمال کی تھی۔ زیادہ واضح تو نہیں۔ مگر دیکھائی ٹھیک دے رہا تھا۔ راہداری میں کھڑی ہو کر میں نے ادھر ادھر روشنی پھینکنا شروع کر دی۔ پھر پہلے کمرے میں داخل ہوگیا۔ مجھے اس کمرے پر شک ہوا جس کے ڈریس اور بینچ جوں کے توں پڑے تھے۔ لائٹر کی روشنی ادھر ادھر ڈالتا آخری بینچ کے پاس چلا گیا۔ مگر پورا خالی کمرہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔ آخری ڈیسک کے پاس کھڑے ہو کر میں نے دیواروں اور چھت پر روشنی پھینکی۔ ایسا کچھ مشکوک نام ونشان نہ تھا مجھے یقین ہوگیا اس کمرے میں کچھ نہیں ہے۔ میں وہاں سے نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اوپر سے سیڑھیاں اتر کر نیچے کی طرف آ رہا ہو۔ گو کہ اس کی آواز اتنی خاص نہ تھی۔ پھر بھی میں نے جلدی سے لائٹر بند کیا اور وہیں ڈیسک کے ساتھ نیچے دبک کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف میری سانسوں کی مدہم سی بازگشت محسوس ہونے لگی۔

قدموں کی چاپ صاف سنائی دینے لگی۔ یقیناً کوئی راہداری میں چل رہا تھا۔ میری نظریں دروازے پر جم چکی تھیں۔ دفعتاً قدموں کی چاپ رک گئی۔ جیسے چلنے والے نے میری موجودگی محسوس کر لی ہو پھر چند ساعتوں بعد وہ جو بھی تھا واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

شاید واپس چھت پر جا رہا تھا۔ اب چاپ مکمل طور پر بند ہوگئی۔ میں کافی دیر وہاں بیٹھا رہا۔ شاید وہ دوبارہ واپس آئے۔ جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ عمل میں نے بغیر لائٹ جلائے سرانجام دیا۔ دروازے کے پاس آکر میں نے چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ راہداری مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب کہ احاطہ ویسے ہی ویران وسنسان پڑا ہوا تھا۔ میں نے لائٹ جلالی۔

پھر میں نے راہداری میں کھڑے ہوکر ادھر ادھر دیکھا۔ میرے سامنے اسٹاف روم تھا۔ غیر ارادی طور پر مجھے وہاں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ میں وہاں گھس گیا۔ کرسیوں کی واقعی میں بدلی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا صبح جب میں یہاں آیا تھا۔ ان کی ترتیب ایسی نہ تھی۔ اب ان کے اوپر کوئی بیٹھا پھر جلد بازی میں اٹھ کر چلا گیا۔ یہ میرا تجربہ کہہ رہا تھا۔ میں نے فرش پر روشنی ڈال کر قدموں کے نشان دیکھنے چاہے۔ مگر میرے جوتوں کے نشانوں کے سوا وہاں کوئی نقوش نہ دیکھائی دیا۔ میں دروازے کی طرف پشت کیے کرسیاں دیکھنے میں محو تھا۔

اچانک ایسا لگا جیسے کوئی زنانے دار شے راہداری سے گزری ہو۔ میں جلدی سے باہر آگیا۔ دائیں بائیں روشنی ڈال کر دیکھا۔ وہی خالی، احاطہ، راہداری اور سامنے والی دیوار جس کے ساتھ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگنے لگا۔ اس آخری کونے والے کمرے میں کوئی موجود ہے۔ جس میں ڈیسک اور بنچوں کے علاوہ بے تحاشہ دیواروں اور چھت پر جالے لٹک رہے تھے۔ میں دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگا۔ داخلی دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میرے کان اندر کی گہری سے گہری خاموشی محسوس کرنے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔ کافی دیر کھڑا رہنے کے بعد جب میرے کان ہلکی سی سرسراہٹ سن نہ سکے تو میں پھرتی سے اندر داخل ہوا۔ پورے کمرے کا طواف کر ڈالا۔ مگر مہیب جالوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب نچلی منزل میں ایک ہی کمرہ تھا۔ وہ تھا پرنسپل کا روم، میں راہداری سے گزر کر اس روم میں جا گھسا۔

کمرے کا ماحول دیکھ کر میں چونک گیا۔ کمرے کی واحد بڑی کرسی ٹیڑی پڑی تھی۔ جب کے میز کو کسی نے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ کمرے کی اتھل پتھل دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا۔ یہاں ضرور کچھ ہوا ہے۔ میں نے کرسی کو سیدھا کیا۔ اس پر جمی دھول میرے ہاتھوں پر لگ گئی۔ میز کو کھینچا تو عجیب سی آواز پوری عمارت میں گونج اٹھی۔ جس نے اس کا سکوت تہہ و بالا کر دیا۔ بہر حال میں نے اسے کھینچ کر سیدھا کیا اور ہاتھوں کے نشان دیکھنے لگا۔

''چھن، چھن..... چھنا چھن، مدہم سی پائل کی آواز ابھری میرے کان اس طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ پائل کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔ میں اپنے تئیں بولا۔ باہر احاطے سے یا اوپر چھت پر، میں نے میز کو چھوڑا اور آواز کا تعین کرنے لگا۔ پھر جلدی سے راہداری میں آگیا۔ مگر بار بار کوشش کے باوجود بھی صحیح تعین نہ ہو پا رہا تھا۔ شاید چھت سے.....؟

میری بیدار چھٹی حس نے فوراً جواب دے دیا۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ پائل کی آواز یک دم بند ہوگئی۔ شاید اس نے میرے جوتوں کی آہٹ سن لی تھی جو سیڑھیاں چڑھتے ابھرنے لگی تھی۔ لائٹر کی مدہم روشنی ہر سیڑھی پر پڑھ رہی تھی۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیدے پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن خالی راہداری اپنے دامن میں تاریکی سمیٹ کھڑی تھی۔ میں اس سے پہلے کمرے میں داخل ہوگیا۔ جس کی دو کھڑکیاں تھیں کھڑکی کے ٹوٹے کواڑ سے چاند کی اجلی شفاف روشنی اندر پڑھ رہی تھی۔ جس سے کمرے کا ماحول واضح دکھائی دینے لگا۔ میں اس کواڑ کی طرف آگیا۔ جہاں سے چاندنی چھن چھن کر کمرے میں بکھر رہی تھی۔ سامنے گاؤں کی روشن بتیاں نظر آرہی تھیں۔ لامتناہی کھیتوں پر چاندنی کی لمبی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وہ کھڑکی تھی جہاں

اکثر لوگوں نے اس سفید کپڑوں والی لڑکی کو دیکھا تھا۔ کھڑکی سے سر نکال کر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ پھر وہاں سے ہٹ کر عین اس کے سامنے والی کھڑکی کے پاس آ گیا۔ کواڑ سے احاطہ گیٹ اور دیواریں دیکھائی دینے لگیں۔ احاطے میں موجود جڑی بوٹیاں اور دیواروں کے ساتھ کھڑے بھوتوں کی مانند لگنے لگے۔

میری نگاہیں احاطے میں جھانک تانک کر رہی تھیں۔ یک لخت جیسے ہی میری نظر دائیں سے بائیں ہوئی۔ احاطے کے درمیان سفید کپڑوں والی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ بالوں میں اس کا چہرہ تو دکھائی نے دیے رہا تھا۔ مگر اتنا ضرور لگ رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔

''سنو؟ کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو۔'' میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ مگر اتنی بلند نہ تھی۔ اسکول سے باہر جا سکے۔ لڑکی کی طرف سے جواب ندارد ہی رہا۔

''وہاں پر ہی رکنا، ہلنا مت، میں ادھر ہی آتا ہوں۔'' میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ میں یہ سوچنے لگا تھا ہے تو یہ کوئی لڑکی ہے..... بچ کر جائے گی کہاں؟ سیڑھیوں پر میرے پیروں کی دھمک، دھب دھب کرنے لگی۔ جب میں بھاگ کر اس جگہ پہنچا تو ..... خونچکا بھونچکاں رہ گیا۔ وہاں لڑکی تو کیا۔ سایہ تک نہ تھا۔ یہ لڑکی کہاں گئی۔ میں دیوانہ وار اسے اطراف میں گھوم گھوم کر دیکھنے لگا۔ اگر لڑکی یہاں کھڑی تھی۔ تو یقیناً اس کے پیروں کے نشان بھی زمین پر ہوں گے۔ میں نیچے اکڑوں بیٹھ کر روشنی کی مدد سے نشانوں کی کھوج کرنے لگا۔ چاندنی اور لائٹ کی روشنی میں فرش صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کئی بالشت جگہ دیکھ ڈالی۔ مگر کوئی ثبوت حاصل نہ ہو سکا۔

''یہ کیسے ممکن ہے، ایک لڑکی ابھی ابھی یہاں کھڑی تھی۔ اس کے پیروں کے نشان کیوں نہیں ہیں۔ میں ہاتھ سے فرش کھرچنے لگا۔ میرے پیچھے وہ دیوار تھی جہاں سے میں کود کر اندر آیا تھا۔ اس کا سایہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر موجود تھا۔ دفعتاً پیچھے سے ایک بلند سایہ گزر کر عمارت میں غائب ہو گیا۔ جیسے کوئی دیوار کے اوپر دوڑ کر اندر کودا ہو۔ میں نے جلدی سے سر گھما کر پیچھے دیکھا۔ دیوار خالی تھی۔ اب کچھ ماجرہ میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ یہاں واقعی آسیبی چکر ہے۔

اگر میری جگہ کوئی دوسرا کمزور اعصاب کا ہوتا تو ممکن ہے اب تک یہاں سے بھاگ چکا ہوتا۔ مگر ایک پاک فوج کا جوان جس کی سرشت میں خطروں سے کھیلنا شامل ہوتا ہے۔ وہ کیسے ان شعبدوں سے ڈر سکتا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر سرحدوں کے محافظ ان بھوت پریتوں سے کہاں ڈرتے ہیں۔ میں اٹھ کر عمارت کا تنقیدی جائزہ لینے لگا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر اوپر والی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ وہی لڑکی وہاں کھڑی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

''یہ اتنی جلدی وہاں چھت پر کیسے چلی گئی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اب میں نے سوچا اسے آواز دینا مناسب نہیں۔ اسے پکڑنا ہوگا۔ میں وہاں سے دوڑتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا۔ ایک بار پھر مجھے حیرت کے کئی جھٹکے لگے۔ کھڑکی کا کواڑ تنہا تھا۔ لڑکی وہاں سے بھی غائب ہو چکی تھی۔ چاندنی کی روشنی میں پورا کمرہ چھان مارا پھر کچھ سوچ کر میں وہیں ڈیسک پر بیٹھ گیا اور لائٹر جلا دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو اس کی سوئیاں گیارہ کے ہندسوں کو چھو رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دھیرے دھیرے سیڑھیاں نیچے اتر رہا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا اب اس کے پیچھے نہیں جاؤں گا۔ وہیں دم سادھ کر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں دروازے پر تھیں۔ میں جس روم میں بیٹھا تھا اس کے ساتھ والا کمرہ جس کا دروازہ اب بھی موجود تھا۔ صبح میں نے وہاں بے شمار چمگادڑوں کو دیکھا تھا۔

اچانک پٹ سے وہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر کوئی لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے واضح طور پر اس کا سایہ چاندنی میں دیکھا۔ جو دروازے کے آگے سے برق رفتار سے گزر گیا وہ جو بھی تھا۔ نیچے جا رہا تھا۔

میرا ماتھا ٹھنک گیا۔ میری چھٹی حس اور دماغی لہر بہ چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دینے لگا۔ یہاں ایک نہیں دو ہیں پہلے جو قدموں کی آواز سنائی دی تھی وہ واپسی چھت کی طرف نہیں مڑے تھے۔ اس کے بعد دوسرے سایے اور قدموں کی الگ آواز نے یقین دلا دیا۔ یہاں کوئی دو غیر مرئی وجود ہیں۔

اک عجیب سی ہلکی ہلکی آواز نیچے سے اوپر آنے لگی۔ میرے کان اس طرف مبذول ہو گئے۔ آواز کی یہ شدت رفتہ رفتہ بڑھنے لگی۔ کوئی ڈیسک کو ادھر ادھر گھسیٹ رہا تھا۔ آواز کی شدت اس قدر بڑھ گئی جیسے کوئی دیوانہ وار انہیں گھسیٹ رہا ہو۔ پھر انہیں کوئی ڈنڈا اٹھا کر فرش پر مارنے لگا۔ رات کے سناٹے میں ان کی آواز کانوں میں ابلتا تیل انڈیل رہی تھی۔ میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور احتجاج کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ کمرے سے برآمد ہونے والی دھماچوکڑی سے تو یہی لگ رہا تھا تمام ڈیسک چکنا چور ہو چکے ہیں۔ میں گھبرا گیا کانوں پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

جیسے ہی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ ایک قوی ہیکل اور بلند خوفناک چیخ سنائی دی۔ میں پوری طرح لرز اٹھا۔ ڈیسکو کا شور یک دم بند ہو گیا۔ پہلی بار میرے ماتھے پر پسینہ نمودار ہوا اور خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں الٹے قدموں ہی واپس آ کر ڈیسک پر بیٹھ گیا اور ہاتھ سے ماتھا صاف کیا۔ ڈیسک پر بیٹھ کر میں نے محسوس کیا کہ میری سانس تیز چلی رہی ہے ایک دو لمبے، لمبے سانس اندر کو کھینچے اور اٹھ کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ اچانک وہی بلند چیخ دوبارہ ابھری، جس نے عمارت کی در و دیوار کو ہلا ڈالا۔ لائٹر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ میں نے فوراً ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔ ڈیسک پر بیٹھے جب کچھ دیر ہو گئی تو میں نے کانوں سے ہاتھ اٹھا لیے کانوں کے پردے فی الحال ٹھیک ہی تھے۔ اگر کوئی کمزور دل ہوتا تو اب تک بے ہوش ہو چکا ہوتا۔

میں نے نیچے جانے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ کمرے میں ایک ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ پھر کوئی نرم اور چکنی سی چیز میرے پیر سے ٹکرائی۔ سانپ اس خیال کے آتے ہی میں ایک بار پھر لرز اٹھا۔ یک دم باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ مگر سیڑھیوں کے درمیان میں جاتے ہی میں رک گیا۔ مجھے اپنی بزدلی پر غصہ آنے لگا۔ ایک رینگنے والے معمولی کیڑے سے ڈر کر میں بھاگ رہا تھا۔ میں نے دو تین ٹھوکریں سیڑھی پر ماریں اور واپس کمرے میں آ گیا۔ میرا لائٹر ویسے ہی پڑا چمک رہا تھا۔ اس کو اٹھا کر پورے کمرے میں روشنی ڈالی۔ مگر سانپ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ نیچے کمرے سے ایک بار پھر ڈیسکوں کی آواز ابھرنے لگی تھی۔ میں نے لائٹر سیدھا کیا اور سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ جیسے ہی آدھی سیڑھیاں نیچے آیا۔ وہ آواز مکمل بند ہو گئی۔ ایک بار پھر عمارت میں گہری خاموشی چھا گئی۔ شاید ان کو میرے آنے کا الہام ہو گیا تھا۔ ایک کمرے سے ہلکی سی سرگوشی سنائی دی میرے ہلکے ہلکے قدم اس کمرے کی طرف بڑھنے لگے۔ سرگوشی پھر تیز ہونے لگی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں جالوں کی بساط تھی۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر اندر کی سرگوشیاں سننے لگا۔

''دیکھو..... تم اسے کچھ نہیں کہہ سکی..... وہ ابھی نادان بچہ ہے۔ ادھر ادھر گھوم کر چلا جائے گا۔ انسان کتنا بھی بہادر کیوں نہ ہو۔ تنہائی کا خوف اسے بھگا دیتا ہے۔ یہ بھی کچھ دیر بعد دہشت زدہ ہو کر بھاگ جائے گا'' یہ آواز ملائم اور میٹھی کسی نوجوان لڑکی کی لگ رہی تھی۔

''اس نے یہاں آ کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ اور یہاں گناہ کرنے کی سزا صرف موت ہے۔ میں اسے بہت برداشت کر چکی ہوں۔ اسے جا کر بھگا دو ورنہ اس کا وہ حشر کروں گی کہ اس گاؤں کی سات پشتیں بھی کسی مہمان کو گھر نہ بلائیں گی۔'' یہ بھاری بھرکم اور کھدری آواز کسی عورت کی تھی۔

جسے سنتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک فوجی کو جان سے مارنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ میں نے خود پر قابو پایا اور لائٹر سیدھا کر کے پھرتی سے اندر داخل ہو گیا۔ خالی کمرے کا خاموش اندھیرا میرا

تمسخر اڑانے لگا۔ یہ عورتیں کہاں گئیں۔ میں ان کو تلاش کرنے لگا۔ میری نظر ڈیسکوں پر پڑی وہ جوں کی توں برقرار تھیں۔ جتنی زور سے انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مارا تھا۔ انہیں ٹوٹ پھوٹ جانا چاہیے تھا۔ دریں اثناء باہر احاطے سے پائل کی چھنکار ابھر پڑی۔ یہی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی احاطے میں چہل قدمی کر رہا ہے۔

میں وہاں سے نکلا اور احاطے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ سفید کپڑوں والی لڑکی احاطے کے بیچ کھڑی تھی۔ جس کا رخ دوسری طرف تھا۔ میں چوکنے چیتے کی طرح اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے شاید میری آمد کا احساس نہ ہو پایا تھا۔ وہ جوں کی توں کھڑی رہی۔ دبے پاؤں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ کچھ تاسف کے بعد میں نے دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ اور اس کے کندھے کے قریب لے جانے لگا۔ کندھے کے اوپر دو انچ کے فاصلے پر میں نے ہاتھ روک لیا۔ کیا یہ مناسب ہوگا۔ اسے چھو جانے میں شش و پنج میں مبتلا ہونے لگا۔ پھر ایک لمحہ رک کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر مجھے بجلی جیسا شدید جھٹکا لگا۔ پل بھر میں وہ لڑکی وہاں سے غائب ہو چکی تھی اور میرا ہاتھ فضاء میں معلق رہ گیا۔

''یہ لڑکی کہاں گئی۔'' میں اطراف میں اسے تلاش کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

''اگر جان بچانا چاہتے ہو تو بھاگ جاؤ یہاں سے.....'' ایک خفیف نسوانی آواز نے مجھے ساکت کر دیا۔ میں نے رخ موڑ کر راہداری کی طرف دیکھا تو وہ لڑکی دروازے کے عین بیچ کھڑی تھی۔

''کون ہو تم؟ اور مجھے کون مارنا چاہتا ہے؟'' میں نے اس کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیئے۔

''میں کون ہوں تمہیں جاننے کی ضرورت نہیں، اپنی جان بچاؤ اور بھاگ جاؤ یہاں سے۔'' وہ دوبارہ اسی انداز میں بولی۔

''دیکھو، میں تمہارا دوست ہوں مجھ سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بھروسہ رکھو۔ مجھ پر۔ تفصیل سے مجھے بتاؤ۔ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔'' میں اس سے چند قدموں کی مسافت پر چلا گیا۔

''وہیں رک جاؤ، آگے مت بڑھنا۔ ورنہ وہ تمہیں مار ڈالے گی۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔'' وہ سیڑھیوں کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کی پائل کی آواز خاموش تاریکی ماحول میں گونج اٹھی۔

''رکو میری بات تو سنو۔'' میں اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر وہ چھت پر جا چکی تھی۔ میں اس کے پیچھے چھت پہ آ گیا وار لائٹر کی روشنی میں اسے تلاش کرنے لگا۔ وہ کہیں بھی نظر نہ آئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ کیا کہہ کر گئی ہے۔ یہاں پر میری جان کو خطرہ تھا۔ مگر کس سے، کون ہے یہاں میرا دشمن، پھر تو مجھے پوری طرح چوکس و چوبند رہنا چاہیے۔ میرا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا اور پشت اس کمرے کی طرف جس کا دروازہ اب بھی موجود تھا۔

یکا یک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا ہو۔ پھر کوئی ہلکے قدموں سے چلتا میرے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔ پہلے میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ مگر اس کی گرم سانسوں کی بازگشت مجھے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگی۔ میں نظریں دائیں بائیں گھما کر صحیح تعین کرنے لگا۔ واقعی میں کوئی ہے یا پھر میرا وہم تو نہیں۔

اچانک ایک استخوانی سا ہاتھ میرے کندھے سے رینگ کر میرے گلے کی طرف آنے لگا۔ ایسا خوفناک ہاتھ میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا لمبے لمبے ناخن گھنے بھورے بال کافی لمبا ہاتھ تھا۔ اس ہاتھ نے لپک کر میرا گلا دبوچ لیا۔ اس کی اچانک گرفت اتنی سخت تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ اسی اثناء میں لائٹر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ میں اپنے دونوں ہاتھ اس ہاتھ کی کلائی پر جما کر گرفت چھڑانے لگا۔ مگر میری یہ کوشش ناکام جانے لگی۔ اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ مجھے اپنا دم حلق کے اندر ٹوٹتا محسوس ہوا۔ اور آنکھیں حلقوں سے باہر آ گئیں۔

اسرار سحر قلمی (اصلی قدیمی نسخہ)

[illegible]

[illegible] 3200/- [illegible]

[illegible]

پی۔او۔بکس نمبر77سرگودھا(پاکستان)

فون نمبر 03070287767

نوٹ۔ شام ۴ بجے سے پہلے آرڈر کرنے پر کتاب اسی دن پوسٹ کر دی جائے ورنہ اگلے دن پوسٹ کی جائے گی۔

یکا یک میں نے اپنی تمام قوت یکجا کی اور پیچھے کی طرف کہنی ماری۔ یہ کمانڈو کا ایک خصوصی داؤ تھا جو پیچھے کھڑے حریف کو نشانہ بناتا ہے۔ کہنی کسی عورت کے پہلو یا پسلیوں میں لگی۔ اس کی نسوانی چیخ بلند ہوئی اور اس نے مجھے فوراً چھوڑ دیا۔ میں نے جلدی سے سانس درست کرتے ہوئے نیچے سے لپک کر لائٹر اٹھایا اور اس پر روشنی ڈال دی۔

اس لڑکی کا روپ دیکھ کر میں اچھل پڑا۔ دودھیا رنگ کا لباس اور بال بکھر کر کندھوں اور چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ آنکھیں خونخوار بلی کی طرح چمکدار اور چہرے پر جابجا زخموں کے نشان واضح تھے۔

''کون ہو تم اور مجھے کیوں مارنا چاہتی ہو۔'' میں نے قدرے چلاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے کھردرے اور بھونڈے انداز میں قہقہہ لگایا۔ تو ایسے لگا جیسے ایک ساتھ دو عورتیں بول رہی ہوں۔

''تیری موت ہوں میں تو نے یہاں آ کر بہت بڑا گناہ کیا ہے جس کا تجھے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اب تیری لاش ٹکڑوں میں بٹ کر ہی ادھر سے جائے گا۔

''لیکن میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ مجھے کیوں مارنا چاہتی ہو۔'' میں پھر چیخا۔

تم یہاں کا راز جاننے آئے ہو۔ اب تیری موت بھی ایک راز بن کر رہ جائے گی۔ میں تیری موت کو عبرت بنا دوں گی۔ تاکہ دوبارہ کوئی ادھر آنے سے پہلے ہزار بار سوچے۔ وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھنے لگی۔ اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹ خارج ہو رہی تھی۔

میں پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ بھاگتے ہوئے جب میں احاطے میں پہنچا تو وہ وہاں کھڑی تھی۔ ایک بار پھر میرا دل کنپٹیوں میں اچھلنے لگا۔ ایک فوجی دشمن سے تو سرحد پر لڑ سکتا ہے۔ مگر غیر مرئی مخلوق سے لڑنا۔ اس کی بساط سے دور ہوتا ہے۔ میں اس سے الجھے بنا یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر شاید اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

میں ایک ہی قدم پیچھے ہٹا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح میرے قریب آ گئی۔ ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا گلا دبا لیا۔ پھر ایک جھٹکے سے ایسے اوپر اٹھایا جیسے میں موم کا گڈا ہوں۔ تکلیف کی وجہ سے میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کی گرم سانسوں کے ساتھ غراہٹ بھی جاری تھی میرا وجود فرش سے کئی فٹ ہوا میں معلق تھا۔ اس نے معمولی سا جھٹکا دے کر مجھے چھوڑا۔ میں سامنے دیوار سے جا ٹکرایا میرا کندھا اور پہلو درد سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں تلملا کر رہ گیا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی حتی الامکان کوشش کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خوبصورت میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری خنجر تھا۔ جس کا پھل چاندنی میں چمکنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر میں فرار ہونے کا راستہ ڈھونڈنے لگا۔ مگر درد کی وجہ سے پیروں میں سکت ختم ہو گئی۔

یکا یک میرے اور اس کریہہ صورت لڑکی کے درمیان ایک فٹ بال نما گولا روشن ہوا۔ جس نے چشم زدن میں ایک خوبصورت لڑکی کا روپ اختیار کر لیا یہ وہی لڑکی تھی۔ جو پہلے یہاں نظر آئی تھی۔ اس کی پائلوں کی چھنکار سے میں نے اسے پہچان لیا۔

''رک جاؤ وہیں۔ میں تمہیں ایک بے گناہ کو قتل نہیں کرنے دوں گی۔'' وہ اس چڑیل صورت سے مخاطب ہوئی۔ جو مجھ سے چند قدموں کی دوری پر کھڑی تھی۔

''تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔ ہٹ جاؤ۔ میرے راستے سے ورنہ میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' چڑیل تلملا کر بولی۔

''دلاور'' وہ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اس فتنے کو ختم کر سکوں۔ مگر تم اسے مار سکتے ہو۔ میں تمہیں وہ طریقہ بتاتی ہوں۔''

''خبردار! جو اپنی زبان کھولی تو۔'' وہ چڑیل شیرنی کی طرح دھاڑی۔ ''میں تمہاری زبان کاٹ دوں گی۔''

''جلدی بتاؤ مجھے.....! یہ کیسے مرسکتی ہے۔ میں ماروں گا اسے۔'' میں بے قراری سے بولا۔

''اوپر والا کمرہ جس کا دروازہ اب بھی موجود ہے۔ تم کسی بھی طرح اس دروازے کو آگ لگا دو۔ یہ خود جل کر مر جائے گی۔ جاؤ جلدی کرو میں اسے کسی نا کسی طرح روکتی ہوں۔'' وہ چلائی۔

''آگ لگا دوں..... مگر کس طریقے سے.....'' میں ابھی کھڑا کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سوال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ مجھے ڈیزل سے بھرا گیلن ملا تھا۔ اس سے آگ لگائی جا سکتی ہے یہ سوچ کر میں کمرے کی طرف دوڑا۔ لائٹر کی لائٹ میں پہلے ہی جلا چکا تھا۔ جلدی سے کمرے میں داخل ہوا تو گیلن ویسے ہی ڈیسک پر پڑا تھا۔ گیلن اٹھا کر میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ کئی بار سیڑھیوں سے گرتے گرتے سنبھلا۔ مگر ایک گھٹنے پر تیسری چوٹ آ گئی۔ چھت پر پہنچا تو چاندنی اپنی سمت بدل چکی تھی کمرہ پہلے سے زیادہ روشن نہ رہا۔ میں بھاگم بھاگ اس دروازے کے پاس پہنچا۔ وہ بڑے مضبوطی سے بند تھا۔ میں نے جلدی جلدی گیلن کا ڈھکن کھولا اور ڈیزل دروازے پر پھینکنے لگا۔

ایک عجیب سا شور اٹھا۔ جیسے بہت ساری بلیاں رونے لگ پڑی ہوں۔ چیخ و پکار اس قدر بلند ہوگئی کہ میں لرز اٹھا میرا پورا وجود پسینے میں تر ہوتا چلا گیا۔ گیلن خالی کر کے میں نے ایک طرف پھینک دیا۔ ابھی لائٹر سیدھا ہی کیا تھا کہ کسی نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے کواڑ سے جا ٹکرایا۔ لائٹر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

''اوشٹ.....'' میں نے نیچے دیکھا تو وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کا خول چاندنی میں چمکنے لگا۔ پتہ نہیں ٹوٹ چکا ہے یا بچ گیا ہے۔ نیچے کیسے جاؤں۔ میں جیسے ہی گھوما دہشت سے اچھل ہی پڑا۔ وہ چڑیل بالکل میرے نزدیک کھڑی تھی۔ اس کی آگ اگلتی نگاہیں میرے چہرے پر پڑنے لگیں۔ پلک جھپکتے ہی اس نے مجھے کواڑ سے نیچے دھکا دے دیا۔ ایک فطری چیخ میرے منہ سے بلند ہوئی اور میں نیچے جانے لگا۔ اگر میرا سر نیچے فرش سے ٹکراتا تو یقیناً اس کے چیتھڑے اڑ جاتے مگر فرش سے دو فٹ کی دوری پر مجھے کسی کے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ جس نے مجھے تھام کر فرش پر کھڑا کر دیا۔ یہ یقیناً وہی پائل والی لڑکی ہوگی۔

''دلاور تمہارا لائٹر محفوظ ہے۔ اب اوپر جاؤ تو اسے جلا کر جانا۔ وہ چڑیل آگ سے بہت ڈرتی ہے۔'' اس لڑکی کی سرگوشی کانوں میں سنائی دی۔ میں نے جھک کر لائٹر اٹھایا تو وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اسے فوراً جلایا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ چھت پر پہنچ کر جیسے ہی سیڑھیاں ختم ہوئیں وہ چڑیل وہاں کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دھاڑی۔

''آگے مت بڑھنا۔ ورنہ زندہ جلا دوں گی۔''

چڑیل چلائی مگر اب اس کی آواز میں وہ وحشت وہ رعب نہ تھا۔ ایک ڈر سا چھپا ہوا تھا۔ میں نے جلتے شعلے سے ہاتھ کی آر ہٹا لی اور خاموشی سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی۔ اس کے حلق سے مدہم، مدہم سی غراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ الٹے قدم چلتے چلتے وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ میں جیسے ہی دروازے کے قریب پہنچا۔ ایک دفعہ پھر بلیوں کی آہ و پکار شروع ہوگئی۔ مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ مگر ہمت یکجا کر کے شعلے کو دروازے کے قریب لے آیا۔

''رک جاؤ۔ اسے مت جلانا۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔'' وہ چڑیل التجا آمیز انداز میں چیخنے لگی۔ مگر اس کی التجاء کہاں سننے والا تھا۔ شعلہ جیسے ہی دروازے کے قریب ہوا اس نے لپک کر دروازہ پکڑ لیا۔

''پھک'' کی آواز کے ساتھ پورا دروازہ آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

اب دروازے کے ساتھ چڑیل بھی دھڑا دھڑ آگ میں جل رہی تھی۔ جس کی بھیانک اور فلک شگاف چیخ و پکار نے پورے اسکول کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

میں باہر کی طرف بھاگنے ہی والا تھا۔ کہ یک

لخت ایک دھماکہ ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر مجھ پر آ گرا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد کھڑکی کے کواڑ سے اس طرف باہر گرا۔ جس طرف کھیت تھے۔ اس کے بعد میرے ہوش حواس میرا ساتھ چھوڑتے چلے گئے۔

اور جب مجھے ہوش آیا تو میں گاؤں جانے والے راستے پر ایک طرف نرم گھاس پر پڑا ہوا تھا۔ اور وہ پائل والی لڑکی میرے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خود کو دیکھا تو جگہ جگہ سے میری شرٹ جلی ہوئی تھی۔

''شکر ہے خدا کا کہ آپ کو ہوش آ گیا۔ ورنہ میں تو آس ہی کھو بیٹھی تھی۔ دیکھئے آپ کی آگ بجھاتے بجھاتے میرے ہاتھ جل گئے۔'' لڑکی نے اٹھ کر ہاتھ میرے آگے کر دیئے۔ واقعی چاند کی روشنی میں اس کے ہاتھوں پر دھبے دیکھائی دے رہے تھے۔

''کیسے جل گئے تمہارے ہاتھ۔'' میں نے بطور ہمدردی اس کی طرف دیکھا۔

''جب آپ پر یہ دروازہ گرا تو آپ کا پورا وجود آگ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ آپ کھیتوں میں گرنے والے تھے۔ مگر میں نے بیچ سے ہی آپ کو پکڑ لیا اور یہاں لٹا کر آپ کی آگ اپنے ہاتھوں سے بجھائی۔'' اس کی آواز میں ایک مٹھاس تھی۔ ایک ترنگ تھی۔

''اور خدا کا شکر ہے آپ کا وجود جلنے سے محفوظ رہا۔''

''بہت بہت شکریہ تم نے میری جان بچائی مگر تم مجھے اپنے بارے میں کچھ بتاؤ یہ سب کیا تھا؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے آپ نے مجھے اس دلدل سے نکال دیا۔ میں دراصل ایک مسلم جن زادی ہوں۔ میرا نام کوہ نور ہے۔ آج سے کئی سال پہلے میں یہاں سے گزر رہی تھی کہ اس چڑیل نے دھوکے سے مجھے یہاں قید کر لیا۔ یہ چڑیل انگریزوں کے زمانے سے یہاں پہرا ڈالے ہوئے تھی اس وقت یہ علاقہ اتنا آباد نہ تھا۔ اس نے دھوکے اور مکاری سے میری ساری طاقت چھین لی۔ اور بے بس چڑیا کی طرف اپنا غلام بنا لیا۔ میرے ذریعے وہ لوگوں کا شکار کرنے لگی۔ اسے انسانی خون پینے اور گوشت کھانے کی لت پڑ چکی تھی۔ کوئی بھولا بھٹکا انسان ادھر آ جاتا۔ یہ مجھے ہٹا کر اس کا شکار کر لیتی۔ میں بے بس کچھ نہ کر پاتی۔

برسوں پہلے ایک عامل درویش کا یہاں سے گزر ہوا۔ اس نے اپنی قوت ایمانی سے اسے یہاں قید کر دیا۔ اور لوگوں کو اس کے شر سے پناہ مل گئی۔ مگر یہ اسکول ویران ہوتا چلا گیا۔ اب کچھ دنوں پہلے اس عامل درویش کا حصار ٹوٹنے والا تھا۔ کیونکہ وہ مر چکے تھے۔ یہ پھر سے لوگوں کو نظر آنے لگی۔ مگر اب زمانہ بدل چکا تھا۔ اور انسان نے بہت ترقی کر لی۔ خدا نے تمہیں میری اور ان لوگوں کی بھلائی کے لیے یہاں بھیج دیا۔ اور سب کو اس موذی سے چھٹکارا حاصل ہو گیا۔ میں تمہارا یہ احسان کبھی نہ بھول پاؤں گی۔''

''شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ آپ کی وجہ سے میں اس ملعون کو واصل جہنم کر پایا ہوں۔ مگر یقین نہیں ہوتا آج کے دور میں بھی یہ سب باتیں حقیقی ہیں۔'' مجھے لڑکی کی باتوں پر تعجب سا ہو رہا تھا۔

''اس کائنات کے مخفی اسرار جاننا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں مگر کبھی کبھی یہ وہاں سے آشکار ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہماری سوچ نہیں جا پاتی۔ اب مجھے اجازت دیجئے مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا ہے خدا حافظ۔'' چشم زدن میں اس کا وجود ایک روشن گولے میں تبدیل ہوا پھر فضاء میں جا کر تحلیل ہو گیا۔

میں کافی دیر کھڑا کائنات کے مخفی رازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب کچھ پلے نہ پڑا تو عارف کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ جہاں لبنیٰ میری منتظر تھی۔ اس کے بعد ہمارا مسرتوں اور خوشیوں سے لبریز ایک نیا سفر شروع ہونے والا تھا۔

جنگل کا آسیب

خلیل جبار

نوجوان بولا۔ اوہ یہ بہت برا ہوا ہے کہ چڑیلوں نے شکاریوں والا فارمولا اپنا کر مجھے قید کرلیا اور جب ان کا دل کرے گا تو وہ آکر میرا خون پئیں گی اور پھر......

ایک آسیب کا دل دہلاتا ناقابل یقین اورناقابل فراموش خونچکاں بھونچکاں شاخسانہ

سہیل راستہ بھٹک کر جنگل کی طرف نکل گیا تھا وہ اپنے نانا قمرالدین کے گاؤں دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ سہیل میٹرک کا طالب علم تھا وہ شہر میں رہتا تھا لیکن اسے گاؤں کی زندگی بہت اچھی لگتی تھی۔ جب دو ماہ کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو وہ اپنے نانا قمرالدین کے پاس ضرور آتا تھا۔

اس کے ماموں غلام مصطفٰے اور ممانی فاطمہ بھی اس کی آمد پر خوش ہوتے تھے اس کے کزن، شاہد، عارف اور فریدہ کا بھی چھٹیوں میں اس کے ساتھ اچھا وقت گزرتا تھا۔

سہیل کو کھیت کھلیان دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر اکیلا ہی کھیتوں میں سیر کو نکل جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ... پر چلتا ہوا راستہ بھٹک کر کہیں سے کہیں نکل گیا ... یہ بھی دھیان نہیں رہا تھا کہ وہ جنگل میں نکل آیا ہے۔ اس لئے جب جانوروں کی آوازیں سنیں تو بری طرح خوف زدہ ہوگیا۔

ان دنوں جنگل میں آسیب کا راج تھا۔ شام ڈھلتے ہی آسیب جنگل میں آجانے والے انسانوں کو پکڑ لیتے تھے۔ اور پھر اس کا کچھ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ سہیل راستہ بھول چکا تھا یہ احساس ہونے پر وہ اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے نانا کے گھر کیسے جائے وہ ایک سمت چل کر یہ سوچتا کہ اب ضرور وہ گاؤں پہنچ جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا وہ دوبارہ خود کو جنگل میں پاتا گاؤں جانے کی کوشش میں ہر طرف تاریکی چھا گئی تھی۔

سہیل نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور ماموں کو کال لگائی۔

"ہیلو! ماموں جان میں راستہ بھٹک کر جنگل میں نکل گیا ہوا ور واپسی کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔" رابطہ ہونے پر سہیل نے کہا۔

"تم ایسا کرو جہاں ہو وہیں رک جاؤ، ہم موبائل کی لوکیشن کی مدد سے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سہیل نے کہا۔

"اور ہاں موبائل آن رکھنا۔" ماموں نے کہا۔

"میرا موبائل آپ کو آن ملے گا۔" سہیل نے کہا۔

سہیل ایک بہادر لڑکا تھا لیکن اس وقت جنگل میں خود کو اکیلا محسوس کر کے خوف زدہ ہو رہا تھا۔ اس نے جنگل میں آسیب کے متعلق مختلف کہانیاں سنی تھیں۔ اس لیے زیادہ خوف آ رہا تھا کہ کہیں کوئی آسیب اچانک سے سامنے نہ آ جائے۔

ایک مقام پر اسے ایک چڑیل نظر آئی۔ اس نے سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال بکھرے ہوئے تھے۔ منہ سے لمبے لمبے دو دانت باہر کو نکلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان دانتوں پر خون لگا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ چڑیل بہت ہی خوفناک لگ رہی تھی۔ وہ سہیل کی جانب بڑھی اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر سہیل کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی اور ایک طرف بھاگ اٹھا۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ ایک جھاڑی سے دو چڑیلیں، برآمد ہوئیں، انہوں نے بھی سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ سہیل نے اپنا رخ تبدیل کیا ابھی اس نے چند قدم آگے ہی بڑھائے تھے کہ دو چڑیلیں اور جھاڑی سے نکل آئیں۔ سہیل فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے کئی اور چڑیلیں آ گئیں۔ وہ بھی اس کی جانب بڑھنے لگیں سہیل خوف زدہ حالت میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ وہ جس طرف بھاگنے کی کوشش کرتا چڑیل اس کے سامنے آ جاتیں۔ بھاگتے میں اچانک اس کے ہاتھ پاؤں خشک لکڑی کی ٹہنیوں پر پڑے اور وہ نیچے گرتا چلا گیا۔ یہ ایک گڑھا تھا جس پر خشک لکڑیوں کی ٹہنیاں ڈال کر گڑھے کا منہ ڈھلک دیا گیا تھا۔ تاکہ یہ پتا نہ چلے کہ یہ گڑھا ہے۔ گڑھا زیادہ گہرا نہ تھا ورنہ زیادہ اونچائی سے گڑھے میں گرنے پر وہ شدید زخمی ہو سکتا تھا۔ چڑیلیں اسے گڑھے میں گرتا دیکھ کر وہاں سے دور ہو گئیں تھیں۔

"اوہ! یہ بہت برا ہوا ہے ان چڑیلوں نے شکاریوں والا فارمولا اپنا کر مجھے قید کر لیا ہے اب جب ان کا دل کرے گا آ کر پہلے میرا خون پئیں گی اور پھر میرا جسم کھا لیں گی۔" سہیل نے خود کلامی کی۔

چند لمحے گزرنے پر گڑھے کی دیوار ہٹنا شروع ہوئی گڑھے کے اندر ایک راستہ بن گیا۔ گڑھے کے اندر راستہ بنتا دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس راستے سے دو آدمی بر آمد ہوئے اور انہوں نے اسے پکڑ لیا۔

"کک..... کون ہو تم؟" سہیل نے پوچھا۔

"اندر جانے پر تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔" ایک آدمی نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا تم نا جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرو۔" سہیل نے کہا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو یہاں آنے والے کوئی بھی شخص زندہ بچ کر نہیں گیا پھر تمہاری کیا مجال ہے جو ہم سے بچ کر جاؤ۔" دوسرا آدمی بولا۔

"کیا تم نے مجھے مارنے کے لئے گرفتار کیا ہے۔" سہیل نے ان سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"تم نے اس گڑھے میں گر کر موت کو دعوت دی ہے۔" پہلے آدمی نے اس کے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو، میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم مجھے قتل کر دینا چاہتے ہو....."

"اس سے پہلے بھی جن لوگوں کو قتل کیا گیا انہوں نے بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔" دوسرا آدمی بولا۔

"تم کیوں انسانی جانوں کو ضائع کرنا چاہتے ہو۔" سہیل نے کہا

"یہ ہمارا پیشہ ہے ایسا نہ کرنے پر ہم بھوکے مر جائیں گے۔" پہلے آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

سہیل نے بہت کوشش کی ان کی گرفت سے آزاد ہو جائے لیکن وہ آزاد نہ ہو سکا۔ خاصی دیر اس سرنگ نما

راستے پر چلتے ہوئے وہ ایک کشادہ کمرے میں آ گئے وہ ایک تہہ خانہ تھا جس کے اوپر کمرے بنے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں مختلف انسانی ڈھانچے پڑے تھے۔ یہ ڈھانچے دیکھ کر اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی کہ وہ زندہ انسانوں کے اعضا جسموں سے نکال کر بیچنے کا کاروبار کرتے ہیں اس نے کئی انگریزی ڈراؤنی فلمیں دیکھی تھیں فلموں میں ایسے لوگوں کی کہانی بیان کی گئی تھی جو لوگوں کو مختلف مقامات سے اغوا کر کے ایک خاص جگہ پر لا کر قید کر دیتے ہیں۔ بعض انگریزی فلموں میں یہ بھی دکھایا گیا تھا کہ ایسے مقامات اسپتال سے قریب ہوتے ہیں تا کہ فوری طور پر ان اعضا کو دوسرے جسم میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ علاقہ شہر سے قریب تھا۔ اس لیے انسانی اعضا کو آسانی سے کار کے ذریعے پہنچایا جا سکتا ہے۔ اپنی آمد و رفت اور اپنے کام کو اس گڑھے کے ذریعے کرتے ہیں۔ گاؤں کے کسی گھر میں یہ کام کرنے سے لوگوں کی نظر میں یہ کام آ سکتا ہے اور یہ پکڑے جا سکتے ہیں۔

سہیل وہاں آ کر پھنس چکا تھا۔ ان دونوں نے تہہ خانے کا راستہ بند کر دیا اور بھاری سا تالا بھی دروازہ پر لگا دیا تھا کہ سہیل وہاں سے فرار نہ ہو سکے۔ وہ دونوں اسے وہاں چھوڑ کر اوپر چلے گئے وہ اپنے باس کو اطلاع دینے گئے تھے کہ سہیل کو پکڑنے کا بتا سکیں۔ انہوں نے سہیل کی تلاش ابھی نہیں کی تھی اور نہ ہی انہوں نے اسے باندھا تھا۔

سہیل وہاں آ کر پھنس ضرور گیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے یہاں نکلنے کو کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ کوشش نہ کرنے پر اس کا بھی یہ ہی انجام ہونا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں موبائل کا خیال آیا موبائل ایسا سہارا تھا جو ان سے بچا سکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی مختصراً احوال میں ایس ایم ایس کے ذریعے ماموں کو بیان کر دیا اور موبائل کو سائلینٹ کر کے اسے انسانی ڈھانچوں کے درمیان چھپا دیا تا کہ پولیس موبائل سم کی مدد سے وہاں پہنچ کر اسے ان ظالم درندوں سے بچا لے۔ یہ کام کر کے وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

چند لمحے گزرنے پر وہ دونوں دوبارہ تہہ خانے میں داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک موٹا آدمی جو خوفناک چہرے کا مالک تھا اندر آیا۔ سہیل کو دیکھ کر موٹے آدمی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''بہت اچھے موقع پر یہ شکار ہمارے ہاتھ لگا ہے، ابھی مجھے کال آئی ہے کہ پندرہ سے بیس سال کے بچے کے گردوں کی سخت ضرورت ہے۔ ہم اس بچے کے گردے آج ہی نکال کر روانہ کر دیں گے۔''

''اس کی موت لکھی تھی جبھی یہ ہمارے پاس پہنچ گیا ہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

''کیا تم نے اس کی تلاشی لے لی ہے۔''

''نن..... نہیں.....'' پہلے آدمی نے کہا۔

''بے وقوفوں میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ جب بھی کسی کو پکڑو پہلے اس کی تلاشی لے لیا کرو'' باس کو بے اختیار غصہ آ گیا۔

تہہ خانے میں وہ اچھے موڈ میں داخل ہوا تھا ان کی تلاشی نہ لینے پر اسے سخت غصہ آ گیا۔ غصے میں وہ اور بھی بد صورت لگ رہا تھا۔ باس کو غصے میں دیکھ کر وہ دونوں تیزی سے سہیل کی تلاشی لینے لگ گئے۔ اچھی طرح تلاشی لینے پر وہ بولے۔

''باس اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے آئندہ میری ہدایت پر سختی سے عمل ہونا چاہیے۔''

''جی ایسا ہی ہوگا'' پہلا آدمی ڈرتے ڈرتے بولا۔

''اے لڑکے زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہاں کوئی ایسا راستہ نہیں ہے کہ تم چالاکی دکھا کر فرار ہو جاؤ۔''

سہیل خاموش رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر باس پھر بولا۔

''یہ سمجھدار بچہ لگتا ہے۔ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا کہ ہم اسے تکلیف پہنچائیں۔ میں اس کے جسم سے گردے نکالنے کا انتظام کرتا ہوں، تم جب تک اسے لیے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو۔''

سہیل کے ہاتھ پاؤں باندھنے پر باس اوپر چلا گیا

اس کے ساتھ وہ بھی اوپر چلے گئے وہ اکیلا رہ گیا تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تھے۔ سہیل کے ماموں پولیس کو لے کر نہیں پہنچے تھے۔ وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ موبائل نکال کر SMS کردے۔ باس دونو جوانوں کے ساتھ تہہ خانے میں داخل ہوا۔ ایک نظر اس نے سہیل پر ڈالی اور بولا۔ ''اے لڑکے مجھے بہت افسوس اور دکھ بھی ہے تو نے ابھی دنیا ٹھیک سے دیکھی بھی نہیں اور موت سے ہمکنار ہو جائے گا۔''

''جب تمہیں افسوس اور دکھ ہو رہا ہے پھر مجھے کیوں جان سے مارنا چاہتے ہو۔'' سہیل نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''یہ ہماری مجبوری ہے، ہماری روزی لوگوں کو قتل کرنے سے بندھی ہوئی ہے۔ آئے دن حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف بیماریوں سے زندہ اور پیسے والوں کو انسانی اعضاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان امیروں کو بچانے کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہیں گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا۔''

''تم انسانوں کو قتل کر کے اپنے سر گناہوں کا بوجھ بڑھا رہے ہو۔''

''تم مجھے پڑھے لکھے لڑکے لگتے ہو۔''

''میں میٹرک کا طالب علم ہوں۔ اور ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' سہیل نے کہا۔

''ڈاکٹر بن کر تم بھی وہی کام کرو گے لوگوں کے جسم چیر کر آپریشن کرو گے۔''

''میں انسانوں کو بچانے کی غرض سے یہ کام کروں گا۔''

''ہم بھی انسانوں کو اعضا دے کر بچا رہے ہیں۔'' باس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم ایک انسان کو بچانے کی خاطر ایک انسان کو قتل کر رہے ہو۔ یہ انسانیت کی خدمت نہیں ہے۔'' سہیل نے کہا۔

''بہت اچھے خیالات کے مالک ہو لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، تم نے ہماری آمد و رفت کا راستہ دیکھ لیا، ہمارے راز سے واقف ہو گئے ہو۔ میں کسی صورت تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تمہیں چھوڑنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔''

''پولیس ایک نہ ایک دن تم تک پہنچ ہی جائے گی۔'' سہیل نے کہا۔ ''دیکھا جائے گا۔'' باس نے کہا۔

''دیکھ کیا رہے ہو اٹھاؤ اس لڑکے کو اور آپریشن تھیٹر تک پہنچا دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ دونوں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے۔

☆.....☆.....☆

''باس پولیس آ گئی ہے۔'' ایک آدمی گھبراتے ہوئے تہہ خانے میں داخل ہوا۔

''گدھے کے بچوں پولیس کو باہر سے ہی رخصت کر دینا چاہیے تھا۔ یہ اسپتال ہے ان کو ہمارے کام پر کسی قسم کا کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ اچھا ٹھہرو میں بھی چلتا ہوں۔'' باس کچھ سوچتے ہوئے اوپر چلا گیا۔

سہیل پولیس کے آجانے پر مطمئن ہو گیا تھا۔ کچھ دیر گزرنے پر پولیس تہہ خانے میں موجود تھی۔ پولیس نے ان آدمیوں کو پکڑ لیا تھا۔ اور رسم کی مدد سے ہی وہ تہہ خانے کے اندر آئی تھی۔ پولیس کو آنے میں اس لیے دیر ہوئی تھی کہ پولیس کے پہلے ہی اس اسپتال کے لوگوں پر شک تھا کہ یہاں غیر قانونی سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ اس کے ایس ایم ایس کو پڑھ کر پولیس کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ شہر سے فوری طور پر زیادہ پولیس منگوا کر اسپتال پر چھاپہ مارا گیا تھا۔ جو سہیل کے موبائل کی مدد سے کامیاب ہوا تھا۔

اس گروہ کو پکڑوانے پر حکومت سے سہیل کو بھاری انعام مل گیا تھا۔ اخبارات میں اس اسپتال کے بارے میں ساری تفصیلات شائع ہو گئی تھیں کہ اسپتال کے نام پر وہاں کیا ہو رہا تھا۔

سہیل کو بھی اس واقعہ سے نصیحت ہو گئی تھی کہ اکیلے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے ورنہ انسان کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

زندگی

رابعہ آفرین-لاہور

نوجوان کی آواز گونجی کیا کروں میں اکیلا، زندگی بوجھ لگتی ہے، دم گھٹتا ہے میرا اس دنیا میں پل پل بے چین رہتا ہوں میرا بس نہیں چلتا ورنہ میں .....

خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن دل خراش اور دل نگر اور دل دہلاتی خوفناک کہانی

ماتھے پر شکن لیے تنے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ ٹیرس پر کھڑا سگریٹ پہ سگریٹ پینے میں مصروف تھا۔

''چھوڑنا ہے تو جائے چھوڑ کے۔'' غصہ اس کے ماتھے کی رگوں کو ابھار رہا تھا۔

''جب سب کے چھوڑ کر جانے پر مجھے کچھ نہیں ہوا تو اس کے چلے جانے پر بھی میں مر نہیں جاؤں گا۔''

ایک سگریٹ ختم ہوا تو دوسرا لائٹر سے پھر سلگا لیا۔

''زندگی کو نا ختم ہو جاتی ہے کسی کے جانے سے؟''

''سمجھتی ہے میں اس کے بنا نہیں رہ پاؤں گا؟ میں اسے جی کر دکھاؤں گا!''

اس نے سگریٹ کا ایک اتنا لمبا کش لیا کہ سگریٹ آدھے سے زیادہ جل گیا۔

''وہ بھی تو یہی چاہتی تھی کہ میں زندگی جیئوں۔

اس کے پیچھے مروں ناں۔''

ایک ہنستا مسکراتا، اٹکھیلیاں کرتا چہرہ اس کے ذہن کے تصور پر ابھرا۔

''تم کیوں چلی گئی مجھے چھوڑ کر؟'' دل کرلایا۔

''جانا ضروری تھا؟'' اگلے کش میں سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔

اک مردانہ ہاتھ اس کے کندھے پر آ کر ٹھہرا اور پیچھے سے ایک سفید کاٹن کے سوٹ میں ملبوس ایک مردانہ وجود اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔

''تم کیوں آئے ہو میرے پاس اب؟'' اس نے اس مردانہ وجود کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور سامنے دیکھتے ہوئے ہی پوچھا۔

آنے والے مردانہ وجود کے بال دائیں طرف کو سنوارے ہوئے تھے۔ روشن آنکھیں لبوں پر دھیمی مسکان اور خندہ پیشانی، نوجوان خوش شکل تھا۔

''ایسا ہو سکتا ہے زلفی کہ تم اداس ہو اور میں سکون سے رہوں؟'' آنے والے شخص نے ذوالفقار سے سوال کیا۔

''اگر اتنی ہی فکر تھی تو چھوڑ کر نہ جاتے۔'' وہی کسی کو خاطر میں نہ لانے والے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں غصہ تھا تو لہجے میں چنگاریاں لیکن اس کے لرزتے ہونٹ اس بات کی چغلی کھا رہے تھے اس کا دل بہت زیادہ رونے پر آمادہ تھا لیکن وہ ضبط کر رہا تھا۔

''میں اپنی مرضی سے گیا تھا؟'' ثقلین نے خود پر انگلی رکھتے ہوئے دکھ بھری مسکان سے پوچھا۔

''جو بھی تھا۔ چھوڑا تو تم سب نے ہے مجھے۔ تم نے، امی نے، ابو نے اور اب تمہاری بھابھی نے بھی!'' آنکھیں ضبط سے لال ہو گئی تھیں۔

''آپ کو یہ سمجھنا ہوگا بھائی کہ ہم سب میں سے کسی نے بھی آپ کو اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا، بھابھی نے بھی نہیں!'' اس نے ذوالفقار کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے اسے اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے کچھ نہیں سمجھنا، جاؤ اپنی دنیا میں خوش رہو تم سب!'' اس کا اپنے کندھے پر رکھا ہاتھ زور سے جھٹکتے ہوئے ذوالفقار نے سلگتے لہجے میں کہا۔

''آپ کو دکھی دیکھ کر ہم سب خوش رہ سکتے ہیں؟'' ثقلین کے چہرے پر اب بے بسی نظر آنے لگی۔

''رہ تو رہے ہو۔'' ایک نیا سگریٹ منہ سے لگایا اور لائٹر سے جلایا۔

''اگر رہ رہے ہوتے تو میں اس وقت آپ کے پاس نہ ہوتا۔'' ثقلین کو بھی اب غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے بھنویں چڑھاتے ہوئے ذرا غصے سے دیکھا۔

''تو نہ آتے، احسان کیا؟ میں نے بلایا تھا۔؟'' سارا غصہ سے پھر سگریٹ پر نکالا۔

''نہیں بلایا۔ لیکن آپ کا ہم پر غصہ، ہم سے نفرت ہمیں سکون سے نہیں رہنے دے گا۔''

''آپ کو پتا ہے نا کہ بھابھی آپ سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ آپ تو بھابھی پر بھی ویسے ہی غصہ کرنے لگ گئے۔'' ثقلین نے بھی اپنا رخ سامنے کر لیا اور ہاتھ باندھ کر باہر دیکھنے لگا۔ نیچے اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔

''ہاں تو کیا کروں؟ کیا کروں میں؟ خوشیاں مناؤں کہ تم سب لوگ مجھے چھوڑ گئے ہو؟'' اس نے سگریٹ ایک طرف زور سے پھینکا اور ثقلین کی طرف رخ کر کے ہاتھ نچا نچا کے بولا۔

''خوشیاں مناؤں کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں؟''

''یا پھر ڈانس کروں کہ سب رشتے ختم ہو گئے ہیں؟'' اس نے دونوں بانہیں کھول کر سینہ ہلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جسم کو اک پل کے لیے ہلایا اور غصے کی حالت میں ہی نیا سگریٹ سلگایا۔

''زندگی کی آخری امید، آخری وجہ تھی تمہاری بھابھی اور وہ بھی دھوکا دے گئی۔''

''بھابھی نے آپ کو دھوکا نہیں دیا، جب خدا کا بلاوا آ جائے تو جانا ہی پڑتا ہے۔'' کمرے میں کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی تو ذوالفقار بھائی کو وہیں چھوڑ کر

جلدی سے کمرے میں گیا۔ امریکن طرز کا بہت خوبصورت کمرہ تھا یہ۔

اس کمرے میں ایک طرف اوپن کچن تھا۔ جہاں اسٹیل کا گلاس نیچے گرا پڑا تھا۔ اس کی نظر بلا ارادہ کچن کی دوسرے حصے میں گئی جہاں اس کی بیوی کھڑی ہو کر اکثر اس کو دیکھا کرتی تھی۔

وہ ایک پلر تھا جو کچن کے درمیان میں تھا۔ اس کے پیچھے سے اسے اپنی بیوی کا سرمئی آنچل لہراتا ہوا محسوس ہوا تو اس نے پکارا۔

''زلیخا'' آنچل اڑتا دیکھ کر پلر کے پاس گیا۔ اک خوبصورت نقوش کی حامل لڑکی اپنی خوبصورت آنکھوں میں پانی لیے رو رہی تھی۔ آنسوں اس کی آنکھوں سے زاروقطار بہہ رہے تھے۔

''زلیخا!'' کہتے ہوئے اس کے آنسو پونچھنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو وہ فوراً دو قدم پیچھے ہٹی۔

''میں نے آپ کو کب دھوکا دیا؟''

''میں تو آپ کو اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی۔''

''اس لیے تو آپ کی جان بچاتے بچاتے خود ٹرک کے نیچے آ گئی تھی اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے آپ کو دھوکا دیا؟'' آنسوں اس کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

وہ تسلسل دکھ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تم نے مجھے دھوکا دیا! مرنا تھا تو مجھے ساتھ لے کر مرتی۔'' وہ دو قدم آگے بڑھا کہ اس کی آنکھیں پونچھ سکے لیکن وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''میں نے ہر نماز میں۔ ہر دعا میں آپ کی زندگی مانگی تھی۔ پھر آپ کو کیسے مرنے دیتی؟''

''تو میں اب اس دنیا میں اکیلا کیا کروں؟''

''کیا کروں میں اکیلا؟ زندگی بوجھ لگتی ہے۔ دم گھٹتا ہے میرا اس دنیا میں اس نے بے بسی سے اپنے بالوں کو نوچا۔

''آپ اکیلے نہیں ہیں زلفی۔'' وہ دو قدم آگے بڑھی۔ اس کے سینے پہ اک طرف ہاتھ اور دوسری طرف اپنا سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

''آپ کے پاس نینا ہے..... زندگی جینے کی خاص وجہ! اک اور رشتہ آپ کو اس کے لیے جینا ہوگا۔ ہماری محبت کی نشانی کے لیے..... ہماری بیٹی کے لیے.....'' سسکیوں کے درمیان بات مکمل کی گئی۔

''میں تمہارے بنا نینا کو نہیں سنبھال سکتا زلیخا، واپس آ جاؤ۔'' اس نے اپنے دونوں بازوؤں کے گھیرے میں زلیخا کو سموتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کے ساتھ آپ کے پاس ہی ہوں ہر وقت۔ باپ ہیں آپ نینا کے اور باپ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتے ہیں بیٹیوں کے لیے۔ پہلے خود کو سنبھالیں آپ، پھر اسے بھی سنبھال لیں گے۔'' وہ اس سے الگ ہو کر اس کے دونوں ہاتھ پیار سے پکڑ کر بولی۔

اخلاص نیت

جو بھی کام کرنا اللہ کی رضا کے لئے کرنا ایک کھجور کا دانہ اللہ کی رضا کے لئے دیں۔ اللہ تعالیٰ اس کا ثواب پہاڑوں جتنا دیں گے ریاکاری سے سونا چاندی بھی پکڑ کا سبب بن جائے گا۔

تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اس لئے ضروری ہے جو کام بھی کیا جائے وہ خدا کی رضا کے لئے کیا جائے کیوں کہ اعمال کی جزا و سزا کا حقیقی مالک خدا ہے۔ خدا دل کا بھید اور روشنیوں کو بھی دیکھتا ہے۔ لہٰذا جو بھی کرو صالح طریقے سے کرو، اعمال صالح کا فوری اثر ہوتا ہے۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

''تم واپس آجاؤ زلیخا، خدا کا واسطہ!'' اس نے زلیخا کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کی مضبوطی بڑھائی۔

''جہاں میں ہوں، وہاں سے لوگ واپس نہیں آیا کرتے زلفی۔'' ذوالفقار کا یہ حال زلیخا سے بھی نہیں دیکھا جارہا تھا لیکن ذوالفقار جتنی جلدی حقیقت کو قبول کر لیتا اتنا ہی بہتر ہوتا اس کے لیے۔

''زلیخا صحیح کہہ رہی ہے زلفی۔ ہم قدرت کے اصولوں کے خلاف نہیں جاسکتے۔ اس کے ابو کی آواز کمرے میں گونجی تو وہ زلیخا کو چھوڑ کر فوراً پیچھے پلٹا۔ سامنے ہی اس کے امی ابو دونوں ہی سفید لباس میں کھڑے تھے۔

وہ تیزی سے ان کے پاس گیا۔ دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر کر دل کو ٹھنڈک دی۔

''آپ اس دنیا میں بھی چشمہ لگاتے ہیں۔'' اس نے ان کے چشمے کی طرف اشارہ کر کے کہا تو سب مسکرا اٹھے۔

سوگوار فضا ایک پل کے لیے ہلکی ہوگئی۔

''ہمیں پتا ہے تمہیں ہم سب سے بہت شکوے ہیں میرے بچے۔'' امی نے اس کے گال پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

''لیکن ہم سب کا جانا مجبوری تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود کو ہی تباہ کرلو۔ خدا سے شکوہ مت کیا کرو۔ اس دنیا میں آنے والے کو جانا ہی ہوتا ہے۔'' ابو نے ہمیشہ کی طرح سمجھایا جیسے وہ اپنی زندگی میں ہر اچھا برا سمجھایا کرتے تھے۔

''ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں بیٹا لیکن اگر پیار کرنے والے دور ہو جائیں تو زندگی میں جینا چھوڑا نہیں کرتے۔ زندگی جینے کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لیا کرتے ہیں۔'' امی نے پیار سے کہا۔ اور آپ کے پاس ہماری بیٹی کے روپ میں وجہ بھی ہے جینے کی۔ اس کی زندگی کو بھی سنوارنے پر دھیان دیں۔ پیچھے سے نکل کر زلیخا امی ابو کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

''اور یہ تب ہوگا جب آپ خود پر دھیان دیں خود کو سنبھالیں۔ کیوں بھابھی؟'' باہر سے ثقلین بھی اندر آ کر امی ابو کے ساتھ کھڑا ہوتے ہوئے بولا پہلے بھابھی سے بولا اور پھر بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ازلی نرم لہجے میں مسکان کے ساتھ بولا۔

''بھائی اگر آپ اس دنیا میں خوش رہیں گے تو ہم اس دنیا میں بھی خوش ہوں گے۔''

''اپنا خیال رکھا کریں زلفی آپ کو پتا ہے نا کہ آپ سے میری سانسیں چلتی ہیں۔ سو اگر آپ ٹھیک ہوں گے تو مجھے بھی اپنے پاس ہر وقت پائیں گے۔ آپ مجھے خود اپنی صورت میں ہنستا، مسکراتا، روتا کھاتا پیتا اور ہماری نینا کا خیال رکھتا محسوس کریں گے۔''

''میں آج بھی آپ کی فٹبال کو یاد کرتا ہوں بھائی۔ آپ سے اچھا کوئی نہیں۔ خود کو ضائع مت کریں۔'' ان چاروں کے پاؤں دانے دار دھوئیں میں بدلنا شروع ہوگئے۔

''ہم دونوں کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' امی ابو ایک ساتھ بولے۔ اب وہ سینے کے پاس سے دھواں بننا شروع ہوگئے۔ نچلا پورا دھڑ غائب ہو چکا تھا سب کا۔

''زلفی آپ سے میری ذات ہے۔ جب تک آپ زندہ ہیں ہم سب کا پیار آپ میں زندہ رہے گا۔'' وہ گردن سے دھواں بننے لگ گئے تو زلیخا نے مسکرا کر پیار سے زلفی کو دیکھا۔

''زندگی خدا کی نعمت ہے، خدا کی دی ہوئی کسی بھی نعمت کا ناشکری نہیں کرتے۔'' ابو کے بولتے ہی سب کے چہرے ایک ساتھ ہوا میں غائب ہوگئے۔ وہ چند پل اسی طرح کھڑا رہا لیکن پھر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں اس کی دو سالہ بیٹی سوئی ہوئی تھی۔ اب اسے جینا تھا، مسکرانا تھا، نینا کا طاقت ور باپ بننے کے لیے..... اسے جینا تھا سب کا پیارا رخود میں زندہ رکھنے کے لیے۔

نیلا بندر

ناصر محمود فرہاد۔۔فیصل آباد

وہ ایک وجیہ اور دلکش آدمی تھا مگر اب ایک نظر دیکھنے پر اندازہ ہورہا تھا کہ دوسرے نوجوان کی موت نے اسے اس قدر توڑ کر رکھ دیا تھا اور ......

خوف کے افق پر جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی خوفناک دہشت ناک......لرزاتی کہانی

شدید گرم دن کے بعد ایک حبس زدہ شام اس چھوٹے سے کمرے میں میرا دوست ”مسٹر ایسٹ“ اور میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایسٹ ایک لیمپ کی مدھم روشنی میں ایک جاسوسی ناول پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ سر جھکائے ناول میں گم تھا اور میں ایک کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانک رہا تھا۔ آسمان پر پورا چاند اپنی روشنی بکھیر رہا تھا جو کھلی کھڑکی سے اندر کمرے میں اترتے ہوئے مسحور کن منظر پیش کررہی تھی۔

”ہم یہاں آرام اور سکون کی خاطر آئے تھے ایسٹ!..........“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال ہے تم اب بھی آرام ہی کررہے ہو۔“ ایسٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مگر...... مجھے یاد نہیں کہ یہاں پہنچنے کے بعد

''تم واپس آجاؤ زلیخا، خدا کا واسطہ!'' اس نے زلیخا کے ہاتھ پر اپنے ہاتھوں کی مضبوطی بڑھائی۔

''جہاں میں ہوں، وہاں سے لوگ واپس نہیں آیا کرتے زلفی۔'' ذوالفقار کا یہ حال زلیخا سے بھی نہیں دیکھا جارہا تھا لیکن ذوالفقار جتنی جلدی حقیقت کو قبول کر لیتا اتنا ہی بہتر ہوتا اس کے لیے۔

''زلیخا صحیح کہہ رہی ہے زلفی۔ ہم قدرت کے اصولوں کے خلاف نہیں جاسکتے۔ اس کے ابو کی آواز کمرے میں گونجی تو وہ زلیخا کو چھوڑ کر فوراً پیچھے پلٹا۔ سامنے ہی اس کے امی ابو دونوں ہی سفید لباس میں کھڑے تھے۔

وہ تیزی سے ان کے پاس گیا۔ دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر کر دل کو ٹھنڈک دی۔

''آپ اس دنیا میں بھی چشمہ لگاتے ہیں۔'' اس نے ان کے چشمے کی طرف اشارہ کر کے کہا تو سب مسکرا اٹھے۔

سوگوار فضا ایک پل کے لیے ہلکی ہوگئی۔

''ہمیں پتا ہے تمہیں ہم سب سے بہت شکوے ہیں میرے بچے۔'' امی نے اس کے گال پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہا۔

''لیکن ہم سب کا جانا مجبوری تھی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم خود کو ہی تباہ کرلو۔ خدا سے شکوہ مت کیا کرو۔ اس دنیا میں آنے والے کو جانا ہی ہوتا ہے۔'' ابو نے ہمیشہ کی طرح سمجھایا جیسے وہ اپنی زندگی میں ہر اچھا برا سمجھایا کرتے تھے۔

''ہم سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں بیٹا لیکن اگر پیار کرنے والے دور ہو جائیں تو زندگی میں جینا چھوڑا نہیں کرتے۔ زندگی جینے کی کوئی نہ کوئی وجہ تلاش کر لیا کرتے ہیں۔'' امی نے پیار سے کہا۔ اور آپ کے پاس ہماری بیٹی کے روپ میں وجہ بھی ہے جینے کی۔ اس کی زندگی کو بھی سنوارنے پر دھیان دیں۔ پیچھے سے نکل کر زلیخا امی ابو کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

''اور یہ تب ہوگا جب آپ خود پر دھیان دیں خود کو سنبھالیں۔ کیوں بھابھی؟'' باہر سے تھکلین بھی اندر آ کر امی ابو کے ساتھ کھڑا ہوتے ہوئے بولا پہلے بھابھی سے بولا اور پھر بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ازلی نرم لہجے میں مسکان کے ساتھ بولا۔

''بھائی اگر آپ اس دنیا میں خوش رہیں گے تو ہم اس دنیا میں بھی خوش ہوں گے۔''

''اپنا خیال رکھا کریں زلفی آپ کو پتا ہے نا کہ آپ سے میری سانسیں چلتی ہیں۔ سو اگر آپ ٹھیک ہوں گے تو مجھے بھی اپنے پاس ہر وقت پائیں گے۔ آپ مجھے خود اپنی صورت میں ہنستا، مسکراتا، روتا کھاتا پیتا اور ہماری نینا کا خیال رکھتا محسوس کریں گے۔''

''میں آج بھی آپ کی فٹبال کو یاد کرتا ہوں بھائی۔ آپ سے اچھا کوئی نہیں۔ خود کو ضائع مت کریں۔'' ان چاروں کے پاؤں دانے دار دھوئیں میں بدلنا شروع ہوگئے۔

''ہم دونوں کی دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' امی ابو ایک ساتھ بولے۔ اب وہ سینے کے پاس سے دھواں بننا شروع ہوگئے۔ نچلا پورا دھڑ غائب ہو چکا تھا سب کا۔

''زلفی آپ سے میری ذات ہے۔ جب تک آپ زندہ ہیں ہم سب کا پیار آپ میں زندہ رہے گا۔'' وہ گردن سے دھواں بننے لگ گئے تو زلیخا نے مسکرا کر پیار سے زلفی کو دیکھا۔

''زندگی خدا کی نعمت ہے، خدا کی دی ہوئی کسی بھی نعمت کا ناشکری نہیں کرتے۔'' ابو کے بولتے ہی سب کے چہرے ایک ساتھ ہوا میں غائب ہوگئے۔ وہ چند پل اسی طرح کھڑا رہا لیکن پھر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں اس کی دو سالہ بیٹی سوئی ہوئی تھی۔ اب اسے جینا تھا، مسکرانا تھا، نینا کا طاقت ور باپ بننے کے لیے..... اسے جینا تھا سب کا پیارا رخود میں زندہ رکھنے کے لیے۔

نیلا بندر

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

وہ ایک وجیہ اور دلکش آدمی تھا مگر اب ایک نظر دیکھنے پر اندازہ ہورہا تھا کہ دوسرے نوجوان کی موت نے اسے اس قدر توڑ کر رکھ دیا تھا اور .....

خوف کے افق پر جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی خوفناک دہشت ناک.....لرزاتی کہانی

شدید گرم دن کے بعد ایک حبس زدہ شام اس چھوٹے سے کمرے میں میرا دوست ''مسٹر ایسٹ'' اور میں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ایسٹ ایک لیمپ کی مدھم روشنی میں ایک جاسوسی ناول پڑھنے میں مصروف تھا۔ وہ سر جھکائے ناول میں گم تھا اور میں ایک کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانک رہا تھا۔ آسمان پر پورا چاند اپنی روشنی بکھیر رہا تھا جو کھلی کھڑکی سے اندر کمرے میں اترتے ہوئے مسحور کن منظر پیش کررہی تھی۔

''ہم یہاں آرام اور سکون کی خاطر آئے تھے ایسٹ!.....'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے تم اب بھی آرام ہی کررہے ہو'' ایسٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مگر..... مجھے یاد نہیں کہ یہاں پہنچنے کے بعد

میں نے تمہیں ایک لمحہ بھی آرام کرتے دیکھا ہو۔تم زیادہ وقت مصروف ہی رہے ہو۔''

''پریشان مت ہو..... مجھے عادت ہے اس چیز کی.....''

میں دوبارہ کھلی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔باہر سے آتی ایک آواز سن کر چونک پڑا اور کھڑکی کی چوکھٹ کی طرف جھک کر سننے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو مڑا اور سوالیہ نظروں سے ایسٹ کی طرف دیکھا۔وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔اس کی آنکھیں لیمپ کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔

''کچھ سنا تم نے.....؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....واضح طور پر کسی عورت کی چیخ کی آواز تھی۔'' ایسٹ متفکر انداز میں بولا۔

کچھ دیر ہم کان لگا کر دوبارہ سننے کی کوشش کرتے رہے مگر جب دوبارہ کچھ سنائی نہ دیا تو مجھے شک گزرنے لگا کہ یہ ہمارا وہم تھا۔ ہوسکتا ہے درختوں میں ہوا کی سرسراہٹ ہو۔تب.....اسی وقت یہ مدھم آواز دوبارہ ابھری۔ اب یہ کافی قریب محسوس ہوئی۔

''جلدی آؤ۔۔۔۔'' ایسٹ باہر کی جانب لپکتے ہوئے چیخا۔

ہم دونوں بھاگتے ہوئے اپنے کیبن کے پیچھے پہنچے۔تقریباً دو سو گز دور چاند کی روشنی میں ایک نسوانی ہیولہ پہاڑی کی ڈھلوان پر نمودار ہوا۔ وہ ہاتھ لہراتے ہوئے ہماری طرف بھاگی۔ معاملے کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ہم دونوں بھی اس کی طرف دوڑے اور چند لمحوں میں اس کے قریب پہنچ گئے۔ وہ ایک خوبرو نوجوان لڑکی تھی جو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ قریب آتے ہی وہ لہرائی اور غش کھا کر زمین پر گر گئی۔ ایسٹ نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا۔

''اوہ میرے خدا!.....یہ تو مس ایلس ہے۔'' ایسٹ بے ہوش لڑکی کی شکل دیکھتے ہی بوکھلا کر تقریباً چیخ اٹھا۔

اس کی بات سنتے ہی میں چونک اٹھا۔اس کا مطلب تھا کہ غش کھا کر گرنے والی لڑکی ہمارے پڑوسی سر جیفری کی بیٹی تھی۔ سر جیفری کا مکان اس جگہ سے صاف نظر آتا تھا جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے مگر وہ وہاں سے تقریباً ایک میل دور تھا اور ہمارے کیبن اور اس گھر کے بیچ ایک کھلا میدان حائل تھا۔

ایسٹ نے اس لڑکی کو سنبھالا اور بمشکل اٹھا کر اپنے کیبن میں لے آیا۔ میں نے فوراً اسے ابتدائی طبی امداد دی۔ وہ بے حسین اور جاذب نظر لڑکی تھی۔اس کا پرکشش بدن ہولے ہولے لرز رہا تھا اور وہ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد آخر کار وہ بولنے کے قابل ہوگئی۔

''میرا باپ.....آہ.....میرا بے چارہ باپ۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیا ہوا.....؟۔میں نے پوچھنا چاہا۔

''اس.....سیاہ غار میں.....''

''سیاہ غار.....وہ جو یہاں سے تقریباً آدھ میل کے فاصلے پر ہے۔''

''کیا ہوا وہاں.....؟'' ایسٹ نے پوچھا۔

''وہ وہاں پڑا ہے.....میرا بے چارہ باپ .....وہ مر چکا ہے۔''

''کیا.....سر جیفری مر گیا.....؟'' ایسٹ بری طرح اچھلا۔

''وہ وہاں اس غار کے ایک طرف پڑا ہے۔ میں اس کی تلاش میں وہاں تک گئی تھی۔ دیکھا تو وہ وہاں پڑا تھا۔۔۔مر چکا تھا۔اوہ خدا!۔۔۔میری مدد کرو۔''

ایسٹ اور میں چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہمیں یقین نہیں آرہا تھا کہ سر جیفری قتل ہوگئے۔

اچانک وہ پریشان لڑکی ایسٹ کی طرف مڑی اور سختی سے اس کا بازو جکڑ لیا اور چلائی۔''اوہ مسٹر ایسٹ! .....میرے بے چارے باپ نے کیا قصور کیا تھا۔اس کو جس نے مارا ہے تم اسے تلاش کرو گے

نا۔۔۔خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میرا باپ سر جیفری تم پر بہت اعتماد کرتا تھا۔ میں جانتی ہوں تم پولیس کی سیکرٹ سروس کے ایک خفیہ ایجنٹ ہو اور میں تمہارے گذشتہ کارناموں سے بھی آگاہ ہوں۔''

ایسٹ کا منہ بگڑ گیا۔ وہ ہولے سے کچھ بڑبڑایا یوں جیسے اسے اپنی شناخت کا اظہار پسند نہ آیا ہو۔ وہ کہنے لگا۔ ''مس ایلس!.....مجھ پر اعتماد کرو۔ میں اپنے دوست ڈاکٹر کے ساتھ یہاں موجود ہوں۔ میں بھی سر جیفری کی بہت عزت کرتا ہوں۔'' اس کی آواز میں قدرے لرزش تھی۔

☆.....☆.....☆

پانچ منٹ بعد ایسٹ اور میں مس ایلس کو وہیں اپنے کیبن میں چھوڑ کر اس سیاہ غار کی طرف چل پڑے۔ ایلس کا گھر تقریباً ڈیڑھ میل دور تھا اور فوری کوئی اور بندوبست ممکن نہ تھا اور دیر بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

ہم جانتے تھے کہ سر جیفری کو نادر و نایاب چیزیں جمع کرنے کا شوق ہی نہیں خبط تھا اور اس نے ان چیزوں کی مدد سے اپنے گھر میں ہی ایک عجائب گھر بنا رکھا تھا۔ چند روز پہلے وہ اسی غرض سے لندن گیا تھا جہاں اسی قسم کے کچھ نمونوں کی نیلامی کی تقریب میں اس نے حصہ لینا تھا۔ اس کا سیکرٹری مسٹر ڈیموپولن بھی اس کے ساتھ تھا۔ ڈیموپولن ایک یونانی النسل خوبرو نوجوان تھا۔ نیلامی کے بعد سر جیفری تو واپس آگئے مگر ڈیموپولن اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں لندن ہی رک گیا تھا۔

آج شام سر جیفری اپنے معمول کے مطابق شام ڈھلے پیدل ہی سیر پر نکل گئے۔ شام کے بعد اس راستے پر مس ایلس کو اپنے باپ کی لاش ڈرامائی انداز میں ملی تھی جس کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے۔ بظاہر ان کا کوئی ایسا دشمن نہ تھا جو ان کی جان کے درپے ہوتا۔ ایلس کے مطابق سیر پر نکلتے وقت اس کے باپ کے پاس کچھ زیادہ رقم بھی نہیں تھی کہ کہا جاتا کہ یہی قتل کا محرک ہے۔

ایلس سے ملی معلومات کے مطابق آج سیر پر نکلتے وقت سر جیفری کو ڈاک سے ایک بڑا پارسل موصول ہوا تھا جو اس کے لندن سے خریدے گئے نوادرات میں سے ایک تھا۔ یہ اس نے خود ہی لندن سے بک کروایا تھا۔ باقی اشیاء ریلوے کے کارگو کے ذریعے پہنچنا تھیں۔

''اس پارسل میں کیا تھا؟'' ایسٹ نے سوال کیا۔

''چینی مٹی کا بنا ہوا ایک بندر..... نیلے رنگ کا ایک بندر.....''

ایلس کے مطابق اس کے باپ سر جیفری نے اس بندر کو خریدنے میں کافی دل چسپی دکھائی تھی اور سیر پر جاتے ہوئے وہ اس کو اپنے ساتھ ہی لے گیا نہ جانے کیوں۔

جائے وقوعہ پر ایسٹ کی متجسس نظریں ایک ایک چیز کو کھوج رہی تھیں۔ وہ ایک خوف ناک جگہ تھی۔ یہ پہاڑوں کے اندر ایک بہت بڑا غار تھا۔ ایک طرف مٹی کا ایک اونچا تودہ تھا جو ویرانے میں اترتا تھا۔ دوسری طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جو راستہ سر جیفری کے گھر کی طرف سے آتا تھا وہ جھاڑیوں کے قریب سے گزرتا تھا۔

اس جگہ کے متعلق مختلف روایات مشہور تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ غار قدرتی ہے مگر مقامی لوگ یقین رکھتے تھے کہ یہ کسی متروک کان کا دہانہ ہے۔ اس کی گہرائی نامعلوم تھی۔ حقائق کچھ بھی ہوں مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ جگہ بہت ڈراؤنی اور مہیب تھی۔ وہاں ہم نے سر جیفری کو دیکھا۔

وہ وہاں بڑے غیر فطری انداز میں زمین پر پڑا تھا۔ اس کا سیدھا ہاتھ بری طرح مڑا ہوا تھا جب کہ بائیں ہاتھ سے اس نے لمبی گھاس کو دبوچ رکھا تھا۔ اس کے شکستہ لباس کی حالت صاف بتا رہی تھی کہ مرنے سے پہلے اس بوڑھے نواب اور قاتل کے درمیان شدید کشمکش ہوئی تھی مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس حالت میں بھی اس کا ہیٹ ابھی تک اس کے سر پر موجود تھا۔ لاش کے گرد بھورے رنگ کے کاغذ کے کافی سارے ٹکڑے

بکھرے ہوئے تھے۔

میں گھٹنوں کے بل جھکا اور جائزہ لینے لگا۔ ایسٹ جیبی ٹارچ سے اس پر روشنی ڈال رہا تھا۔

''کچھ ملا۔۔۔؟'' ایسٹ پوچھنے لگا۔

''بظاہر اس کے سر پر کسی بھاری چیز سے وار کیا گیا ہے۔'' میں دھیرے سے بولا۔''.....اور اس کے ہیٹ نے سے اسے بچالیا پھر اس نے مزاحمت شروع کی مگر آخر کار قاتل جیت گیا۔ نواب مر گیا۔ اس کا گلا بری طرح دبایا گیا ہے۔''

ایسٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں لاش کے اردگرد عجیب سے نشانات تھے جو جھاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ ایسٹ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں بھی غور سے اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ وہ جگہ جہاں سر جیفری گرا ہوا تھا وہاں ہلکے قدموں کے نشانات واضح تھے۔ آس پاس بے شمار گڈمڈ نشانات تھے مگر پہچانے جا سکتے تھے کہ وہ جھاڑیوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے ایک جگہ اشارہ کیا۔

''یہ نشانات دیکھو۔۔۔ جیسے کسی بچے کے ہوں۔''

''دوبارہ دیکھو۔۔۔'' ایسٹ بڑبڑایا۔

میں ان نشانات پر جھک گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ واضح طور پر دو ننھے ننھے پیروں کے نشانات نظر آئے اور اٹھارہ سے بیس قدم دور دو ننھے ننھے ہاتھوں کے نشانات۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ رگوں میں خون منجمد ہوتا محسوس ہو۔ صاف محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی برہنہ پا شیر خوار رینگتا ہوا ان جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔

میں نے دوبارہ لاش کا جائزہ لیا۔ اس کے بے ترتیب لباس اور اس کے بے رنگ چہرے کو دیکھا۔

''یہ پھٹے ہوئے بھورے کاغذ کیسے ہیں؟'' ایسٹ نے سوال کیا۔

''اوہ میرے خدا۔۔۔۔۔'' میں ایک دم چلا اٹھا۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔

''کیا ہوا؟۔۔۔۔'' ایسٹ نے بے تابی سے پوچھا۔

''وہ مٹی کا بندر کہاں ہے۔ جو سر جیفری اپنے ساتھ لائے تھے۔ قدموں کے نشانات لاش سے دور جانے کے تو ہیں مگر لاش تک آنے کے نہیں ہیں۔''

☆.....☆.....☆

ایسٹ کا پولیس میں بہت اثر رسوخ تھا۔ اس کی درخواست پر مقامی پولیس اسٹیشن نے ناگزیر رسمی کارروائی کے علاوہ کوئی کوئی قدم نہ اٹھایا۔ ایسٹ نے مسٹر جیفری کی بیٹی مس ایلس سے ایک طویل انٹرویو لیا اور پھر مجھے وہیں چھوڑ کر خود لندن روانہ ہو گیا۔ اس سفر کی کوئی خاص وجہ اسے نے بتانا مناسب نہ سمجھا۔

نواب جیفری کی اس عجیب موت نے میری پوری توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی۔ میرا دماغ قدموں کے ان نشانات میں الجھا ہوا تھا جو ہم نے لاش سے دور جھاڑیوں میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ نشانات کسی بچے کے نہیں بلکہ ایک بندر کے پاؤں کے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں لاش پڑی ہوئی ملی تھی وہاں تک صرف مقتول کے اپنے ہی قدموں کے نشانات آ رہے تھے کسی دوسرے شخص کے قدموں کا کوئی نشان نہ تھا۔

مقتول کے قدموں کے علاوہ اگر کوئی نشانات نظر آ رہے تھے تو وہ ان ننھے ننھے پاؤں کے نشانات تھے جن کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ اسی مٹی کے بنے نیلے بندر کے تھے مگر وہ بھی لاش تک جا نہیں رہے تھے بلکہ لاش کی طرف سے آ رہے تھے۔ یہ اس بندر کے نشانات تھے جس کو نواب جیفری نے سیر پر جاتے ہوئے اپنے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا مگر اب وہ بندر غائب تھا اور نواب قتل ہو چکا تھا۔

مجھے خود ہی اپنی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا۔ میں اپنے آپ کو پاگل سمجھنے لگا۔ کیا میں سچ مچ یہ سمجھ رہا تھا کہ مٹی کا وہ نیلا بندر زندہ ہو گیا تھا مگر یہ حقیقت تھی کیونکہ جب تک مجھے وہاں کسی اور کے قدموں نشانات نہیں مل

بات تو منطقی طور پر یہ فرض کرسکتا تھا کہ مٹی سے بنا وہ نیلا بندر ہی سر جیفری کا قاتل ہے۔

پتہ نہیں ایسٹ میرے اس مفروضے پر یقین کرتا تھا یا نہیں مگر مجھے خود ہی کوئی سراغ تلاش کرنا تھا اس لیے اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے سر جیفری کی بیٹی ایلس سے ایک دفعہ ملنا چاہیے تا کہ اس کا حال احوال دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ معلوم ہو سکے کہ کوئی نئی پیش رفت ہوئی ہے یا نہیں۔

موسم خاصا سرد تھا اور تیز دھوپ کے باوجود کپکپی محسوس ہو رہی تھی۔ سر جیفری کے گھر پہنچنے کے لیے مجھے اس سیاہ غار کے قریب سے گزرنا تھا سر جیفری قتل ہوا تھا۔ میں اس جگہ رکا جہاں مقتول کی لاش ملی تھی۔ رات کو ہونے والی بارش نے سارے نشانات مٹا دیے تھے۔ سر جیفری کے وسیع وعریض گھر میں جسے حویلی کہنا زیادہ مناسب تھا گہرا سوگ اور سکوت چھایا ہوا تھا۔ یہ تو ہونا ہی تھا آخر اس گھر کا مالک زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ مجھے ایک شاندار پرانی لائبریری میں بٹھایا گیا۔ جب سر جیفری کا سیکرٹری ڈیموپولن وہاں آیا تو وہ سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس محسوس تھا اور اداسی کی مکمل تصویر بنا ہوا تھا۔

وہ ایک وجیہہ اور دل کش آدمی تھا مگر اب ایک نظر دیکھنے پر اندازہ ہو رہا تھا کہ نواب جیفری کی موت نے اسے کس قدر توڑ دیا تھا۔ میں نے تعزیت کے چند الفاظ ادا کرنے کے بعد فوراً ہی گفتگو کا رخ مس ایلس کی طرف موڑ دیا۔

''وہ تو لندن چلی گئی ہے۔'' اس نے مجھے بتا کر اضافہ کر دیا۔ ''ایک تو اس کی حالت درست نہیں تھی اور اسے آرام کی سخت ضرورت تھی۔ دوسرے سر جیفری کی وصیت سے متعلق بات کرنے کے لیے وکیل سے ملنا ضروری تھا۔'' اس نے وضاحت کی۔

''اس بے چاری لڑکی نے یہ غم بڑی ہمت سے ... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس سفر کے قابل ...'' میں نے متفکر انداز میں پوچھا۔

''میں خود اسے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے گیا تھا۔ اس کے علاوہ مقتول نواب سر جیفری کی بہن مسز گریرسن بھی اس کے ساتھ لندن گئی ہیں۔'' ڈیموپولن مطمئن انداز میں بولا۔

''ویسے۔۔۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کیا مسٹر جیفری اپنی موت کے وقت اپنے ساتھ کوئی ڈبہ اٹھائے ہوئے تھے۔'' میں نے پوچھا۔

''ان کے ہاتھ میں معمول کے مطابق ایک آبنوسی چھڑی تھی لیکن گھر سے نکلتے وقت انہوں نے نہ جانے کیوں اس نیلے بندر والا مجسمہ اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

''مسٹر ڈیموپولن!...... اس بندر کے مجسمے کی کیا تفصیل ہے؟'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

وہ بندر درحقیقت ایک آرائشی مجسمہ تھا ڈاکٹر!...... اس کا قد ایک حقیقی بندر جتنا تھا اور وزن یہی کوئی چھ یا سات پونڈ ہوگا۔''

''کیا یہ کسی پیڈسٹل پر رکھا تھا؟''

''نہیں .... وہ ایک مکمل نمونہ تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں کے تلوے اور ناخن تک بنے ہوئے تھے۔''

''غیر معمولی..........'' میں بڑبڑایا۔

اس کے بعد میں مزید تھوڑی دیر وہاں رکا پھر اجازت چاہی۔ اپنے کیبن پہنچ کر میں نے شام کا دھندلکا اترنے کا انتظار کیا۔ میں اعتراف کروں گا کہ مجھے کسی غیر معمولی اور مافوق الفطرت واقعے کا یقین ہو چلا تھا۔ میری یہی سوچ مجھے دوبارہ اس غار کے راستے پر لے گئی جہاں یہ پراسرار واقعہ ہوا تھا۔ مجھے وہاں کوئی سراغ ملنے کی قوی امید تھی۔ میں رات کا اندھیرا اترنے سے پہلے آسانی سے اپنے کیبن میں لوٹ سکتا تھا۔

میں اپنی آوارہ گرد زندگی میں ایسے بہت سے مقامات سے گزرا ہوں اور ایسے واقعات سے پالا پڑا ہے جن کو اگر بیان کروں تو انہیں انسانی عقل تسلیم کرنے کو قطعاً تیار نہ ہوگی مگر یہ ایک ایسا لمحہ تھا جو میرے ذہن باقی زندگی کے لیے نقش ہو کر رہ گیا۔ میں جب جھاڑیوں

کے قریب آیا اور ان کے اندر جھانکا تو ایک خوف ناک شکل کو اپنی طرف گھورتے پایا۔ میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی اور قدم اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔

''ڈر گئے کیا۔۔۔۔۔۔؟'' وہ خوف ناک شکل بولی تو میں ایک لمحے میں پہچان گیا۔

یہ ایسٹ تھا۔

اس کی آواز سن کر میرا سارا خوف عجیب تحیّر میں بدل گیا۔

''کیا میں نے تمہیں ڈرا دیا تھا؟'' وہ ایک پوٹلی سی تھامے جھاڑیوں سے باہر نکلا اور پوچھنے لگا۔

''کیا یہ پوچھنا لازمی ہے.....؟'' میں تقریباً چیخ اٹھا۔''.....تم یہاں اس غار کے پاس جھاڑیوں میں کیا کر رہے تھے؟''

''مچھلی پکڑ رہا تھا..... دیکھو میرے کانٹے میں کیا آیا ہے۔'' تمسخرانہ انداز میں بولتے ہوئے اس نے وہ پوٹلی اوپر اٹھا کر مجھے دکھائی جو وہ پکڑے ہوئے تھا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ..... مٹی کا بنا ایک نیلے رنگ کا بڑا سا بندر تھا۔

''آؤ میرے ساتھ میں سر جیفری کے گھر جا رہا ہوں۔'' اس نے سرگوشی کی۔

☆.....☆.....☆

ایک دفعہ پھر میں سر جیفری کی شاندار حویلی کی اس پرانی شاندار لائبریری میں بیٹھا تھا۔ میرے بالکل سامنے بڑے سے آبنوسی میز کے دوسرے سرے پر ایسٹ بیٹھا ہوا تھا۔ دائیں طرف میز کے بالکل درمیان ایک کرسی پر ڈیمو پولن براجمان تھا۔

ایسٹ بولا۔''مسٹر ڈیمو پولن!..... میں جانتا تھا مسٹر جیفری جب سیر کے لیے نکلے تو وہ یہ چیز اٹھائے ہوئے تھے۔ اس نے اس نیلے بندر کی طرف اشارہ کیا جو میز کے درمیان رکھا ہوا تھا۔''سر جیفری کی موت کے وقت یہ پراسرار طریقے سے غائب ہو گیا تھا۔ پہلے میں نے اندازہ لگایا کہ یہی قتل کا محرک ہے۔ اس وقت سر جیفری کے پاس رقم اور دوسری قیمتی اشیاء موجود تھیں تاہم کوئی چیز چوری نہیں ہوئی۔

اپنے اس مفروضے پر میں نے اس نیلے بندر کے مجسمے پر تحقیق کی تو مجھے علم ہوا کہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں ہے۔ یہ بالکل بے قیمت ہے اور جدید چینی فن کا شاہکار ہے۔ یہ سر جیفری کو پسند آ گیا اور انہوں نے اسے خرید لیا۔

اس کے بعد میں نے قتل کے دوسرے محرکات کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ لاش کے آس پاس ملنے والے قدموں کے نشانات نے ہمیں چکرا کر رکھ دیا تھا۔ یہ قدموں کے نشانات کسی انسان کے نہیں بلکہ اس بندر کے تھے اس نیلے عفریت کے جو اس وقت آپ کے سامنے میز کے اوپر پڑا ہے۔

''ناممکن.....'' ڈیمو پولن بے یقینی کے عالم میں بڑبڑایا۔

ایسٹ پھر کہنے لگا۔''یہ سب میں نے اس وقت فرض کیا تھا جب میں نے بندر کا یہ مجسمہ دیکھا نہیں تھا۔ درحقیقت یہ نشانات کسی زندہ جسم سے نہیں بلکہ ایک بے جان چیز سے بنائے گئے تھے۔ جس کس نرم مٹی میں وقفے وقفے سے دبایا گیا تھا اگرچہ وہاں سوائے سر جیفری کے سوا کسی اور کے قدموں کے نشانات موجود نہ تھے۔ میں نے ان نشانات کا بغور معائنہ کیا تو یہ ظاہر ہوا کہ کوئی بہت ہشیاری سے سر جیفری کا تعاقب کرتا ہوا آ رہا تھا اور وہ بہت احتیاط سے سر جیفری کے قدموں کے نشانات پر اس طرح قدم رکھتا آ رہا تھا کہ اس کے اپنے قدموں کے نشانات ظاہر نہ ہوں۔

اس نے کسی وزنی چیز سے سر جیفری کے سر پر حملہ کیا مگر کاری ضرب لگانے میں ناکام رہا۔ اس کے نتیجے میں قاتل اور مقتول میں جدوجہد شروع ہو گئی، دونوں گتھم گتھا ہو گئے اور سارے نشانات گڈمڈ ہو گئے۔ قاتل مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس نے اپنا ایک بھی قدم نرم مٹی پر نہ رکھا نہ کوئی ایسا نشان چھوڑا کہ پہچانا جائے۔ اس نے کوئی سراغ اپنے پیچھے نہ چھوڑا۔

ڈیمو پولن جو ایسٹ کا ہر لفظ پوری توجہ سے سن رہا

تھا ایک دم بول اٹھا۔ ''تب..... وہ جائے وقوعہ سے واپس کیسے گیا.....؟''

''میں نے اس کو کاغذ کے ان پھٹے ہوئے پرزوں کی مدد سے تلاش کیا جس میں اس نیلے بندر کو لپیٹا گیا تھا مگر کوئی رسی نہیں ملی۔ میں لندن جاتے ہوئے سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ اگر پارسل اس کے ساتھ باندھا گیا تھا تو وہ کہاں گئی اور سر جیفری کے پاس چھڑی تھی وہ کہاں ہے؟۔'' ایسٹ بولا۔

ڈیمو پولن طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔'' یقیناً میں تمہیں سفر اور اس سوچ بچار سے بچا سکتا تھا اگر میں معقول نواب کے ساتھ ہوتا تو۔''

''یقیناً ایسا ہی ہوتا مگر میرے اس سفر کی ایک اور وجہ بھی تھی۔'' ایسٹ کے چہرے پر بھی ویسی ہی مسکراہٹ تھی۔

وہ چند لمحے ڈیمو پولن کے چہرے کو خاموشی سے تکتا رہا پھر دوبارہ آہستگی سے گویا ہوا۔''اس راستے پر قدموں کے جو نشانات ملے تھے غور سے دیکھنے پر انکشاف ہوا کہ بندر کے نشانات کے عین دونوں جانب ایک ترتیب سے کسی لکڑی سے بنے سوراخوں کے نشانات بھی تھے۔ کیا آپ میری بات سمجھ پا رہے ہیں مسٹر ڈیمو پولن!۔''

''یقیناً .....'' ڈیمو پولن نے کرسی کی پشت سے اپنا جسم ٹکایا اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''لکڑی کے سوراخوں کے نشانات سے تمہارا کیا مطلب ہے.....؟''

''یہی وہ سراغ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں سمجھ گیا کہ چالاک قاتل نے اس چینی بندر کو اپنے پاؤں کے نیچے باندھ کر ایک جوتے کی طرح استعمال کیا اور نرم زمین پر اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر جھاڑیوں تک پہنچ گیا۔

''لیکن ایسٹ میں تمہاری بات سمجھ نہیں پایا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔'' کیا تم کہنا چاہتے ہو اس نے اپنا قدم لاش کے پاس سے اس بندر کے مجسمے پر

دلچسپ کہانیوں کا رسالہ

ماہنامہ

بچوں کا میگزین

کراچی

اکتوبر کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

98 صفحات | قیمت -/30 روپے

ہر شمارہ خاص

جس میں اسلامی، ادبی، سائنسی اور مختلف موضوعات پر بے شمار معلومات، اس کے علاوہ سلسلے وار کہانیاں، لطیفے، اقوال اور حیران کن واقعات، نظمیں اور مزید ذہنی نشوونما کے لئے تحریریں ہیں۔

پیارے بچو! آپ ہمیں اچھی اور بہترین معلومات، لطیفے، کہانیاں اور سبق آموز واقعات لکھ کر بھیجیں۔ آپ کی ارسال کردیں تحریریں ہم ''بچوں کے میگزین'' میں شائع کریں گے۔

اس کے علاوہ آپ اپنی کہانیاں بذریعہ ای میل بھی بھیج سکتے ہیں۔ ہمارا ای میل ایڈریس ہے:

bachonkamagazine#gmail.com

خط و کتابت کا پتہ:

گوالی لائن نمبر 3، نورانی آرکیڈ

نیو اردو بازار کراچی

Mob:0324-7232580

آفس ٹائم: صبح 10 سے شام 6 تک

رکھا جسے اس نے ایک مناسب فاصلے پر رکھا تھا۔"

"ہاں....." ایسٹ پھر بتانے لگا۔ "اس مجسمے کو اس نے رسی کی مدد سے اپنے پاؤں کے نیچے باندھ لیا اور اپنے پاؤں کی مدد سے اٹھا کر اسے آگے رکھ دیتا۔۔۔۔۔"

"مگر کیسے۔۔۔۔؟"

"وہ اپنے وزن کو دو چھڑیوں کی مدد سے سہارا دیتا۔ ایک سر جیفری کی اور ایک اس کی اپنی۔ ان کے نشانات دونوں طرف بنتے تھے۔ وہ قاتل درحقیقت سخت زمین تک پہنچنا چاہتا تھا..... پھر اس نے ایک مہلک غلطی کی۔"

"کیسی غلطی.....؟" ڈیمو پولن اور میں نے ایک ساتھ حیرت سے پوچھا۔

"زیادہ وزن کی وجہ سے سر جیفری کی چھڑی نیچے سے ٹوٹ گئی اور چھڑی کے آخر پر لگا دھاتی ٹکڑا مٹی میں دھنسا رہ گیا۔"

ایسٹ نے میز پر ٹوٹی ہوئی چھڑی کا ایک ٹکڑا رکھا جو بید کی تھی اور یہ ٹکڑا دھاتی ٹکڑے سے کچھ تین انچ اوپر سے ٹوٹا ہوا تھا۔

"یہ رہا چھڑی کا وہ ٹکڑا..... آبنوس کی لکڑی میں لچک بہت ہوتی ہے ..... ہے نا..... مسٹر ڈیمو پولن!....." وہ بولا۔

"بے شک....." ڈیمو پولن اپنی جگہ پر اٹھ کھڑا ہوا جیسے اب وہ اس بات کو ختم کرنے کا خواہش مند ہو۔

"کارٹر!..... " ایسٹ اونچی آواز میں چلایا۔

لائبریری کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نیو سکاٹ لینڈ پولیس کا سراغ رساں سارجنٹ کارٹر اندر داخل ہوا۔

ڈیمو پولن کے ہاتھ سے ایک دم اس کا سگریٹ نیچے گر گیا جسے اس نے سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا۔

ایسٹ دوبارہ کہنے لگا۔ "کارٹر اور میں اس سہ پہر اس سیاہ غار پر گئے جہاں میرے اندازے کے مطابق مجرم نے ٹوٹی ہوئی چھڑی کا ٹکڑا اور یہ بندر کا مجسمہ چھپایا تھا۔ اس نے دونوں کو اکٹھا رسی کی مدد سے باندھا اور غار کے اندر پھینک دیا۔ خوش قسمتی سے یہ جھاڑیوں کے اندر پھنس گئے اور ہمیں ان کو نکالنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ ہاں تو..... مسٹر ڈیمو پولن اب تم خود بتاؤ گے تم نے کیا چیز مسٹر جیفری کو قتل کرنے کے لیے اس کے سر پر ماری تھی؟"

ایسٹ کی بات سنتے ہی میں وحشت کے عالم میں میز کا کونا تھامتے ہوئے تیزی سے اٹھا۔ مجرم کو پہچان کر میں حیران تھا۔ جس کو میں اپنا دوست کہتا تھا۔ وہ جو مقتول کے بے حد قریب تھا اس نے۔۔۔۔۔۔۔"

ڈیمو پولن نے اپنے کندھے اچکائے۔ اب اس کے چہرے پر مردنی تھی۔ اس نے مشینی آواز و انداز میں بولنا شروع کیا۔

"میں نے اس کے سر پر درخت کی ایک ٹوٹی شاخ سے وار کیا مگر اس کا ہیٹ اس کو بچا گیا پھر میں نے سارا کام اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا۔ میں بے حد مایوس و وحشت میں تھا۔ شاید تم یہ بھی جان چکے ہو کہ سر جیفری کی بیٹی ایلس اور میں خفیہ شادی کر چکے تھے۔ میں تمہیں اس کی وجوہات بتا کر بور نہیں کروں گا۔ مجھے اس کے باپ کی دولت کی ضرورت تھی جسے وہ اپنے باپ کی وراثت سے حاصل کر سکتی تھی..... مگر اب سب ختم ہو گیا میں ہار گیا اور۔۔۔۔۔"

"کارٹر!۔۔۔۔۔" صورت حال کو بھانپ کر ایسٹ چلایا۔ "جلدی۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔"

سراغ رساں کارٹر جو ڈیمو پولن کے قریب ہی کھڑا تھا چیتے کی سی پھرتی سے اچھلا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک فائر کی آواز گونجی اور ایک دھماکے سے ڈیمو پولن لائبریری کی میز پر گر پڑا۔ جھٹکا لگنے سے وہ نیلا بندر میز کی چکنی سطح سے زمین پر گرا اور چکنا چور ہو گیا۔

مہلک مرض

احسان الحق

سب پروپیگنڈہ پر مبنی جھوٹی خبریں تھیں جبکہ حقائق کہیں اس سے زیادہ خوفناک تھے، سچ تو یہ تھا کہ جسے یہ مرض ایک مرتبہ لگ جاتا تو اسے کسی پل سکون نہ ملتا لیکن......

ایک عجیب وغریب حقیقی واقعہ جو کہ پڑھنے والوں کو حیرت کے سمندر میں ڈال دے گا

وائرلیس پر وہ تنہا ایک کھلے میدان میں [illegible]شاپات کرر ہا تھا۔ میدان خالی تھا۔

''اگر کوئی میرا یہ پیغام سن رہا ہے تو برائے کرم [illegible] ے۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ دوسری جانب سے [illegible] جواب نہ ملنے پر اس نے وہی الفاظ دوبارہ [illegible]

[illegible] اصل ایک اور وائرلیس کا سیٹ (ریسیور) اس کے دوست فاروقی کے پاس تھا۔ لیکن اب فاروقی دنیا میں موجود نہیں تھا۔ کیونکہ مہلک بیماری نے اس کی بھی جان لے لی تھی۔

یہ جوشی تھا۔ اس کا اصل نام جوش خان اور عمر 36 سال تھی وہ پیشہ ملازمت حکومتی اہل کار برائے تحفظ مہلک مرض کا ملازم تھا۔ دونوں دوست اس ٹیم کا حصہ تھے جنہیں یہ کام سونپا گیا تھا کہ اپنے علاقے میں جان لیوا

مرض کے مریضوں کا پتا لگائیں اور فوری محکمے کو خبر دیں۔ یہ مرض علاقے کی 90فی صد آبادی کو چاٹ گیا تھا۔ قبرستان کے قبرستان آباد ہو رہے تھے اور لاتعداد انسان لقمہ اجل بنتے جا رہے تھے۔ حکومت کو خطرے کا احساس شروع ہی میں ہو گیا تھا۔ مگر وہ وقت گزارتے رہے اور جوں جوں وقت گزرتا گیا، مرض بے لگام ہوتا گیا۔

سونے پہ سہاگا یہ کہ اس مرض نے عالمگیر سطح پر اپنی تباہ کاریاں دکھائیں۔ آغاز میں یہ مرض جوشی اور فاروقی کے ملک میں نہیں آیا تھا۔ یہ تو تب ان کے ملک پر آفت بن کر آیا جب نزدیکی ہمسایہ ملک سے زائرین کی وطن واپسی ہوئی۔ اس بات کو بھی کئی سال گزرے تھے۔ اس وقت اگر سنجیدگی سے حکومت کی جانب سے ایکشن پلان تیار ہو جاتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی جسے آج جوشی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

مرض کیا تھا۔ ایک لعنت تھی۔ انسان دوسرے انسانوں سے خوف زدہ تھا۔ شروع شروع میں یہ خبریں عام تھیں کہ یہ صرف بوڑھوں اور بچوں کی جان کا دشمن ہے کیونکہ ان میں قوت مدافعت کم ہوتی ہے۔ مگر بعد کے دنوں نے یہ بات بھی غلط ثابت کر ڈالی تھی۔ یہ تو انسانیت کا دشمن تھا۔ کیا مرد، کیا عورت، کیا بوڑھا، کیا جوان اور بچہ؟

''اگر کوئی میرا یہ پیغام سن رہا ہے تو برائے کرم مجھے جواب دے۔''

جوشی نے دوبارہ اپنے کورڈلیس سے اپنا پیغام سنایا۔ دوسری جانب سے کسی کا جواب وصول نہیں ہوا۔ اس نے ناامید ہو کر وائرلیس سیٹ کو اپنی بغلی جیب میں اڑس لیا۔ منہ بسورتا ہوا وہ سرسبز میدان کی زمین سے اٹھا اور دائیں بائیں یوں نظر دوڑاتا ہوا گویا کچھ تلاش کر رہا ہو۔ ایک سمت بڑھ گیا۔ اس کی منزل پاس کھڑی اس کی جیپ تھی۔

''سمجھ میں نہیں آتا، فاروقی آخری بار کہاں پر تھا؟ اگر معلوم ہو جائے تو اس کا سیٹ کم از کم ہاتھ لگ جائے۔'' وہ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے جیپ پر سوار ہوا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کی منزل نزدیکی قبرستان تھی۔ وہ قبرستان جو چند سو قبروں پر مشتمل تھا لیکن اب وہاں ہزاروں کی تعداد میں قبریں ہی قبریں تھیں اور ان قبروں کی حفاظت کرنے والے محض دو جوان اور ایک بوڑھا تھا جوان جوانوں کا باپ تھا۔

قبرستان پہنچ کر جوشی نے رحم دین بابا کو دور سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک پہاڑی ٹیلے پر بیٹھا گہری سوچوں میں ڈوبا دکھائی دیا۔ جیپ اس کے بیس فٹ دور روک کر جوشی نے اسے اشارے سے سلام کیا۔

''بابا رحم دین۔'' اس کی موجودگی پر پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے ٹیلے پر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بابا! کیسے ہیں؟'' جوشی نے دریافت کیا۔

''میں تو ٹھیک ہوں بیٹا لیکن کل ایک آدمی کھانستا ہوا گرتا پڑتا یہاں آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا وہ یکدم زمین پر گرا اور وہیں اس نے دم توڑ دیا۔''

جوشی یہ سن کر غمزدہ ہو گیا۔ بابا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے جوشی کو بتا رہا تھا۔

''ہم نے اپنا موٹا سا لباس پہنا اور اسے فوری دفن کر دیا۔''

''آپ کے دونوں جوان دکھائی نہیں دے رہے؟''

''وہ دونوں اس وقت مزید قبریں کھودنے کی غرض سے دو کلومیٹر دور کام کر رہے ہوں گے۔''

جوشی اس پر کیا کہتا۔ وہ خود اس تازہ خبر پر مغموم تھا۔

''آبادی میں سے کوئی حکومتی اہلکار آیا تھا۔ بابا؟''

''نہیں بیٹا! صرف تم آئے ہو۔ اور تو کسی کی خبر نہیں پتہ نہیں زندہ بھی ہیں یا۔''

جوشی سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ حکومتی اہلکار یا تو رہے نہیں اور یا پھر اپنے اپنے گھروں تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اس مرض نے سب کو خوفزدہ کر دیا تھا کیونکہ یہ لاعلاج مرض تھا۔ دنیا کی تمام حکومتوں کے دعوے جھوٹے تھے۔

آج اتنے مریض صحت یاب ہو کر گھر چلے گئے تو کل اتنے مریض اس مرض کی تباہ کاریوں میں اضافے کی بجائے کمی ہونے لگی۔ اس مرض میں مرنے والوں کی شرح صرف 1 یا 2 فی صد ہے۔ وغیرہ..... وغیرہ.....

سب پروپیگنڈہ پر مبنی جھوٹی خبریں تھیں جبکہ حقائق، اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھے۔ سچ تو یہ تھا کہ جسے یہ مرض ایک مرتبہ لگ جاتا تو اسے کسی پل سکون نہ ملتا، اسے تو سکون صرف قبر میں اتر کر ہی ملنا تھا سو کافی لوگ اب اس قبرستان میں دب کر ''پرسکون'' ہو چکے تھے۔ جوشی اکثر سوچتا۔

''کیا واقعی سکون صرف قبر میں ملتا ہے؟''

جوشی نے جیپ کو اسٹارٹ کیا اور حسب معمول اسے قصبائی آبادی کی جانب موڑ لیا۔ قصبے میں پہنچ کر اس نے سائے تلے جیپ روک لی۔ وہ جیپ سے اترا اپنے منہ پر بھاری بھرکم ماسک کو درست کرتے ہوئے۔ قصبے کی چھوٹی عمارتوں پر نظریں دوڑاتا ہوا اب وہ پیدل ہو لیا۔ ابھی اس نے پچاس قدم ہی لیے تھے کہ سامنے سے ایک خاتون اس کی جانب چلی آتی اسے دکھائی دی۔ وہ تیز تیز چلتی اس سے پندرہ قدموں کے فاصلے پر رک گئی۔

''بھیا کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟''

''کیسی مدد بی بی؟''

''میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ کھانستا جا رہا ہے۔'' وہ انتہائی تکلیف کے عالم میں بولی۔

''اُس کی عمر کیا ہے؟'' جوشی نے جیب سے نوٹ بک نکال کر قلم سے کچھ لکھنا شروع کر دیا۔

''بھیا! کیا تم ڈاکٹر ہو؟'' وہ پر امید لہجے میں بول رہی تھی جوشی نے کچھ سوچا اور پھر یکدم جواب دیا۔ ''ہاں'' اس سے آگے وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس عورت کو اگر وہ بتا دیتا کہ وہ ڈاکٹر نہیں ہے تو وہ اسے اپنے گھر تک نہ لے جاتی بلکہ آگے کہیں بھاگتی چلی جاتی۔

''خدایا تیرا شکر! تو قدم قدم پر مددگار ہے۔'' وہ قدرے روتی آواز میں چہرے پر ہاتھ پھیرتی بولی۔

''بی بی! بچے کی عمر کیا ہے؟''

''وہ تیرہ سال کا ہے بھیا۔'' جوشی نے موزی نوٹ بک میں درج کیا۔

''کھانسی کب سے ہے؟''

''صبح سے!''

''کیا بار بار کھانس رہا ہے!''

''ہاں، ایک گھنٹے سے بار بار کھانس رہا ہے۔''

''اوہ..... اور ایک گھنٹہ پہلے؟''

''کبھی کبھی تھوڑے وقفے سے آ جاتی تھی۔''

''ناک تو نہیں بہتی؟''

''نہیں، لیکن سینے میں درد ہے۔''

جوشی ماسک کے عقب سے زیر لب مسکرایا۔

''فکر کی بات نہیں، بی بی، کہاں ہیں گھر آپ کا؟''

''یہ آگے تیسری گلی سے چھٹا گھر داہنے ہاتھ پر۔ بھیا! جلدی چلو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اپنی جیپ لایا۔'' وہ بڑھنے لگا تو عورت نے چلا کر کہا۔

''مگر بھیا! تمہاری جیپ کہاں ہے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''فکر کی بات نہیں بی بی، وہ سامنے ہے اسی میں دوا رکھی ہے۔ مجھے جیپ میں آنے دو اور خود واپس اپنے گھر چلی جاؤ۔'' یہ کہہ کر جوشی، واپسی کے لئے اپنی جیپ کی سمت مڑ گیا۔

☆.....☆.....☆

کمرے میں ایک لکڑی کی چارپائی تھی۔ صاف ستھری چادر پر ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا کھانس رہا تھا۔ جوشی نے اسے بیگ کھول کر کھانسی کا شربت پلایا۔ اور پھر بیگ سے تین پتے ادویات کے دیئے۔ ایک کاغذ پر کچھ ہدایات لکھ کر خاتون کو سمجھائیں۔ بچے کو زیادہ بخار نہیں تھا۔ جوشی نے اسے ایک مشین کے ذریعے بھاپ بھی دلوائی۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ مہلک مرض

نہیں ہے۔ گھر سے بچے کو باہر نہ جانے دیں۔ گرم پانی کی بھاپ ضرور دیں۔ یہ جو باہر شہتوت کا درخت ہے۔ یہ الرجی اسی شہتوت کے درخت سے ہوئی ہے۔ اسے پولن الرجی کہتے ہیں۔ بہار کے موسم میں مارچ سے اپریل تک رہتی ہے۔''

''لیکن بھیا! یہ تو پہلی مرتبہ اسے ہوا ہے۔ پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔''

''یہ ہر سال نئے مریضوں کو ہو جاتا ہے۔ بس کچھ غفلت حکومتوں کی اور کچھ ہماری ہے، بہن ورنہ اگر ان جنگلی شہتوتوں کو آبادی سے ختم کر کے یہاں دوسرے پھل دار درخت لگائے جاتے تو ہماری قوم ایسی نہیں کہ فوراً بیمار ہو جائے۔ بس! اب صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔''

''اس کا باپ پچھلے سال فوت ہو گیا تھا۔ صرف کھانس کھانس کر پھیپھڑے برباد ہو گئے۔ نہ کوئی ڈاکٹر نہ کوئی ہسپتال۔ دوائی میں صرف کھانسی کا شربت پلاتی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئی۔ جوشی نے اپنا سامان باندھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بچے کو مہلک مرض نہیں تھا۔

''بھیا پانی تو پیتے جاؤ!'' عقب سے خاتون کی آواز آئی۔

''نہیں..... شکریہ..... مجھے آگے جانا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اس خاتون کے گھر سے دوبارہ اپنی جیپ کی طرف آیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ آگے کی گلی سے مڑا ہی تھا کہ سامنے نگاہیں پڑتے ہی اس کی سٹی گم ہو گئی۔

سامنے سے قریباً پانچ سو کے قریب بوڑھے، بچے جوان، عورتیں اس کی جیپ کی جانب بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ سب بغیر ماسک کے تھے اور متواتر کھانس رہے تھے۔ اکثر کی حالت اتنی غیر ہوئی جاتی تھی کہ ان سے ٹھیک سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا۔ پھر سامنے سے ایک بچہ لڑکھڑا کر گرا اور پورا مجمع جو اس کے پیچھے تھا، اسے کچلتا ہوا جوشی کی جانب بڑھنے لگا، اس دھکم پیل میں کتنے ہی بوڑھے، بچے، جوان اور عورتیں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے ایک کے بعد ایک دوسرے پر گرتے چلے گئے۔ بہت سے تو جوشی سے پچیس قدم کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ جوشی کی جیپ اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ بالآخر اس نے بھاگنے کی ٹھان لی۔ جیپ وہ بعد میں آ کر بھی لے سکتا تھا۔

لیکن اب دیر ہو چکی تھی، اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس ہجوم نے جوشی کو آ لیا تھا۔ اس کے ماسک کو بھی کھینچ ڈالا تھا۔ اور ایک نہایت ہی بوڑھے داغ دار چہرے والے شخص نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھانستے ہوئے کہا۔

''بچالو! مجھے!''

جوشی کا سانس گھٹتا چلا گیا اور پھر.....

☆.....☆.....☆

جوشی ہڑبڑاتے ہوئے نیند سے جاگا۔ اُس کے ماتھے پر بے تحاشہ پسینہ تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا سیل فون بجے چلا جا رہا تھا۔ اس کا حلق خشک ہوا جاتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون اٹھایا۔

''جی؟'' بس وہ اتنا ہی بمشکل کہہ سکا تھا۔

دوسری جانب سے اس کا دوست فاروقی تھا۔

''جاگو جاگو گڑیا رانی..... جاگو جاگو ہوا سویرا!''

فاروقی کی مترنم آواز سنائی دی۔

''ہاں! میں آتا ہوں دفتر۔'' جوشی حواس بحال کرتے ہوئے بولا۔

''آجا میرے شیر! زیادہ سونا صحت کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔'' اور پھر یہ کہہ کر فاروقی نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا۔ جوشی بستر سے اٹھا۔ اُسے محض ایک سوچ لاحق تھی۔

''شکر ہے یہ ایک خواب تھا۔ ذمہ داران کو چاہئے کہ فوراً مضبوط لائحہ عمل تیار کر لیں۔ ورنہ خدا قسم! مہلک مرض کسی کا دوست نہیں ہوتا۔''

تتلی

سنبل وسیم سیالوی۔ پنڈ دادنخان

آواز گونجی۔ اے اللہ تو سب سے بڑا انصاف کرنے والا ھے حق و باطل میں فرق کرنے والا ھے۔ نہایت مہربان اور کریم ھے اے اللہ تو میری فریاد سن اور حق کا سر بلند کردے تاکہ......

خراماں خراماں......دل ودماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی......سبق آموز......کہانی

"دا کتنی سندر لگ ری میں۔ رج کے حسن بھی ما [illegible] ی نوں دے۔" تتلی نے اپنے آپ کو چھوٹے ا [illegible] ئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تتلی کہاں مرگئی۔"

"آئی اماں۔" اماں کی آواز پر تتلی نے چھوٹا سا آ [illegible] نہ کے نیچے چھپایا اور اپنے گلے سے سفید موتوں کا [illegible] صندوق میں رکھا۔

"چھمو کا نام نکل آیا قرعہ اندازی میں۔ چھمو کی شادی واسطے امیر لوگ پیسے دینے آرے آج شام کو۔ جا کم بخت ماری تو بھی چلی جا کیا پتہ تجھے دیکھ کے تیرے پہ رحم آجائے انہیں اور تجھے بھی پیسے دے دیں۔ پتہ نہیں کب بوجھ اترے گا تیرا۔" اماں نے تیزی سے برتن مانجھتے ہوئے کہا۔

"اچھا جاری۔"

''اور سن.....کل نوں گلو کا بیٹا آوے گا رشتے لے کے تیرا میں ہاں کردوں گی۔'' اماں نے تتلی کو منہ دھوتا دیکھ کر جلدی سے کہا۔

''ری ماں میں اس لنگور سے نیں کرانی بیاہ..... میرے واسطے پینٹ شرٹ والا شہزادہ آوے گا.....تو دیکھ بھی لیو۔''

''دیکھا جاوے گا.....کل کو تیار ہو جیوں نیں تو چوٹی سے پکڑ کے ڈولی میں بیٹھادوں گی۔'' اب اماں غصے میں آ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے تتلی بنا کچھ بولے کمرے میں چلی گئی۔ اندر جاتے ہی تتلی نے صندوق کھولا اور سب سے صاف جوڑا نکالا۔ اور شام کو چھمو کے گھر جانے کی تیاری شروع کردی۔

تتلی اور اس کی ماں بہت ہی غریب طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تتلی کی ماں لوگوں کے گھروں میں صاف صفائی کرتی اور تتلی کبھی کبھی بھیک مانگ لاتی جس سے دونوں ماں بیٹی کا گزر بسر ہو جاتا۔ باپ تو 10 سال پہلے ہی بھیک مانگتے ہوئے گاڑی کے نیچے آ کر مارا گیا تھا۔ اس دنیا میں تتلی اور اس کی ماں کا ایک دوسرے کے سوا کوئی نہ تھا۔

شام ہوتے ہی تتلی نے جوڑا پہنا کس کر بال باندھے اور وہ سفید موتیوں والا ہار پہن کر چھمو کے گھر چلی گئی۔ چھمو کے گھر بہت بھیڑ لگی تھی ٹی وی رپورٹر اور کیمروں کی طویل لائن لگی تھی۔ کیونکہ جس امیر گھرانے نے چھمو کی شادی کے لئے پیسے دینے تھے وہ شاید دنیاوی دکھاوے کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تتلی لوگوں کے ہجوم میں جگہ بناتی چھمو کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔

''میری فوٹو نکال میں چھمو کی سب سے اچھی دوست ہوں۔'' تتلی کیمرہ مین سے مخاطب ہوئی۔ تتلی کی آواز پر سبھی نے اسے ہنستے ہوئے دیکھا۔

''یہ لیجئے پورے چار لاکھ ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو بلا جھجک مجھے بتایئے گا یہ میرا نمبر ہے۔'' خوبصورت سی لڑکی نے بڑی نفاست سے اپنا پرس کھولا اور پیسوں کا لفافہ چھمو کی ماں کی طرف بڑھایا اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا کارڈ بھی دیا جس پر اس کا نام پتہ فون نمبر سب موجود تھا۔

اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں پر چشمہ لگایا اور اٹھ کر چھمو کا لال دوپٹہ پہننانے لگی۔ تتلی کو محسوس ہوا کہ کوئی مسلسل اسے دیکھ رہا ہے۔ تتلی نے چاروں طرف دیکھا تو ایک بلیک شلوار قمیض میں ملبوس شخص تتلی کو کافی دیر سے گھور رہا تھا۔ پہلے تو تتلی گھبرا گئی لیکن پھر سوچا کہ وہی اس کے خوابوں کا شہزادہ ہے اب تتلی خود ہی اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ جواباً جب وہ بھی مسکرایا تو تتلی شرما کر کمرے میں چلی گئی۔

تتلی کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی تھی۔ اس کے دل میں تو لڈو پھوٹنے لگے اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے کے پلو سے اپنے دانت رگڑ کر صاف کیے اور شرماتے ہوئے باہر آ گئی۔

''Excuse me'' اس خوبرو نوجوان کو اپنے سامنے کھڑا پا کر تتلی کو حیرت کا جھٹکا لگا۔

''ہائے میں مرگئی۔'' تتلی کو زبردست چکر آیا اور وہ زمین پر گر گئی۔

''میڈم اٹھیے.....'' وہ نوجوان تتلی کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بولا۔ ''ہائے.....'' تتلی کو جیسے ہی ہوش آیا وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''آپ بے ہوش ہو گئیں۔ لوگوں سے آپ کا پتہ پوچھا آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔''

''را کہاں جاوے بابو.....تیرے واسطے تو گاؤں کے چھوروں کے رشتے ٹھکرا دیئے مینے اور تو مجھے چھوڑ کر جارا.....'' تتلی کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

''معاف کیجئے گا.....آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے سمجھ نہیں آ رہا۔''

''اتنی سی بات نہ سمجھ آوے تجھے.....شادی کر لے میرے سے بابو۔''

''دیکھئے محترمہ.....ٹوں.....ٹوں.....'' موبائل کی آواز نے اس نوجوان کو روک دیا۔

''ہیلو مایا.....'' نوجوان بولا۔

''شان پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جلدی

آؤ۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا شان نے موبائل جیب میں رکھا اور گاڑی کی چابیاں اٹھائیں اور جانے لگا۔'' بابو تو فیر آوے گا نا......''

''ہاں......'' شان نے نہ چاہتے ہوئے بھی تتلی کی التجائیاں نظروں کا پاس رکھ لیا۔

☆......☆......☆

''اشفاق صاحب کو بہت ہی ہائی ڈوز دی جارہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ رکوری کے بجائے پرمانٹ پیرا لائز ہو چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں شان آپ کے لئے وہ کتنی اہمیت رکھتے ہیں پر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''پر ڈاکٹر پاپا کو ہائی ڈوز کس نے دی۔ پاپا کی میڈیسن تو میں خود دیتی ہوں۔'' مایا نے بے یقینی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ''میڈیسن فارمیسی سے کون لاتا ہے؟'' ڈاکٹر کے سوال گھڑنے پر شان نے مایا کی طرف دیکھا۔

''میں'' شان بولا جس پر ڈاکٹر الجھ گیا۔ شان اور مایا ڈاکٹر کے روم سے باہر آ گئے۔ اور ICU میں داخل ہوئے جہاں اسٹریچر پر آکسیجن ماسک لگائے اشفاق صاحب آنکھیں موندے لیٹے تھے۔

''ت......تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔'' شان نے جیسے ہی دروازہ کھولا اندر کھڑے راحیل کو دیکھ کر بھڑک اٹھا۔

''ارے شان بھائی...... میں بس آپ کو حوصلہ دینے آیا تھا۔ تایا جان کے جنازے کو کندھا دینے لے لئے میں حاضر ہوں۔'' راحیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''بکواس بند کرواپنی۔ شان سنبھالو خود کو۔'' شان کا ہاتھ فضاء میں بلند ہوا تو مایا جلدی سے شان کو پکڑنے آئی۔ ''راحیل تم چلے جاؤ۔ ورنہ میں آج تمہارا قتل کر دوں گی۔''

لوگ کانٹوں سے بچ کر چلتے ہیں
ہم نے پھولوں سے زخم کھائے ہیں
تم تو غیروں کی بات کرتے ہو
ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں

راحیل بڑے مزے سے گانا گاتا ہوا چلا گیا اور شان دانت پیستا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''خدا ایسے رشتے دار کسی کو نہ دے۔ چاچا نے مجھے تنہا کر دیا۔ میرا سب کچھ چھین لیا۔

''مجھے شرمندگی ہوتی ہے ان کو اپنا باپ کہتے ہوئے لیکن شان میں ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑی رہوں گی میرا یقین کرنا۔'' مایا نے شان کو حوصلہ دیا۔

☆......☆......☆

''گول گپے کھانے چلو گی۔'' دروازے پر شان کو کھڑا دیکھ کر تتلی کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

''تو آ گیا بابو......میرے کو پتہ تھا تو آوے گا۔''

''جلدی سے تیار ہو جاؤ میں گاڑی میں ویٹ کر رہا ہوں......اور ہاں وہ سفید ہار ضرور پہننا۔ اچھا لگتا ہے تم پر۔'' شان مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تتلی بجلی کی تیزی سے تیار ہونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں ایک ڈھابے پر گول گپے کھا رہے تھے۔ واپسی پر آئس کریم کھانے کے بعد شان نے گاڑی سائیڈ پر روک دی۔

''تتلی یہ ہار تمہیں کہاں سے ملا تھا۔'' شان نے تتلی کے گلے کی طرف اشارہ کیا۔

''میں صبح صبح بھیک مانگن جاری تھی۔ روڑی پہ سے مجھے یہ ہار مل گیا۔''

''روڑی مطلب؟'' شان نے ناسمجھی سے کہا۔

''وہ جو گلو کی دکان کے سامنے کچرا پھینکنے کی جگہ ہے اسے روڑی کہوے۔ ایک دن میں اس کو پا کے چھمو کے گھر گئی۔''

''پھر'' شان نے پوچھا۔

''میری اور چھمو کی لڑائی ہوگئی اس نے میرا ہار گارے میں پھینک دیا۔''

''گارے میں مطلب؟'' شان نے الجھتے ہوئے کہا۔

''گارا مطلب کیچڑ...... ایک تو بابو تو ہر چیز کا مطلب پوچھے پڑھ لکھ کے بھی گنوار دیا تو نے۔'' تتلی کی ناگواری پر شان چونک گیا۔

''میں نے گھر لا کے اس کو صابن سے رگڑ رگڑ کے دھویا۔ دیکھیو اس کا رنگ بھی اتر گیا یہاں سے۔'' تتلی

نے ہار کے موتیوں میں اشارہ کیا۔

''دکھاؤ۔'' شان کے کہنے پر تتلی نے ہار اتار کر شان کو دیا۔ سفید موتیوں کے درمیان واضح کالا نشان تھا۔

''تتلی یہ ہار میں لے لوں۔'' شان نے مسکراتے ہوئے ہار ٹٹولا۔ ''تو میرا سب کچھ لے لے بابو بس مجھے دھوکہ نہ دیو۔''

تتلی کا جواب سن کر شان نے تتلی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

''چلو یہ تم رکھوا بھی۔'' شان نے ہار تتلی کو دیا۔

''تتلی میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو۔ میری زندگی ایک بھنور میں قید ہو چکی ہے میں پانچ سال سے ایک سچ کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ وہ سچ جس نے مجھ سے میرے سارے رشتے دار چھین لیے۔ میری ماں باپ میرا بھائی گھر جائیداد خوشیاں سب ختم ہو گئے۔ میں تمہیں دکھ اور غم کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔''

''بابو جو دکھ تو مجھے دیوے گا میرے واسطے وہ دنیا کی سب سے بڑی خوشی ہووے گی۔''

تتلی آنسو پونچھتی ہوئی گھر کی طرف چلی گئی۔

جب کہ شان سیٹ سے ٹیک لگا کر ماضی میں ڈوب گیا۔

اشفاق صاحب اپنی بیگم نائلہ اور دونوں بیٹوں شان اور امان کے ساتھ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اشفاق کا بزنس ملک سے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اشفاق نہایت ہی شریف انسان بھی تھا۔ بس اس نے ایک غلطی کر دی وہ اپنے غریب بھائی کو بھول گیا تھا اچانک ادریس اپنے بیٹے راحیل اور بیٹی مایا کے ساتھ اشفاق کے گھر پہنچا۔ اشفاق اپنے بھائی کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور اپنے پاس ہی رکھ لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ شان اور مایا کی شادی ہو گئی۔ مایا بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی اور اس میں ایک اچھی بیوی کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ ایک رات مایا اور شان کسی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ گھر پر امان، راحیل اور اشفاق کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔ امان اپنے کمرے میں بیٹھا گانے سن رہا تھا کہ اچانک نائلہ بیگم کی چیخ کی آواز سنائی دی امان دوڑ کر ان کے کمرے میں گیا۔ نائلہ بیگم فرش پر بے سدھ سی پڑی تھی اور ان کے پیٹ میں چاقو دھنسا ہوا تھا۔

''ماما.....'' امان نے روتے ہوئے نائلہ بیگم کے پیٹ سے چاقو باہر نکالا اور پاس پڑے پانی کا گلاس نائلہ بیگم کے ہونٹوں سے لگایا۔ پانی کا گھونٹ بھرتے ہی وہ نیلی پڑ گئیں۔ پانی میں زہر شامل کیا گیا تھا گھر میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ پولیس نے امان کو جیل میں ڈال دیا۔ شان جو ابھی وکالت کی ٹریننگ مکمل کر کے آیا تھا فوراً ہی بھائی کا کیس لڑنے لگا۔ لیکن سارے ثبوت اور سارے گواہ امان کے خلاف تھے۔ امان کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ ادھر ادریس نے موقع غنیمت سمجھ کر بیٹے اور بیوی کے غم سے دوچار اشفاق کو باتوں میں لگا کر ساری جائیداد اپنے نام کروالی۔ اشفاق اور شان سڑک پر آ گئے اشفاق یہ صدمہ برداشت نہ کر پایا اور ایک دن دل کے دورے نے اسے پیرالائز کر دیا۔ مایا نے شان کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس نے راحیل اور باپ سے رشتہ توڑ دیا اور شان کے ساتھ چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگی۔

شان کو یقین تھا کہ امان بے قصور ہے اس لئے اس نے ایک پلان بنایا۔ اس نے راحیل کے ایک دوست کو پیسوں کا لالچ دے کر Wine Party ارینج کروائی پلان کے مطابق راحیل جب نشے میں دھت تھا تب اس نے سارا سچ اگل دیا جو راحیل کے دوست نے موبائل میں ریکارڈ کر لیا۔ پارٹی کی صبح جب شان راحیل کے دوست کے گھر گیا تو پتہ چلا کہ وہ کل رات سے لاپتہ ہے۔

2 سال گزر گئے اس دوست کا کہیں پتا نہ چل سکا۔ پھر ایک دن اچانک شان کو پولیس والوں نے فون کر کے بتایا کہ شہر کے قریب جو گاؤں ہے اس میں ایک شخص زخمی حالت میں ملا ہے۔ شان ہسپتال پہنچا دیکھا یہ تو وہی تھا راحیل کا دوست۔ وہ لڑکا آخری سانسیں لے رہا تھا اس نے مرتے وقت بس یہ ہی بتایا کہ ریکارڈنگ والا میموری کارڈ کسی سفید موتیوں والے ہار میں ہے اس کے ساتھ ہی وہ دم توڑ دیا۔

تین سال تک شان نے ہار ڈھونڈا لیکن وہ ناکام

ہوگیا پھر ایک دن تتلی کے گلے میں ہار دیکھ کر اس کو حیرت ہوئی پہلے تو اس نے سوچا شاید اس کا اپنا ہار ہو لیکن اس کے دل نے اک نہ مانی وہ تتلی کے پیچھے گیا تاکہ ہار کی حقیقت جان سکے۔

شان نے آنکھیں کھولیں اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ سیدھا جیل کی طرف گیا۔

''آفیسر مجھے قیدی نمبر 207 سے ملنا ہے۔''

شان نے پولیس آفیسر سے کہا۔

''ملاقات کا ٹائم ختم ہوگیا۔''

''دیکھئے میں ایڈووکیٹ شان ہوں۔ قیدی نمبر 207 کا وکیل میرا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''اس کی ملاقات کروادو۔'' آفیسر نے بے دلی سے ایک سپاہی سے کہا۔

''امان میرے بھائی..... مجھے اس ہار کا پتہ چل گیا ہے اب بہت جلد تم میرے ساتھ ہوگے۔'' شان نے قیدی نمبر 207 یعنی امان سے کہا۔

''یہ تو بہت بڑی خبر ہے بھائی.....بس ایک بات کا دھیان رکھنا بھائی اس بات کا کسی سے ذکر مت کرنا ورنہ ہم پھر ہار جائیں گے۔''

''نہیں اس بار نہیں۔'' شان نے مسکراتے ہوئے امان کے گال کو تھپتھپایا۔

☆.....☆.....☆

''مایا میں کیس ری اوپن کروا رہا ہوں۔'' شان نے مٹر پلاؤ کھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا.....؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن کیوں۔'' مایا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب کیوں.....امان بے قصور ہے اور میں اپنے بھائی کو انصاف دلوا کر رہوں گا۔''

''تو کیا کوئی ثبوت وغیرہ ہے تمہارے پاس؟''

''ہاں۔''

''کیا؟''

''اس ماہ کی تیرہ تاریخ کو عدالت میں سب کو بتاؤں گا۔''

''I am Exicited''

''Me To'' شان نے نیپکین سے منہ صاف کیا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر چلا گیا۔

شان گاڑی گھماتا ہوا تتلی کے محلے میں انٹر ہوا۔ تتلی کے گھر کے پاس لوگوں کا ہجوم تھا جس کی وجہ سے شان گاڑی سے نکلا اور جگہ بناتا ہوا تتلی کے گھر کے سامنے آیا۔ شان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ تتلی کے گھر کی جگہ ایک میدان تھا جس پر گھر کا سارا ملبہ پڑا تھا۔ ایک بڑے سے پتھر کے اوپر تتلی اور اس کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔

''تتلی کیا ہوا.....؟'' شان نے تتلی کو جھنجھوڑا۔

''بابو.....وہ حکومت والے بندے مارے گھر پر مشین پھیر گئے۔''

''کیوں.....؟''

''کہوے جے سرکاری جگہ ہے ہم نے غیر قانونی قبضہ کیا ہے۔'' تتلی قدرے روتے ہوئے بولی۔ شان سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔

''آپ دونو میرے ساتھ میرے گھر چلو۔''

شان نے تتلی کی ماں سے کہا۔ اور وہ دونوں فوراً مان گئیں۔ شان بڑے آرام سے ان دونوں کو اپنے گھر لے آیا۔ گھر میں مایا نہیں تھی شائد مارکیٹ گئی تھی۔ شان نے مایا کو کال کی اور مہمانوں کی اطلاع دی۔ اس کے ساتھ ہی شان کسی ضروری کام کے سلسلے میں جیل روانہ ہو گیا۔ شام کو جب وہ واپس آیا تو گھر سے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں شان نے گھبرا کر دروازہ کھولا۔ اندر مایا اور تتلی کی اماں کی شدید ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔

''مایا یہ کیا ہے.....'' شان کی آواز پر وہ دونوں بالکل سیدھی ہوگئیں۔

''شان بابو یہ چھوری کہوے کہ میری تتلی نے تیرے کو اس سے چھین لیا۔ شان بابو بول نہ تو چپ کیوں ہے۔'' تتلی کی ماں شان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی۔

''مایا ایسی کوئی بات نہیں ہے Please Cool Down شان نے مایا کو سمجھانا چاہا۔

''نا بابو یہ تیری بہن کچھ نہ سمجھے۔'' تتلی کی ماں

نے مایا کی طرف اشارہ کیا جس پر مایا بھڑک اٹھی۔

''You Stop it'' مایا کا ہاتھ فضاء میں بلند تھا۔شان نے مایا کو پکڑا اور کمرے میں لے گیا۔

''دیکھو مایا..... یہ وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے میں نے کیس ری اوپن کروایا ہے مجھے تمہارے اعتماد کی ضرورت ہے پلیز مجھے سمجھو۔''

شان گھٹنوں کے بل مایا کے پاس بیٹھ کر بولنے لگا۔جس کے جواب میں مایا نے ہلکا سا سر ہلا دیا۔تھوڑی دیر بعد شان تتلی کی ماں کے پاس آیا۔

''آنٹی اب آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی میں خود آپ سے معافی چاہتا ہوں۔'' تتلی کہاں ہے آنٹی؟'' شان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

''راوہ ہی تو نہیں مل رہی۔ یہ چھوری میری تتلی کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھی۔اتنے میں اس ڈائن نے میری تتلی کی چوٹی پکڑلی۔پھر یہ میرے تے لڑنے لگ گئی تتلی نے مینے جاتے وے کہاری ماں سان نوں بتا دے میں جاری یہ مایا کایا تتلی کے پیچھے گئی اس کو پکڑنے میں نے دھر کے ماری، اس نوں۔'' تتلی کی ماں تفصیل بتاتے ہوئے رونے لگ گئی۔ جب کہ شان اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔تتلی کے پاس وہ سفید ہار تھا جس کی بدولت وہ اپنے بھائی کو انصاف دلوا سکتا تھا اس اپنی ماں کے اصل قاتل کا چہرہ بے نقاب کر سکتا تھا۔پیشی میں صرف 2 دن رہ گئے تھے اب وہ تتلی کو ڈھونڈنے نکلا۔

ہر سڑک ہر گلی ہر موڑ سب دیکھ لیا پر تتلی کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔شام ہونے والی تھی شان گاڑی میں ہی سو گیا۔وہ بے بس ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

فجر کی اذان ہوتے ہی شان نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی۔

''اے اللہ تو سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے۔حق اور باطل میں فرق کرنے والا ہے۔نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔یا اللہ تو میرے امان کی مدد فرما۔میرے اللہ میں نے کیس اس لئے ری اوپن کروایا کیونکہ میرے ہاتھ بہت بڑا ثبوت تھا۔یا اللہ تتلی لا پتہ ہے اور تتلی ہار بھی اپنے ساتھ لے گئی۔تو آج سچ کا سر بلند کر دے میرے مالک۔میرے پاس کچھ نہیں ہے کوئی ثبوت کوئی گواہ نہیں ہے۔یا اللہ تو میری عزت رکھ لے۔ میری مدد فرما میرے مالک۔اب بس تیرا آسرا ہی ہے۔ آمین۔'' شان کے دونوں ہاتھ آنسوؤں سے تر تھے۔

ادھر جیل میں امان بھی سجدے میں ریز اپنے رب سے رحم مانگ رہا تھا کیونکہ دونوں بھائی جانتے تھے ثبوت نہ ہونے پر عدالت دوبارہ موقع نہیں دے گی۔اب آخری موقع تھا۔شان نے تتلی کی ماں اور مایا سے دعا کی اپیل کی اور فائل اٹھا کر عدالت کی طرف گاڑی گھما دی۔ پندہ گھنٹ کی مسافت کے بعد وہ عدالت کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔اندر جا کر اس نے کچھ ضروری کاغذات جمع کروائے عدالت تمام لوگوں سے سج گئی۔

کٹہرے میں امان زنجیروں میں بندھا کھڑا تھا اور جج کے سامنے شان بلیک کوٹ اور وائٹ شرٹ پہنے تھا۔شان کے مخالف وکیل اور یس نے ہائر کیا تھا کیونکہ شان ساری کارروائی کا ذمہ دار راحیل کو قرار دے رہا تھا۔

''کارروائی شروع کی جائے۔'' جج کے حکم کے ساتھ ہی مخالف وکیل کھڑا ہوا۔

''جج صاحب پانچ سال پرانے کیسے کو دوبارہ کھولا جا رہا ہے۔وہ کیس جس میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ امان اشفاق اپنی ماں نائلہ اشفاق کا قاتل ہے۔''

I Object Your Honour'' ساتھی وکیل میری موکلہ کی توہین کر رہے ہیں۔'' شان نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''Objection Sustain'' جج نے شان کو چپ کروا دیا۔

''کیسا زمانہ آ گیا ہے جج صاحب لوگ جائیداد کی خاطر سگی ماں تک کو قتل کر دیتے ہیں۔''

مخالف وکیل طنزاً ہنسا۔

''قاتل امان کے حق میں ثبوت پیش کیے جائیں۔'' جج نے اپنا حکم سنایا جس پر مخالف وکیل اپنی

کرسی پر بیٹھ گیا۔

"جج صاحب میں انسپکٹر ابرار کو کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔" شان نے نہایت مودب انداز میں کہا۔

"اجازت ہے۔" جج کی اجازت ملتے ہی ایک موٹا اور قد آور پولیس مین کٹہرے میں داخل ہوا۔

"انسپکٹر دو سال پہلے آپ کو ایک گاؤں کے قریب ایک نوجوان زخمی حالت میں ملا تھا۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ کون تھا اور اس نے مرنے سے پہلے کیا کہا۔"

"جی...... وہ نوجوان راحیل کا اچھا دوست ہے اور" انسپکٹر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور......" شان نے جواب طلب نظروں سے دیکھا اور امان کو بھی۔ اس نے مرنے سے پہلے کہا تھا کہ امان نے راحیل کو پیسوں کی لالچ دی تھی تا کہ وہ نائلہ بیگم کو قتل کر دے۔ لیکن راحیل نے ایک نہ مانی اور پھر اس کو امان نے بہت مارا آخر میں امان نے اس نوجوان کو لالچ دی جب وہ بھی نہ مانا تو امان نے اسے اپنے ایک دوست کے ہاتھوں قتل کرنے کی کوشش کی۔ وہ نوجوان ایک جگہ چھپ گیا اور ایک دن وہ کار حادثے میں زخمی ہوا۔" انسپکٹر نے اپنا بیان مکمل کیا۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے...... میں راحیل کے کسی دوست کو نہیں جانتا۔" امان کٹہرے میں سے ہی بولا۔

"اچھا اگر وہ یہ کہے کہ راحیل قاتل ہے اور امان بے قصور تو وہ ٹھیک ہوگا۔" مخالف وکیل اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایسا نہیں ہوتا۔ عدالت سچ کا ساتھ دیتی ہے...... جج صاحب یہ اس نوجوان کا رجسٹرڈ بیان ہے۔" مخالف وکیل نے ایک فائل ٹائپسٹ کے حوالے کی۔ جبکہ شان لاچارگی سے سب دیکھ رہا تھا۔

"جج صاحب اب آپ اپنا فیصلہ سنائیں میرے پاس اب کوئی ثبوت اور گواہ نہیں رہا۔" شان ٹوٹے اور ہارے ہوئے قدموں سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو رواں تھے۔

تمام ثبوتوں اور گواہوں کے بعد عدالت یہ فیصلہ سناتی ہے کہ چونکہ ایڈووکیٹ شان نے عدالت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے عدالت ایڈووکیٹ شان سے ان کی وکالت کی ڈگری واپس۔"

"شان بابو" تتلی کی آواز پر جج رک گیا۔ شان نے بے یقینی سے کمرہ عدالت کے دروازے کی طرف دیکھا۔

"شان بابو تیرا ہار میں لے آئی۔ جا اپنے بھائی نوں چھڑا لے۔" تتلی نے سفید ہار شان کے حوالے کیا۔

"اب یہ کیا بچپنا ہے۔" مخالف وکیل بے زاری سے بولا۔ "بچپنا نہیں ہے وہ ٹھوس ثبوت ہے جس کی بنا پر یہ کیس ری اوپن کروایا میں نے۔" اب شان کی آواز میں رعب تھا۔

"یور آنرز پلیز مجھے یہ ثبوت پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔" شان نے ہار میں سے میموری کارڈ ٹائپسٹ کے حوالے کیا۔

"اگر یہ ثبوت فضول نکلا تو" مخالف وکیل نے سوال دہرایا۔ "تو میں عدالت سے اپیل کرتا ہوں کہ امان کو پھانسی کی سزا دی جائے۔" شان نے بڑے یقین سے کہا جس پر جج حیران رہ گیا۔

"اجازت ہے۔" جج کی اجازت ملتے ہی ٹائپسٹ نے میموری کارڈ کا کارڈ ریڈر میں اٹیچ کر کے یو ایس بھی کمپیوٹر میں نصب کی اور راحیل کی ویڈیو چلنے لگی۔

"یار...... آج تو نے بہت پی لی۔ اف راحیل ہمت کر یار۔ آہ سن یار تو نے تو مزے کروا دیے میرے۔"

"راحیل ایک بات بتائے گا۔"

"پوچھ یار۔"

"یار وہ تیری تائی کیسے ماری گئی ہے امان نے بڑی بے دردی سے مارا ہوگا نا تو تو وہیں تھا نا۔"

"ہاہاہا...... امان نے تھوڑی مارا ہے۔"

"اس بوڑھی کو تو میری بہن نے مارا ہے۔"

"اچھا وہ جو شان کی بیوی ہے وہی؟"

"ہاں...... وہی بڑی کمینی ہے میری بہن مایا۔"

"واہ بھئی...... لیکن یار وہ تو اس دن پارٹی پر گئی تھی نا۔"

''ہاں وہ پارٹی میں گئی تھی۔''

''راحیل یہ لے ایک اور گلاس تیار ہے ہماری اسپائسی ریڈ وائن۔''

''آہ..... مایا شان کے ساتھ گئی تھی۔ ہمارا پلان تھا پارٹی میں ماسک ڈانس کروانے کا۔ جب ڈانس شروع ہوا تو مایا نے اپنے جیسے کپڑے اور ماسک چھمو کو پہنا دیا اور مایا خود گھر آ گئی۔ پھر مایا نے اس بوڑھی کو چاقو سے مار دیا مایا نے گلوز پہنے تھے اسے پتہ تھا امان آئے گا۔ میں نے پہلے ہی پانی کے گلاس میں زہر ملایا ہوا تھا جب امان نے اس بوڑھیا کو وہ گلاس دیا تو وہ وقت پر اوپر پہنچ گئی۔ ورنہ وہ اس کو مایا کا بتا دیتی۔''

''تو تو بڑا ذہن ہے یار۔''

''ہاں ہاں..... میرے ساتھ رہا کر دولت میں کھیلے گا۔'' کمپیوٹر کی اسکرین بند ہوگئی تھی۔ امان ساکت بیٹھا کمپیوٹر کو تکے جا رہا تھا۔ لیڈیز پولیس مایا کو کرسی سے گھسیٹ کر کٹہرے میں لے آئی۔

''آپ کیا کہنا چاہیں گی۔'' جب شان نے کچھ نہ پوچھا تو جج نے خود ہی مایا سے سوال کیا۔

''ہاں میں نے ہی مارا ہے۔ اور کیوں نہ مارتی بیس سال تک تایا اور تائی نے ہماری خبر تک نہ لی۔ خود پیسوں میں کھیلتے رہے اور ہم دو وقت کی روٹی کو بھی ترستے تھے۔ کیا ان کا فرض نہیں تھا ہماری خیر خبر لینے کا جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ اس شہر میں رہتے ہیں تو ہم ان کے گھر آ گئے۔ وہ خوشیوں میں نہال تھے۔ دل جلتا تھا ہمارا جب وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ عیاشی کرتے تھے اور پھر تائی کو ہمارا رہنا پسند نہیں تھا۔ میں نے مار دیا اس بڑھیا کو..... شان تو میرے تھے ہی امان کو گھر سے نکلوا دیا اور تایا کو ہائی ڈوز میڈیسن دینے لگی جس سے وہ موت کے قریب چلے گئے۔ شان کو دکھانے کے لئے میں نے راحیل اور پاپا سے رشتے توڑ دیے۔

پر ایک دن مجھے اچانک پتہ چلا کہ شان راحیل کے دوست سنی کے ساتھ پلاننگ کر رہا ہے۔ میں نے سنی کو اغواء کروایا اور پھر وہ پتہ نہیں کس طرح فرار ہوگیا۔

میری محبت کا اس آدمی نے صلہ دیا کیسے یہ اس دو ٹکے کی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا تھا۔ مجھے چھمو نے بتایا کہ وہ اس کی دوست ہے تب میں نے ان دونوں ماں بیٹی کے گھر پر کرین پھروا دی یہ کہہ کر کہ یہ سرکاری جگہ ہے لیکن یہ تتلی تو میرے گلے ہی پڑ گئی۔ اگر اس دن یہ فرار نہ ہوتی تو آج میں مجبوراً یہاں نہ ہوتی میں تو جیل جاؤں گی پر سنولڑکی راحیل کو کہہ کر تیرا خاتمہ کرواؤں گی تنگ کر کے رکھ دیا ہے مجھے۔'' مایا نے جیسے ہی بات ختم کی شان نے ایک زناٹے دار تھپڑ مایا کے گال پر رسید کیا۔

''Order Order'' جج نے شان کو وارننگ دی شان کی آنکھیں غم و غصہ سے بھرپور تھیں۔

''مس مایا کا بیان سننے کے بعد یہ واضح ہوگیا ہے کہ نائلہ بیگم کا اصل قاتل امان اشفاق نہیں بلکہ مایا شان ہے عدالت مایا کو پھانسی کی سزا سناتی ہے۔ عدالت ادریس پر 20 لاکھ جرمانہ عائد کرتی ہے اور یہ حکم دیتی ہے کہ جائیداد کے کاغذات پر مکمل کارروائی کی جائے راحیل کو جرم میں ساتھ دینے پر پانچ سال قید کی سزا سناتی ہے۔ عدالت امان اشفاق سے شرمندہ ہے اور باعزت رہا کرتی ہے۔'' جج اپنا فیصلہ سنا کر کرسی سے اٹھ گیا۔

پولیس نے امان کو ہتھکڑیوں سے آزاد کر دیا۔ لیڈیز پولیس نے مایا کو ہتھکڑی لگائی اور کٹہرے سے لے کر جانے لگی۔ امان خوشی سے نہال روتا ہوا بھائی کے گلے لگا۔

''مایا.....'' مایا جانے لگی تو شان نے اسے روکا۔

''ہاں.....''

''مایا..... تم نے گرگٹ کے بارے میں سنا ہے۔ یہ دنیا کا واحد جانور ہے جو رنگ بدلتا ہے۔ مایا آج تم نے گرگٹ کو مات دے دی۔'' شان کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرے۔ پولیس مایا کو لے کر جا چکی تھی۔ شان نے امان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور جانے لگا۔

''تتلی چلو گھر چلتے ہیں۔'' شان کی بات پر اداس بیٹھی تتلی چہک گئی اور وہ تینوں خوشی سے گھر روانہ ہوگئے۔

بے بس وجود

مریم فاطمہ۔ کراچی

دن رات میں چاہے آندھی آئے یا طوفان انسان کو کبھی فطرت کے خلاف قدم نہیں اٹھانا چاہئے بلکہ اپنے آپ میں خوش رہنا چاہئے اور زندگی کو بہتر بنانے کی فکر کرنی چاہئے تاکہ.....

سوچ فکر.....اور اچنبھے میں ڈالتی.....عجیب وغریب ناقابل یقین حقیقت پر مبنی کہانی

جاپان میں ان دنوں موسم خوش گوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ایچیکا جو ایک سترہ سالہ خوبصورت معصوم اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس وقت اسکول سے چھٹی کے ٹائم پہ اسکول کی بلڈنگ سے باہر نکل رہی تھی۔ وہ اپنی دھن میں چلی جارہی تھی کہ اچانک ہی سائیڈ سے ان چار بدمعاش لڑکیوں کا گروپ نکل کر اس کے راستے میں آ گیا۔ اس گروپ میں حنا، یوا، ہماری اور سارہ شامل تھیں۔ حنا ان میں سب سے شریر لڑکی تھی۔ اس نے پوری قوت سے ایچیکا کو زمین پہ دھکا دے کر گرادیا۔ ایچیکا کے منہ سے ایک چیخ برآمد ہوئی۔ سارہ نے اس کا اسکول بیگ اُٹھالیا۔ اور اسے کھول کر ساری کتابیں اور نوٹ بکس اُلٹ دیں۔ اس میں ایک ''کامِک بک'' بھی تھی۔

''ارے یہ کیا.....! تو تم یہ بھی پڑھتی ہو۔ ہوں!

ذرا دیکھو تو اس کا نام کیا ہے۔ How To love A girl تو تم ایسی رومانوی سیریز بھی پڑھتی ہو۔'' سارہ نے اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں ذرا دیکھو اندر کیا لکھا ہے۔ پاما ٹو نے سکورا کو Kiss کیا تو وہ شرم سے سرخ پڑ گئی۔ ہا..... ہا! کیا بکواس ہے۔ ارے آگے دیکھو کیا لکھا ہے کہ ماتھے پہ بوسہ دینے کے بعد اس نے اس کا گال چوما اور پھر ہونٹ بھی چوم لیے۔'' سارہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور ''کامک بک'' پھاڑ کر پھینک دی۔

''اُف نہیں ..... یہ تم نے کیا کر دیا؟'' ایچیکا جلدی جلدی ''کامک بک'' کے پھٹے ہوئے ٹکڑے سمیٹنے لگی۔ وہ چاروں بدمعاش اسے وہیں چھوڑ کر اسکول سے نکل گئیں۔ ایچیکا نے بھی کتابیں وغیرہ بیگ میں پھر سے بھریں اور اسکول سے نکلتی چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

ایچیکا جب گھر پہنچی تو اسے دروازے پہ ایک کارٹن رکھا ہوا نظر آیا۔ اس پہ کسی کا نام پتہ درج نہیں تھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ڈاک خانے کی کوئی مہر وغیرہ بھی نہیں تھی۔ معلوم پڑتا تھا کہ کوئی خود اسے رکھ کر گیا ہے۔

ایچیکا کو تجسس ہوا کہ اس میں کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا کہ اندر چل کر کارٹن کھولے۔ وہ کارٹن اٹھائے اندر آ گئی۔ ابھی اس کے مام اور ڈیڈ گھر واپس نہیں لوٹے تھے۔ اس نے کارٹن اندر اپنے کمرے میں لے جا کر فرش پہ رکھ دیا۔ اور پھر زمین پر بیٹھ کر اسے کھولنے لگی۔ اندر سے ایک Hard Material والی گڑیا باہر برآمد ہوئی۔ جس کے سیاہ گھنے بال تھے۔ اور اس نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایچیکا نے اسے فرش پہ رکھ دیا۔ پھر نا معلوم اسے کیا ہوا کہ وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ پھر اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے رکھی اس حسین و جمیل گڑیا کو دیکھا جو کہ سائز میں اچھی خاصی بڑی تھی پھر وہ روتے ہوئے بولی۔

''شاید تمہیں نہیں معلوم کہ میں خود کو کتنا بے بس محسوس کرتی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں میں بھی خود کو بہت بے بس محسوس کرتی ہوں۔ میرا وجود تو بالکل ہی بے بس ہے۔'' اچانک ہی گڑیا کے ہونٹ ہلے اور وہ بولی۔

ایچیکا بری طرح ڈر کر پیچھے کو ہٹی۔

''ت.....تت تم کون ہو؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں اکاری ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہیں یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہوگی کہ ایک گڑیا بھلا کیسے بول سکتی ہے۔''

تو سنو! میرا مالک مائسو ڈا جس نے مجھے بنایا تھا۔ مجھے بنانے کے بعد اس نے مجھ پہ منتر پڑھ کے پھونک دیا تھا جس سے مجھ میں روح پڑ گئی۔ اور ہاں دل بھی تو، مائسو ڈا نے جب مجھ میں روح ڈالی تو میں زندہ ہو گئی لیکن میں حرکت نہیں کر سکتی۔ میں بالکل بے بس ہو کر ایک ہی جگہ پڑی رہتی ہوں۔ مجھ میں روح ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی عام لوگوں کی طرح دنیا کے سارے کام کروں۔ میں دنیا پہ حکومت کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار مائسو ڈا سے کیا اور اس سے کہا کہ اگر میں اسے اپنی روح دے دوں اور وہ مجھے اپنی روح دے دے گا تو میں اس کے جسم میں رہتے ہوئے دنیا کے سارے کام کر سکتی ہوں۔ اور ایسا کرنے سے ہمارے دل ہمارے جسم میں ہی رہیں گے صرف ہماری روح ایک دوسرے کے پاس ہوں گی۔ لیکن جب میں اس کے جسم میں ہوتے ہوئے دنیا کے سارے کام آزادی سے کروں گی۔ تو میرے دل کو خوشی ہوگی۔ لیکن وہ میری اس خواہش کو سن کر ڈر گیا کہ یہ میں نے کیا شیطان بنا دیا ہے۔ اور وہ خاموشی کے ساتھ مجھے اس کارٹن میں بند کر کے تمہارے دروازے پہ رکھ گیا۔''

اکاری بول کر چپ ہوئی تو ایچیکا کا خوف بالکل ختم ہو گیا اور وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ یقین کرو میں بھی تمہاری طرح بالکل بے بس ہوں۔ بالکل بے بس

وجود ہے میرا۔ مجھے میرے اسکول میں جہاں میں پڑھتی ہوں چار لڑکیاں مجھے ستاتی ہیں یہ دیکھو آج انہوں نے کیا کیا۔ اتنا کہہ کر ایچیکا نے اکاری کو اپنی پھٹی ہوئی ''کامِک بک'' دکھادی۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ تم تو واقعی بہت پریشان لگتی ہو۔'' اکاری بولی۔

''ہاں میں واقعی بہت پریشان ہوں لیکن اب نہیں تمہارا وہ روح والا سودا مجھے منظور ہے۔'' ایچیکا عجیب انداز میں مسکرائی۔

''میں تمہیں اپنی روح دے دوں گی۔ تم مجھے اپنی دے دینا لیکن دیکھو میری ایک شرط ہوگی۔ ایچیکا کے چہرے پہ اس وقت مکاری ٹپک رہی تھی۔

''شرط؟ ہاں بولو کیسی شرط؟'' اکاری نے فوراً سے پیشتر دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ جس طرح تم میرے ذریعے اس دنیا پہ حکومت کرنا چاہتی ہو ٹھیک اسی طرح میں تمہارے ذریعے ان چاروں سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔ میں اب مزید بے تُکی والی زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ اور پھر ایچیکا نے اکاری کو اپنا منصوبہ بتایا تو وہ مسکرادی۔

ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ تو اب کیا کریں۔ ایچیکا نے پوچھا۔ ہم دونوں ساتھ میں مل کر تین بار یہ جملہ دہرائیں گی۔ اور وہ یہ کہ میں اپنی روح تمہیں دیتی ہوں۔ اکاری نے بتایا تو ان دونوں نے یہی کیا۔ اچانک ہی اکاری (گڑیا کا وجود) بولی۔ ارے واہ یہ تو کمال ہی ہوگیا۔ میں تمہارے جسم میں رہ کر اپنے ہاتھ پیر ہلا سکتی ہوں۔ حالانکہ میری روح وہاں ہے تمہارے پاس لیکن میرا دل اس خوشی کو محسوس کرسکتا ہے۔ ہاں بالکل اب تم سب کچھ کرسکتی ہو۔ ایچیکا نے اپنے بازوؤں پہ ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی روح تو بھلے اکاری کے جسم میں تھی لیکن اس کا دل ابھی بھی اس کے پاس ہی تھا۔ وہ خوش تھی کہ اکاری اس کے جسم میں آکر خوش ہے۔ ایچیکا کا دل چونکہ اس کے سینے میں ہی تھا اس لیے وہ ابھی بھی ہر چیز محسوس کرسکتی تھی۔ ایچیکا نے آگے بڑھ کے اکاری کو اٹھالیا اور پھر وہ دونوں شیطانی انداز میں قہقہے لگانے لگیں۔ دنیا ہماری مٹھی میں ہے۔ ہم اب پوری دنیا پہ حکومت کریں گے۔ وہ دونوں مکاری سے ہنستے ہوئے بولیں۔ اسی لمحے باہر بجلی بڑے زور سے کڑکی۔ معلوم پڑتا تھا کہ باہر بادل آرہے ہیں اور جلد ہی طوفان آئے گا۔ اچانک ہی ایچیکا کو خیال آیا کہ اس کے مام اور ڈیڈ آنے والے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے اکاری سے کہا کہ وہ اب اسے سنبھال کر الماری میں رکھ دے گی۔ تنہائی میں نکالے گی۔

☆.....☆.....☆

اس رات بڑی زوروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ایچیکا اپنے کمرے میں بستر پہ بیٹھی ہوئی اکاری سے باتیں کر رہی تھی۔ ایچیکا بس تم میری ایک بات یاد رکھنا۔ اکاری بولی۔ وہ کیا؟ ایچیکا نے پوچھا۔ وہ یہ کہ کبھی بھی مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔ کیونکہ اگر مجھے کسی بھی قسم کا کوئی بھی نقصان پہنچا تو یاد رہے کہ تمہاری روح تو میرے جسم میں ہے ہی پھر تمہارا دل بھی میرے جسم میں ہوگا اور میرا دل تمہارے جسم میں ہوگا۔ کیوں سمجھ گئیں؟ اکاری بول کر خاموش ہوئی تو ایچیکا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

لیکن یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ اور اگر پہلے نہیں بھی بتائی اب بتادی تو اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ ہم پھر سے ایک دوسرے کو اپنی روح دے دیں گے۔ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ مجھے تم پر پورا بھروسہ تھا کہ تم میرے وجود کا خیال رکھو گی۔ اور رہی بات پھر سے ایک دوسرے کو اپنی روح دینے کی تو ایسا کھیل ہم پھر دوبارہ نہیں کھیل سکیں گے۔ اکاری نے بتایا۔ اسی لمحے ایچیکا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس کی مام اندر داخل ہوئیں۔ ایچیکا تم ابھی کس سے باتیں کر رہی تھیں۔ کسی سے بھی نہیں ایچیکا نے فوراً سے جھوٹ بولا۔ لیکن تمہارے کمرے میں سے تو باتیں کرنے اور بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ مام بولیں۔ وہ تو میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ابھی آپ کے آنے پہ ہی تو بند کیا ہے۔ ایچیکا نے ایک بار پھر مکمل صفائی کے ساتھ جھوٹ

بولا۔ اچھا ٹھیک ہے مام بولیں اور واپس چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ایچیکا نے اکاری کو اپنے پیچھے سے نکالا جسے اس نے دروازہ کھلنے کی آواز پہ فوراً سے اپنے پیچھے چھپالیا تھا۔

اوہ بال بال بچے۔ ایچیکا نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔ اچھا اب کل کے دن تم تیار رہنا۔ جانتی ہو ناں ہم نے ان کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ ہاں جانتی ہوں۔ اکاری نے مکاری سے ہنستے ہوئے کہا۔ اور پھر ایچیکا نے اکاری کو احتیاط کے ساتھ واپس الماری میں رکھ دیا۔ اور خود بھی سونے کے لئے لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح کے وقت ایچیکا نے اکاری کو اپنے اسکول بیگ میں رکھا اور اسکول پہنچ گئی۔ وہ اپنی کلاس کی طرف ہی جارہی تھی کہ سامنے سے حنا آ گئی۔

''تم Comic Lover۔'' اس نے بدتمیزی سے کہا۔

''ہاں میں آ گئی۔'' ایچیکا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حنا ایسا ردعمل دیکھ کر چونکی پھر غصے سے بولی۔ ''خود کو زیادہ ہی اسمارٹ سمجھتی ہو تم؟''

''ہاں بہت زیادہ یہ دیکھو میرے پاس کیا ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنے بیگ میں سے اکاری کو باہر نکال لیا۔ اکاری اچانک ہی بول پڑی۔ ''کیا نام ہے تمہارا بد معاش لڑکی۔''

اس کا نام حنا ہے۔ ایچیکا نے جلدی سے بتایا۔ اچھا تو تم ہو حنا بھئی تم تو بے حد ڈھیٹ لڑکی ہو۔ اکاری بولی تو حنا کے گلے سے خوف کے مارے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی اور وہ چکرا کر فرش پر گر گئی اور ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگئی۔ ایچیکا نے جلدی سے اکاری کو واپس بیگ میں بند کیا اور بھاگتی ہوئی اپنی کلاس کی جانب بڑھ گئی۔ دوسری کلاسوں میں سے ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس نکل کر باہر آ گئے۔ بڑی مشکلوں سے اسے ہوش دلایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی وہ چیخیں مارنے لگی۔

ٹیچرز نے اس کے اس طرح ڈرنے کی وجہ پوچھی تو وہ ڈر کے ایک طرف کو بھاگ گئی۔ بڑی مشکل سے اس کی کلاس ٹیچر اسے کلاس میں لے کر آئیں۔ وہ ڈرے اور سہمے ہوئے انداز میں ٹیچر کے ساتھ کلاس میں داخل ہوئی۔

ٹیچر نے اسے اس کی سیٹ پہ بٹھا دیا۔ لیکن وہ کلاس میں سارا وقت بس ایچیکا اور اس کے بیگ کی طرف ہی دیکھتی رہی۔

بریک کے وقت حنا اور اس کے گروپ کی باقی لڑکیاں اس سے پوچھنے لگیں کہ آخر بات کیا ہے۔ وہ اتنی سہمی اور گھبرائی ہوئی کیوں ہے۔ جواب میں وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اور عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی رہی۔ تینوں لڑکیاں غصے میں بپھری ایچیکا کے پاس آئیں اور ایوا تیوریاں چڑھائے ماتھے پہ بل ڈالے بولی۔

''سچ سچ بتاؤ تم نے کیا کیا ہے حنا کے ساتھ؟''

''کچھ بھی تو نہیں میں نے تو بس اسے اکاری سے ملوایا تھا۔''

ایچیکا نے مسکراتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ''کون اکاری؟'' یوا نے اچنبھے میں پڑتے ہوئے پوچھا۔

ٹھیک اسی لمحے ایچیکا کے بیگ میں سے اکاری کے ہنسنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ تینوں کی تینوں ڈر گئیں اور پیچھے کو ہٹنے لگیں۔ ایچیکا نے فوراً سے اکاری کو بیگ سے باہر نکالا اور اس کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ اور بھئی بدمعاش لڑکیوں مجھ سے مل کر کیسا لگ رہا ہے۔ اکاری خباثت بھرے لہجے میں بولی۔

''آ..... آ آں.....'' وہ تینوں چیختی چلاتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئیں اور پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔

''چلو بھئی ایچیکا تمہارا کام تو ہو گیا۔ یعنی تمہارا بدلہ تو پورا ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ لڑکیاں تمہیں ساری زندگی نہیں ستائیں گی۔ اکاری بولی۔ ہاں ستانا تو دور کی بات وہ آئندہ کبھی میرے سامنے آتے ہوئے بھی ڈریں گی۔ لیکن پھر بھی کیا ہم انہیں ایک بار پھر سے

نہیں ڈرا سکتے۔ ایچکا نے کہا۔

''میرے خیال میں یہ کچھ مناسب نہیں ہوگا۔ بار بار میرا لوگوں کے سامنے جانا ٹھیک نہیں ہے۔'' اکاری نے کہا۔

''ہاں یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' ایچکا کو فوراً ہی سمجھ آ گئی۔

☆.....☆.....☆

دن پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایچکا اور اکاری اپنی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ لیکن پھر ایک دن جب ایچکا اسکول پہنچی تو ان چاروں بدمعاش لڑکیوں نے چپکے سے اس کے بیگ میں سے اکاری کو نکال لیا۔ ایچکا کو اس بات کی خبر گھر پہنچ کر ہوئی کہ اس کے اسکول بیگ میں سے اکاری غائب ہے۔ وہ تو جیسے بالکل پاگل ہی ہوگئی۔ وہ پورے گھر میں دیوانوں کی طرح اکاری کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ لیکن وہ اسے کہیں نہ ملی ظاہر ہے مل بھی کیسے سکتی تھی وہ تو اس وقت ان چاروں کے پاس تھی اور وہ اسے لے کر پاس والے جنگل میں جا رہی تھیں۔

''چھوڑ دو مجھے ڈھیٹ لڑکیوں۔ اور خاموشی کے ساتھ مجھے ایچکا کے حوالے کر دو۔''

''چپ کر منحوس گڑیا۔'' حنا حقارت سے بولی۔

''اپنی زبان کو لگام دو ذلیل لڑکی۔'' اکاری غصے سے بولی۔ لیکن لڑکیوں نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے جنگل کے عین بیچوں بیچ لے جا کر زمین پہ پھینک دیا۔

''اوہ! یہاں کہاں جنگل میں لے آئیں تم لوگ مجھے، مجھے واپس ایچکا کے پاس لے کر چلو۔'' اکاری طیش میں آتے ہوئے بولی۔ تب ہی سارہ نے اپنے پاس سے ایک بڑی کلہاڑی نکالی اور وہ اکاری کے سامنے لہرائی اب تو اکاری کو اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ سارہ نے کلہاڑی کے وار کر کے اس کے چار ٹکڑے کر دیے۔ اس کی گردن الگ ہو چکی تھی۔ ایسا کرنے کی دیر تھی کلہاڑی کے پہلے

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈائجسٹ کراچی

اگست کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں۔

ایسی سرگزشت اور حکایتیں جنہیں ڈر کی وادی اور خوف کے شہر سے چنا گیا.....!

سلسلے وار لہو رنگ کہانیاں جن کی ایک سطر رونگٹے کھڑے کر دے گی.....!

دہشت ناک طرزِ نگارش کے اس ڈائجسٹ کی ورطۂ حیرت کر دینے والی وہ خون آشام کہانیاں کہ آپ انگشت بدنداں رہ جائیں گے!

عجوبہ روزگار قصے، بھیانک آپ بیتیاں، خوفناک، جگ بیتیاں، انہونے واقعات!

ان غیر ارضی و ماورائی مخلوق کی کارستانیاں، جن کا تصور ہی عام آدمی کو لرزہ براندام کر دیتا ہے.....!

حسین و جمیل کافر ادا دوشیزاؤں کی عشوہ طرازیاں، جو پل بھر میں خون آشام چڑیلوں کا روپ دھارتی نظر آئیں گی!

ملکی و غیر ملکی، خوفناک اور دہشت انگیز کہانیوں کا انوکھا و معیاری مجموعہ.....!

دیسی، بدیسی معروف و نامور قلم کاروں کی وہ تحریریں، جن کے آپ متلاشی ہیں۔

پہلی مرتبہ ڈرڈائجسٹ کی شکل میں دستیاب ہیں.....!

اس کے علاوہ آپ اپنی کہانیاں ان پیج اردو پر کمپوز کر کے بذریعہ ای میل بھی بھیج سکتے ہیں۔

ہمارا ای میل ایڈریس ہے:

Dardigest01@gmail.com

خط و کتابت کا پتہ:
گوالی لائن نمبر 3، نورانی آرکیڈ
نیو اردو بازار کراچی

قیمت-/80 روپے

Mob:0324-7232580

آفس ٹائم: صبح 10 سے شام 6 تک

ہی وار سے ایچیکا کا دل بھی اکاری میں آسمایا اور اکاری کا دل ایچیکا کے سینے میں دھڑک اٹھا ایچیکا اکاری کے وجود میں زمین پہ پڑی ان چاروں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسے ہوگیا۔ میں اتنی دیر سے اکاری کو ڈھونڈ رہی تھی تو ان چاروں نے اکاری کو میرے بیگ سے نکالا اور یہاں لا کر اکاری کے یعنی میرے ٹکڑے کر دیے۔ وہ چاروں جلدی سے اس کو وہیں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئیں۔

☆.....☆.....☆

دوسری طرف اکاری بھی سمجھ گئی کہ یقیناً انہوں نے میرے وجود کے ٹکڑے کر دیے ہوں گے جب ہی اس وقت میرا دل بھی ایچیکا کے سینے میں دھڑک رہا ہے۔ وہ انتقام کی آگ میں جلنے لگی۔ اس نے بھی کہیں سے کلہاڑی کا بندوبست کیا اور جلدی جلدی ہماری حنا، یوا اور سارہ کے راستے پہ چل دی۔ اسے پورا یقین تھا کہ وہ چاروں ابھی جنگل سے زیادہ دور نہیں ہوں گی۔ وہ جلدی جلدی پہنچی لیکن وہ اسے شہر میں ہی مل گئیں۔ شاید تیز تیز دوڑتی ہوئی آئی تھیں۔ اکاری نے جو کہ اب ایچیکا کے وجود میں تھی کلہاڑی سے لے کر ان پہ وار کرنا شروع کر دیا۔ اور ذرا سی دیر میں ہی چاروں کو مار ڈالا۔

پھر اس نے کلہاڑی ایک طرف پھینکی اور اونچی آواز میں بولی۔ میں تمہیں ڈھونڈنے آرہی ہوں ایچیکا۔ لیکن پاس ہی پولیس اسٹیشن تھا کسی نے پولیس کو خبر کر دی تھی پولیس کے لوگ فوراً ہی باہر آگئے اور اسے پکڑ لیا۔ اس وقت اکاری اور اس کے ماں باپ پولیس اسٹیشن میں موجود تھے۔ پولیس اکاری سے جو بھی سوال کرتی وہ اس کا یہی جواب دیتی کہ وہ ایک گڑیا ہے اور اس کا نام اکاری ہے اور سارا واقعہ اس نے پولیس کے گوش گزار کر دیا۔ کسی نے بھی اس کی اس کہانی پہ یقین نہیں کیا اور اسے پاگل قرار دے دیا گیا۔ اسے فوراً ہی پولیس اسٹیشن سے سیدھا پاگل خانے بھیج دیا گیا۔ وہاں اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اکاری نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ مجھے یہاں سے باہر نکالو میں اس دنیا پہ حکومت کرنا چاہتی ہوں۔ اکاری دل میں سوچنے لگی کہ میں تو اس دنیا پہ حکومت کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج میں بالکل بے بس ہوگئی ہوں..... ہاں میں اسی دنیا کے آگے بے بس ہوکر رہ گئی ہوں جس دنیا پہ کبھی میں نے حکومت کرنے کا سوچا تھا میرا وجود بالکل بے بس ہے۔

☆.....☆.....☆

اس رات بڑے زوروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ایچیکا اکاری کے روپ میں جنگل کے بیچوں بیچ پڑی ہوئی تھی۔

''اُف کہیں بارش شروع نہ ہو جائے۔ بارش ہو گئی تو میرا سارا Material خراب ہو جائے گا اوپر سے رات کا یہ سناٹا یہ جنگل کی عجیب عجیب آوازیں مجھے تو بے حد خوف محسوس ہو رہا ہے۔ نا معلوم اکاری اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ اس نے مجھے اب تک ڈھونڈا کیوں نہیں۔ وہ تو یہ جانتی ہی ہے کہ میں یہاں جنگل میں ہوں لیکن وہ ابھی تک مجھے لینے نہیں آئی۔ اور اگر اب وہ مجھے لینے بھی آجائے تو فائدہ کیا میں دوبارہ سے تو اپنے جسم میں جا نہیں سکتی۔ میں پہلے اتنی بے بس نہیں تھی جتنی کہ اب ہوگئی ہوں۔ کاش میں نے اکاری کے ساتھ وہ روح والا سودا نہ کیا ہوتا۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا فائدہ آج میرا وجود پہلے سے بھی کہیں زیادہ بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔'' ایچیکا نے دل میں سوچا۔ ان دونوں کو ساری زندگی ایسے ہی بے بسی میں گزارنی تھی۔

اکاری کو پاگل خانے میں رہنا تھا جبکہ ایچیکا کو جنگل میں یونہی پڑے رہنا تھا۔

دن رات چاہے آندھی آئے یا طوفان انسان کو کبھی فطرت کے خلاف قدم نہیں رکھنا چاہیے۔ اپنے آپ میں خوش رہنا چاہیے۔ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے لیکن اس طرح نہیں کہ جس طرح اکاری اور ایچیکا نے فطرت سے پنگا لے کر کیا۔

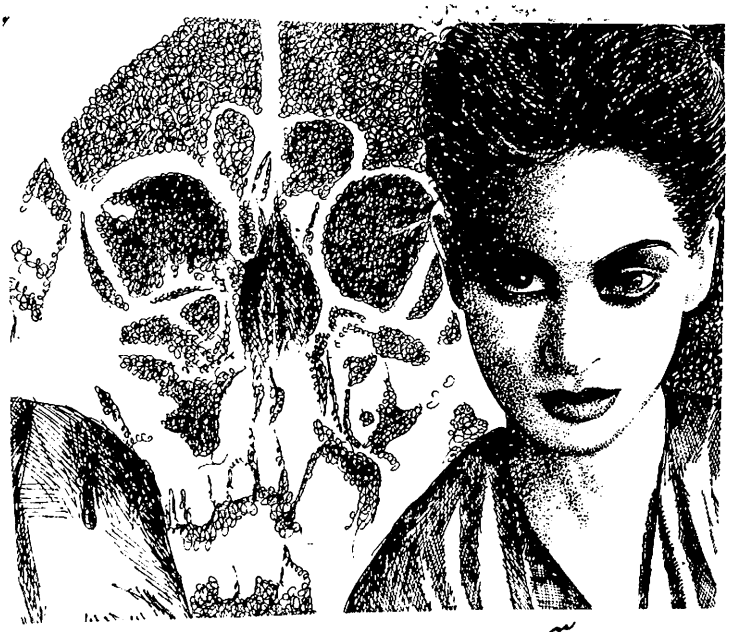

سچ یا وہم

افشاں رمضان-پنڈ دادنخان

عورتوں کی چیخ و پکار کی وجہ سے پوری کوٹھی گونج رہی تھی کہ اتنے میں بے شمار بلیوں کی دل دھلاتی آوازیں بھی شامل ہوگئیں تو عورتوں نے دانتوں تلے اپنی انگلیاں ڈالیں اور پھر.....

دل و دماغ میں ہلچل مچاتی اور جسم و جاں میں خون منجمد کرتی.....خوفناک.....کہانی

سنہری رنگ کا بڑا سا گیٹ بند دیکھ کر گاڑیاں ہارن پر ہارن دے رہی تھیں۔ چوکیدار گھبراتا ہوا جلدی سے گیٹ کھولنے لگا، ایک ایک کر کے چاروں گاڑیاں اندر داخل ہوئیں۔ آہستہ آہستہ گاڑیاں خالی ہوگئیں اور عورتیں، مرد، بچے، جوان سب صدیقی صاحب کی کوٹھی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ کوئی تین منزلہ کوٹھی تھی سفید ماربل پر گولڈن کھڑکیاں اور دروازہ بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ انٹرینگ ڈور پر گلاب اور چمبیلی کے پودے رکھے تھے۔ کار پورچ کے دائیں جانب بڑا سا لان تھا۔ جس میں گیندے کے پھولوں سے سجاوٹ کی گئی تھی۔ جبکہ بائیں جانب ٹینس گراؤنڈ سا کچھ تھا۔ ٹینس نیٹ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ صدیقی صاحب کے بچے یہاں ٹینس کھیلتے ہیں۔

سارے مہمان کوٹھی کے اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم.....!''

ریحانہ کی آواز پر سب مہمان خوشی سے کھل اُٹھے۔کوٹھی اندر سے بے حد خوبصورت تھی۔گولڈن ماربل سے ڈھکے فرش پر براؤن کارپٹ بچھا تھا۔ایک طرف صوفوں کی قطار تھی جو شاید مہمانوں کے لئے بنائی گئی تھی۔ سامنے ہی بیضوی سیڑھیاں جو اوپر کی منزل میں جاتی تھی۔

سارے مہمان ریحانہ سے باری باری ملنے کے بعد کمروں میں فریش ہونے چلے گئے۔

''شایان کھانا کھالو آکر.....'' منال نے شایان کے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا۔جس پر شایان نے ہاں میں سر ہلادیا۔شایان نے بیگ سے کپڑے نکال کر الماری میں سیٹ کئے اور کھانے کے لئے ڈائننگ روم جانے لگا۔ایک بہت بڑے ڈائننگ ٹیبل پر خاندان کے تمام نوجوان کزنز اور عورتیں موجود تھیں۔افراد زیادہ ہونے کے باعث مرد حضرات دوسرے ڈائننگ ٹیبل پر تھے۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے نا سب ساتھ بیٹھے ہیں۔'' شایان نے سب کو ساتھ دیکھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... تھینکس ٹو حمزہ بھائی۔اگر یہ شادی نہ کرواتے تو ہم ایسے بیٹھے نہ ہوتے۔''عینی نے کباب اپنی پلیٹ میں رکھا۔''اچھا جی..... تو میری شادی پر اتنا ہی خوش تھے تو پہلے بھونکتے۔میں شادی دو سال پہلے ہی کروالیتا۔ہا ہا ہا۔''حمزہ نے عینی کی طرف سیب اچھالا۔

''میں نے تو کہا تھا..... حمزہ بھائی کی شادی کرو تاکہ میری باری بھی آئے۔'' موسیٰ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔جس پر سب کزنز ہنسنے لگے۔

''میاؤں..... میاؤں.....'' بلی کے رونے کی آواز پر شگفتہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

''بھائی یہ کمبخت کیوں بول رہی ہے۔'' شگفتہ نے بابر سے کہا۔''چاچی اس کو آپ کے کباب چاہئیں۔'' منال نے ہنستے ہوئے شگفتہ سے کہا۔

''میں نے تو سنا ہے کہ جب کوئی مرنے والا ہو تو بلیاں اس کے گھر رونے جاتی ہیں، خدا خیر کرے۔'' ریحانہ نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔

''یہ وہم ہے۔پھوپھو.....'' اب حمزہ نے چڑ کر ریحانہ سے کہا۔

''میں جا کر دیکھتا ہوں اس بلی کو..... پتہ نہیں کس بلے کو یاد کر رہی ہے۔''انیق نے جھنجھلا کر کہا جس پر شایان ہنس دیا۔''ماما..... بلی بھگادی ہے۔''

پردہ پھر بھی رو رہی ہے۔انیق نے شگفتہ کی طرف دیکھا۔''چھوڑو دو بچوں یہ شیر خود نہ کھائے.....'' آمنہ نے سوئیٹ ڈش کا ڈونگہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھا۔''تھینکس موم آپ آگئیں..... ورنہ یہاں تو ہم پرستوں کے باب کھول جاتے۔''موسیٰ نے آمنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

ریحانہ صدیقی صاحب کی اکلوتی بہن تھی۔ صدیقی بابر اور ارسلان تین بھائی تھے۔ریحانہ کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے تینوں بھائیوں کی اولاد کو ہی اپنی اولاد سمجھتی تھی۔ایک دن بابر اپنے بچوں (شایان اور منال کے ساتھ پکنک پر گئے باقی خاندان بھی ساتھ تھا جن میں آمنہ اور صدیقی اور ان کے تینوں بچے عینی، حمزہ اور موسیٰ تھے اور ارسلان اس کی بیوی شگفتہ اور اس کا بیٹا انیق تھا۔واپسی پر کار ایکسیڈنٹ میں صدیقی ارسلان اور ریحانہ کے میاں کا انتقال ہوگیا۔تب سے سارے رشتے دار بس اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہوگئے۔آج دس سال بعد جب صدیقی کے سب سے بڑے بیٹے حمزہ کی شادی مقرر ہونے جارہی تھی تو ان رشتوں کا ملاپ دوبارہ ہوا۔

''اپنے حمزہ کی شادی پر ہم عینی کی طرح وہ ویر میرا گھوڑی چڑھیا تو گانے سے رہے۔''دسمبر کی تاریخ رات میں انیق نے لکڑیوں کی مدد سے آگ روشن کی اور ہاتھ سینکتا ہوا بولا۔جناب مجھے پتہ تھا میرے چچیر کے دماغ میں شرارت بھری ہے اس لئے تو گھر کے پیچھے والے حصے میں ارینجمنٹ کیا ہے۔'' موسیٰ نے ہنستے ہوئے وائن کے گلاس نکالے۔''ارے یاد نہیں..... پاپا دیکھ لیں گے یاد نہ کر۔''شایان وائن دیکھ کر گھبرا گیا۔

''بس کر جا.....''انیق نے شایان کی کمر پر مکہ مارا۔

☆.....☆.....☆

''سب اپنی جینز فولڈ کرلو کیونکہ رات کے وقت اس طرف بہت کیڑے ہوتے ہیں۔'' موسیٰ نے اپنے پائنچے فولڈ کیے اور وائن گلاس میں انڈیلی، ساتھ ہی انیق نے اونچی آواز میں گانے چلا دیئے۔

''اک سوہناتے اوتوں کالے وال چھلے چھلے
کھلا پیسہ تے رنج اور گڈی یار تھلے
میرا ڈھولا..... خاندانی نواب اے''

مشہور پنجابی سانگ پر موسیٰ کا بے ڈھنگا ڈانس دیکھ کر شایان ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا کہ اچانک اس کی نظر گھر کے پچھلے دروازے پر پڑی۔ جہاں کوئی سفید شلوار قمیض والا آدمی جارہا تھا۔ ''اس وقت کون ہوسکتا ہے..... موسیٰ وہ آدمی کون ہے۔'' شایان نے موسیٰ کا دھیان اس آدمی کی طرف کیا۔

''کون.....؟ مجھے تو کوئی نہیں دیکھ رہا۔'' موسیٰ نے شایان کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔'' وہ آدمی گھر کے اندر داخل ہوچکا تھا اس لئے شایان نے اس کے پیچھے جانا مناسب سمجھا۔ چلتے چلتے شایان نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر دوڑائی تو پونے دو بج رہے تھے جس پر شایان کا شک گہرا ہوگیا شایان سوچ رہا تھا کہ اگر یہ ڈاکو ہے تو اتنے آرام سے کیسے چل سکتا ہے۔ وہ آدمی لوگوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دوسری منزل پر جانے لگا۔ شایان سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی جانا پہچانا ہے۔ جب ہی تو وہ بڑے آرام سے لوگوں کے درمیان گھوم پھر رہا تھا۔ بہرحال شایان بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ آدمی بنار کے سیدھا حمزہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ حمزہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر چلا گیا۔ شایان بھی کمرے میں داخل ہوا۔

''ارے شایان آؤ..... میں سوچ ہی رہا تھا کہ کس سے داد وصول کروں۔'' کمرے میں حمزہ نکاح کی شیروانی پہن کر چیک کررہا تھا۔ شایان نے چاروں طرف نظر دوڑائی پر کمرے میں حمزہ اور شایان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

''شایان آپ اسموکنگ کرتے ہو.....؟'' حمزہ کے سوال پر شایان چونک گیا۔

''نہیں تو..... میں نے کبھی نہیں کی۔''

''اچھا آپ روم میں آئے تو اسموکنگ کی اسمیل بھی روم میں آگئی اس لئے پوچھا کہ شاید تایا جان سے چھپ کر سگریٹ پی ہو آپ نے.....'' حمزہ نے ہلکا سا ہنستے ہوئے شایان سے کہا۔

''ہماری فیملی میں کوئی نہیں پیتا.....''

''اچھی بات ہے..... میرے ڈیڈ پیتے تھے..... اسموکنگ کرتے تھے وہ موم بتاتی ہیں۔'' حمزہ نے مسکرا کر شیروانی ہینگ کرتے ہوئے کہا۔

''حمزہ.....'' آمنہ نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

''ارے چاچی آیئے نا.....'' شایان نے آمنہ کو دیکھ کر کہا۔ ''میں نے تم دونوں کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟ اصل میں نیچے عینی اور منال ناچ گانا کررہی ہیں لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ رونے کو دل کررہا ہے اور تمہارے ڈیڈ کی بہت یاد آرہی ہے سوچا حمزہ کے پاس جا کر کچھ باتیں کرلوں۔'' آمنہ اپنی ساڑی کا پلو سمیٹ کر حمزہ کے بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''چلیں آپ باتیں کریں میں چلتا ہوں موسیٰ اور انیق ویٹ کررہے ہوں گے۔'' شایان نے حمزہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔ باہر جاتے ہی شایان کو وہ آدمی یاد آیا لیکن پھر اس نے حمزہ کے کمرے میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔ شایان واپس موسیٰ اور انیق کے پاس آگیا۔ وہ دونوں نشے میں چور ہوکر سو چکے تھے۔ شایان باری باری دونوں کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ دونوں کو بیڈ پر لٹا کر خود صوفے پر سوگیا۔

''کل تمہاری بارات جائے گی..... صدیقی ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔'' آمنہ نے حمزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو آمنہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹا ہوا تھا۔

''جی..... لیکن موم مجھے پتہ نہیں کیوں لگ رہا ہے کہ ڈیڈ یہیں ہیں میرے پاس..... آپ کو پتہ ہے کل میرے خواب میں نانوں آئی تھیں۔ شاید میری شادی کی مبارک دے رہی تھیں۔ بہت ہنس رہی تھیں۔''

''اچھا.....؟ آج دوپہر جب میں کچن میں کام کررہی تھی تب مجھے ارسلان بھائی کی پرچھائی نظر آئی

تھی۔ جیسے وہ میرے کچن میں آ کر بھابھی چائے بنادیں کہتا تھا ویسے ہی اچانک سے اس کی پرچھائی محسوس ہوئی۔''

''اوہ..... موم چاچو مرچکے ہیں بھلا وہ کیسے دیکھ سکتے ہیں آپ کو یہ سب وہم ہے اور کچھ نہیں۔'' اب حمزہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر میں ایک کہرام برپا تھا۔ سارے مرد عورتیں ایک چارپائی کے اردگرد بیٹھ کر بین کررہے تھے۔ چاروں طرف رونے اور چیخوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ چارپائی پر کسی کی نقش پڑی تھی۔ سفید کفن میں لپٹی وہ میت جانے کس کی تھی۔ حمزہ جو ہکا بکا چاروں طرف دیکھ رہا تھا ایک کونے میں شایان نظر آیا جو بہت رو رہا تھا۔

حمزہ شایان کے پاس گیا اور پوچھا کہ کون مرگیا ہے لیکن شایان نے کوئی جواب نہ دیا۔ حمزہ نے اس کو دونوں کندھوں سے جھنجھوڑا تو شایان حمزہ کے گلے لگ گیا۔ تیری موم چلی گئی یار.....'' شایان نے روتے ہوئے حمزہ سے کہا جس پر حمزہ کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔

حمزہ پسینے میں شرابور تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑیں دیوار کو تک رہا تھا۔ جب اس کے حواس تھوڑا بحال ہوئے تو اس نے الارم کلاک میں ٹائم دیکھا۔ گھڑی کی سوئیاں 4:15 بجا رہی تھیں۔ حمزہ نے کمبل سائیڈ پر پھینکا اور کمرے کا لاک کھول کر نیچے کی منزل میں جانے لگا۔

باہر ہو کا عالم تھا صدیقی صاحب کی کوٹھی جو دو گھنٹے پہلے رنگینیوں سے بھرپور تھی رات کے سناٹے میں خوف اور ہیبت کی مثال دیکھ رہی تھی۔ حمزہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا شایان کے کمرے پر پہنچا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا حمزہ اندر گیا اور آہستہ سے شایان کو جگانے لگا۔ شایان ایک دم گھبرا گیا تھا۔ حمزہ شایان کا بازو پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ حمزہ نے شایان کو اپنا سارا خواب سنایا۔ حمزہ بہت ڈر گیا، شایان نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ سب بس وہم ہے اور کچھ نہیں۔

لیکن حمزہ کسی طور پر ماننے کو تیار نہ تھا شایان نے اسے سمجھایا اور اس کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔ وہ بچوں کی طرح ڈر رہا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شایان..... یار آپ تو پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہو نا..... آپ مجھے میرے خواب کا مطلب سمجھادو۔'' حمزہ شایان کی طرف رخ کر کے بیٹھ گیا۔

''حمزہ یہ آپ کا وہم ہے۔ کل رات کو آپ چاچو کو یاد کررہے تھے نا تو بس ڈراؤنا خواب آ گیا۔ آیت الکرسی پڑھ کر سوجائیں۔''

''شایان وہاں کوئی ہے.....'' حمزہ نے کمرے میں رکھے کارنر فلاور کی طرف اشارہ کیا۔

''کہاں.....'' شایان نے نظریں دوڑائیں پر اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

''دیکھو۔ وہ آدمی مجھے دیکھ کر ہنس رہا ہے۔'' حمزہ بدستور اشارہ کررہا تھا۔

آدمی کا سنتے ہی شایان کو رات والا آدمی یاد آیا۔ شایان نے لپک کر کارنر فلاور نیچے پھینکا۔ لیکن اس کے پیچھے کچھ نہیں تھا۔ اب شایان کو یقین ہوگیا کہ کوئی نہ کوئی گڑ بڑ ضرور ہے۔ شایان ایک سمجھدار انسان تھا۔ اس نے حمزہ کو بہلا پھسلا کر سلادیا پر خود جاگتا رہا۔

اچانک کمرے میں تیز اسموکنگ کی اسمیل آنے لگی۔ شایان سمجھ چکا تھا کہ یہ وہی اسمیل ہے جو رات میں محسوس ہوئی تھی۔ شایان نے کمرے کا کونا کونا چھان مارا جب اسے یقین ہوگیا کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے تو اس نے گھر کی تلاشی لینے کا سوچا اس نے حمزہ کے دراز سے چاقو نکالا اور ٹارچ لائٹ لے کر آہستہ آہستہ اترنے لگا۔ نیچے کی منزل کی تلاشی کے بعد اس نے مین دروازے کا لاک کھولا۔

لان اور ٹینس گراؤنڈ کا ایک ایک درخت چھان مارا پر کوئی نہ تھا۔ پھر وہ چوکیدار کے سرونٹ کوارٹر میں آ گیا۔ جہاں چوکیدار خراٹے لے کر سو رہا تھا۔

''گارڈ..... اٹھو.....'' شایان نے چوکیدار کو جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ گیا۔

''پتہ ہے..... شادی کا گھر ہے اور آپ اتنے مزے سے سو رہے ہیں۔''

''سر جی دیواروں پر الیکٹرک الارم لگا ہے، اگر کوئی دیوار پھلانگے گا تو الارم بج جائے گا اور کوٹھی کے چاروں اطراف سی سی ٹی وی کیمرے ہیں۔ کوئی بھی چور ڈاکو اس گھر کا رخ کرتے کرتے لاکھ بار سوچتا ہے۔'' چوکیدار نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔

''پھر بھی دھیان رکھو۔'' شایان نے چوکیدار کو آدمی کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ شایان کے بابا بابر اور اس کی چاچی آمنہ کو جگا دیتا جس سے اچھی بھلی ٹینشن کریٹ ہو جاتی تھی۔

اب شایان اوپر کی منزل میں جا رہا تھا وہ ٹارچ لئے بڑی مہارت سے ادھر ادھر جانے لگا۔ کمرے تو سب اندر سے لاک تھے۔ اس لئے وہ مطمئن تھا کیونکہ گھر کے تمام افراد محفوظ تھے جب دوسرے فلور پر بھی کچھ نہ ملا تو اس نے چھت کا رخ کیا۔ چھت بھی مکمل طور پر خالی تھی شایان الجھ کر رہ گیا۔ وہ ٹیرس سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

اچانک اس کی نظر مین گیٹ پر پڑی وہ سفید شلوار قمیض والا آدمی لان سے چہل قدمی کرتے ہوئے باہر کی طرف جا رہا تھا۔ شایان آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھنے لگا۔ وہ آدمی بڑے آرام سے چوکیدار کے سامنے سے ہوتا ہوا گیٹ کے درمیان سے گزر گیا۔ شایان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔

☆.....☆.....☆

''شایان..... اٹھو یار شایان دیکھو کیا ہو گیا۔'' انیق قدرے روتے ہوئے شایان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بولا۔ شایان کو ہوش آ گیا تھا سورج کی تیز کرن سے اس نے اپنی آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ انیق کی روتی ہوئی آواز سن کر شایان اٹھ بیٹھا۔

''کیا ہوا..... ایسے کیوں رو رہا ہے۔ انیق بول نا یار۔'' شایان نے انیق کو جھنجھوڑا۔

''شایان..... شایان.....'' انیق کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''اگر تو اب بھی نہ بولا تو میں نے گلا دبا دینا ہے تیرا۔'' شایان نے انیق کو دھمکی دی۔

''شایان..... وہ..... ح..... ح..... حمزہ..... حمزہ کی ڈیتھ ہو گئی۔'' شایان پر انیق کے الفاظ پہاڑ بن کر ٹوٹے وہ انیق کو آنکھیں پھاڑے دیکھے جا رہا تھا۔

''کیا بکواس کر رہا ہے تو۔'' شایان انیق کو پرے دھکیل کر دوڑتا ہوا نیچے جانے لگا۔

عورتوں کی چیخ و پکار سے صدیقی صاحب کی کوٹھی گونج رہی تھی۔ فرسٹ فلور کے عین وسط میں پلنگ پر حمزہ کی میت پڑی تھی۔ پلنگ کے سرہانے آمنہ اور عینی بیٹھی زار و قطار رو رہی تھیں۔ ایک طرف فرحہ سکتے کی حالت میں بیٹھی تھی جس نے آج حمزہ کی بیوی بننا تھا وہ آج سہاگن بننے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔

شایان سیڑھیوں پر ہی کھڑا ہکا بکا ہو کر میت کو دیکھے جا رہا تھا۔

''ہائے اللہ ایسے نصیب بھی نہ بنائے۔ آج اس کی بارات تھی۔ بے چارہ جوان موت مر گیا۔''

''موت کیسے ہوئی۔ کل تو ٹھیک ٹھاک تھا۔''

''کرنٹ لگنے سے مرا ہے، سنا ہے بہن کا ہیئر اسٹریٹ کرنے لگا تھا۔ ہاتھ گیلے تھے تو کرنٹ لگ گیا۔''

''ہائے بیچارہ۔''

''ارے بہن میں نے تو سنا ہے کل آمنہ بہن کو بلیوں کے رونے کی آوازیں آئی تھیں۔''

''ہاں..... تو بہن انسان جب مرنے لگتا ہے تو آثار دیکھ جاتے ہیں کبھی بلیاں روتی ہیں کبھی ڈراؤنے خواب آتے ہیں اور مردے بھی دیکھتے ہیں۔''

عورتوں کی ملی جلی آوازیں شایان کے کانوں میں پڑیں تو اس کو رات والے واقعات یاد آنے لگے۔ وہ بے یقینی سے ان عورتوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔

کیا واقعی مرنے سے پہلے انسان کو مرنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ سچ ہے یا وہم؟ شایان سوچوں کی وادیوں میں غوطے کھانے لگا۔

جہنمی دروازہ

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:4

قدم قدم پر حیرت و خوف کے لمحات میں لپٹی ہوئی پراسرار داستان اس دروازے کی کہانی جو کہ عرصہ دراز سے بند تھا کیونکہ اگر وہ کھل جاتا تو..... دروازہ کیوں نہیں کھلتا تھا جس کا راز کہانی میں پنہاں ہے

رات کے اندھیرے میں جنم لینے والی داستان جو کہ پڑھنے والوں پر لرزہ طاری کردے گی

"کیا مطلب.....؟" وہ چونکے۔

"قبل از وقت کوئی بات کہنا فضول ہے۔" اس کا جواب تھا: "کسی بھی موضوع کو زیر بحث لانے کے لئے ماحول کا ہونا ضروری ہوتا ہے..... جب وقت آئے گا تو میں خود بتادوں گی.....!!"

یہ کہہ کر وہ دوسری جانب گھوم گئی.....اس کی خراماں چال میں قیامت کی جھمک دکھائی دے رہی تھی۔

نواب انور جیسے اس میں گم ہو کر رہ گئے۔

☆.....☆.....☆

نہ جانے کتنے لمحے اسی طرح گزر گئے، نادر اس کی طرف دیکھ رہا تھا، اس طرح کہ پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"یہ.....یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"آپ نے سنا تو ہے!"

"ہاں.....لیکن تم نے یہ کیوں کہا!!"

"کیونکہ ایسا ہوا ہے.....!!"

"یہ جھوٹ ہے.....غلط ہے.....!!"

"میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا.....!!"

نادر زور سے اچھلا۔

"کیا.....!! تم نے مجھے کس کے ساتھ دیکھا؟"

"ایک عورت تھی.....!!"

یہ سن کر نادر یک بیک ہنسا اور بولا:

"تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا.....!!"

"یہ اسی پارک کی بات ہے۔" سیما ان سنی کر کے بولی: "آپ کی پشت پر نقاب لگائے ہوئے کوئی عورت بھی موجود تھی۔"

"کیوں فضول باتیں کر رہی ہو۔" نادر منہ بنا کر بولا۔ "میں بھلا کسی عورت کو اپنے ساتھ کیوں بیٹھاؤں گا.....!!"

"میں کیا جانوں.....!!"

"اچھا یہ بتاؤ کہ تم اس پارک میں کیسے آ گئی تھیں؟"

"مجھے کسی نے اس بارے میں بتایا تھا۔" وہ گھبرا سی گئی۔

"کس نے؟" نادر نے اسے گھورا۔

"وہ بھی ایک عورت ہے....." سیما بولی: "اس کا نام وحیدہ ہے.....وہ قصبے میں ہی رہتی ہے.....شہر میں کبھی کبھار وہ اپنے بھائی سے ملنے آتی ہے تو یہاں بھی آجاتی ہے۔"

"ہوں.....!!" نادر نے ہنکارا بھرا: "لیکن وہ مجھے کیسے جانتی ہے.....اور اس نے پارک میں مجھے کسی عورت

کے ساتھ کیسے دیکھ لیا!!"

"وہ تو میں نے بھی دیکھا تھا۔" سیما جھٹ سے بولی۔ نادر نے خالی الذہنی حالت میں اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا:

"کیا وہ عورت ابھی شہر میں ہے؟"

"پتا نہیں.....!!"

"اچھا.....تو اس کے بھائی کا گھر کہاں ہے؟"

"یہ بھی مجھے نہیں معلوم.....!!"

"خوب.....!!" نادر نے سر ہلایا: "تم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی ہو اور اس کے کہنے پر تم اس کے ساتھ پارک چلی آئیں.....واہ.....اگر وہ دھوکے سے تمہیں کہیں اور لے جاتی، تو کیا ہوتا.....؟"

سیما پتھر کا بت بن گئی:

"خیر.....!!" نادر دوبارہ بولا: "آئندہ ایسی بے وقوفی مت کرنا.....اس طرح بغیر سوچے سمجھے کسی کے ساتھ مت نکل جایا کرو.....!!"

"جی.....لیکن.....!!" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"ہاں.....بولو.....!!"

"آپ بھی تو اس عورت کے ساتھ بیٹھے تھے.....!!"

"اور میں بول رہا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں تھا.....تو تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کر رہی ہو.....!!"

"میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا.....!!"

"تمہاری آنکھوں نے بھی تمہیں دھوکا دیا ہے.....!!" وہ پراعتماد لہجے میں بولا: "تم میری بیوی ہو اور تم میں کوئی ایسی کمی نہیں ہے کہ میں کسی اور کی طرف راغب ہو جاؤں.....!!"

"مجھ میں نہیں ہے تو گھر میں تو ہے نا.....!!"

"کیا.....؟"

"کمی.....!!"

"کیا مطلب.....؟"

"بچوں کی کمی تو ہے نا.....!!"

"کیا مطلب.....؟" وہ چونکا۔

سیما نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی:

"وحیدہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ اولاد کی محرومی کی وجہ سے کسی اور لڑکی میں دلچسپی لے رہے ہیں.....!!"

نادر کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے:

"وہ کم بخت ہے کون.....؟ اس کی یہ جرأت کیسے ہوئی کہ وہ میرے بارے میں غلط خبریں اُڑاتی پھرے.....!!"

سیما اب بھی خاموش رہی، وہ خود بھی واقعی سوچ میں پڑ گئی تھی کہ آخر وحیدہ کا کیا معاملہ ہے.....!!

"اب تم ایک کام کرو.....!!" نادر سوچ میں گم لہجے میں بولا: "وحیدہ نامی یہ عورت مجھے کسی قسم کی سازش کا حصہ معلوم ہو رہی ہے.....اب اگر وہ میری غیر موجودگی میں گھر پر آتی ہے، تو تم مجھے فوراً ہی اطلاع دو گی.....!!"

"اچھا.....ٹھیک ہے.....!!"

"ہاں جان من.....!!" نادر بولا: "میں اس عورت کے بارے میں پوری طرح معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں.....بس تم صرف یہ کام کرنا کہ وہ جب یہاں آئے تو اسے باتوں میں لگا کر رکھنا، تاکہ مجھے اتنی مہلت مل جائے کہ میں آفس سے یہاں پہنچ جاؤں.....!!"

"جی.....ٹھیک ہے.....!!" سیما بولی۔

"اور ہاں.....!! کسی کے کہنے میں آ کر اپنا دل اور ذہن پراگندہ کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے.....کچھ لوگ آپس میں بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ وحیدہ بھی مجھے اسی نوعیت کی دکھائی دے رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہم لوگوں کو کس طرح جانتی ہے اور یہ کیا چاہتی ہے.....اب مجھے یہی معلوم کرنا ہے.....!!"

☆.....☆.....☆

نہ جانے کیوں یہ رات کافی پراسرار اور خوف ناک دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آسمان کو گہرے سیاہ بادلوں نے پوری طرح گھیرا ہوا تھا اور رات کی اس گہری تاریکی میں یہ حویلی بھی شاید اس رات کو مزید بھیانک بنانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔

حویلی کے خال خال حصوں سے روشنی جھانکتی ہوئی اس اندھیرے کو شکست دینے کی ناکام ترین کوشش میں

مصروف تھی.....!!وگرنہ حویلی کا زیادہ تر حصہ تاریکی میں ہی ڈوبا ہوا تھا۔ پرہول قسم کا سناٹا چاروں طرف چھایا ہوا تھا.....اچانک ہی اس سناٹے کو ایک عجیب سی آواز نے چیر کے رکھ دیا.....!!

ہاں.....!! یہ آواز تھی تیز قسم کی سانسوں کی..... جیسے بہت دور کی مسافت کسی نے تیز دوڑتے ہوئے طے کی ہو.....اور پھر بے دم ہو کر گر جانے کی صورت میں تنفس کا جو حال ہوتا ہے.....یہ آواز اسی قسم کی تھی.....!!

یقیناً یہ اسی اندھے کنوئیں سے گونج رہی تھی، جو کہ حویلی کے کھلے حصے میں واقع تھا.....!!

عین اسی وقت ایک چھوٹا سا سایہ کسی جانب سے نمودار ہوا، وہ جیسے لڑھک لڑھک کر چل رہا تھا۔ اگر اس سائے کی جسامت تھوڑی اور چھوٹی ہوتی تو یقیناً اس پر کسی فٹ بال کا گمان ہو سکتا تھا۔

بہر حال یہ بونا سایہ تیزی سے اندھے کنوئیں کی جانب لپکا اور چشم زدن میں ہی کنوئیں میں کود پڑا۔

سانسوں کی آوازیں مزید بلند ہونے لگیں۔

''نماشا.....!! نماشا تم آ گئیں.....؟'' سانسوں کے درمیان ابھرنے والی یہ آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''ہاں..... خاموش.....!!'' یہ بونے سائے کی نسوانی آواز تھی: ''میں تیرے در پہ حاضر ہوں.....!!''

''کہہ نماشا.....!! تو کیا خبر لائی ہے.....؟''

''ابھی تو میں خود اندھیرے میں ہوں نالوش.....!!'' نماشا کی آواز میں درد تھا: ''میں روشنی کی مسلسل تلاش میں ہوں.....!!''

''تو کیا میں اسی طرح گھٹ گھٹ کے دم توڑ دوں؟'' نالوش بولا۔ ''نہیں جان نماشا.....!!'' وہ تڑپ گئی: ''میں اپنی تمام طاقتوں کو بروئے کار لے کر آؤں گی.....!!''

''لیکن ایسا کب ہوگا.....؟''

''بہت جلد نالوش.....!!'' نماشا بولی: ''بہت جلد ہم دونوں پھر سے یکجا ہوں گے.....!! بس میں مناسب طریقے سے یہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں..... مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں.....اس کا نتیجہ اتنا بہترین آئے گا کہ تم خود مجھے داد دو گے.....!!''

''دیکھ لو نماشا.....!! کہیں ایسا نہ ہو کہ.....''

''بس.....!!'' نماشا نے ہاتھ اٹھایا: ''اب مایوسی کی باتیں مت کرو.....!! تم تو اتنے طاقتور ہو.....پھر بھی ایسی باتیں کر رہے ہو.....!!''

''ہاں..... یہ حقیقت ہے کہ میں اب مایوس ہو چکا ہوں.....!!''

''لیکن مجھے پوری امید ہے کہ میں تمہیں آزاد کروالوں گی.....!! میں نے چاروں طرف جو جال بچھایا ہے.....اس میں جب وہ لوگ آ کر جکڑے جائیں گے، تو تمہارا راستہ خود بہ خود کھل جائے گا.....بس تھوڑا سا انتظار..... اور پھر لامتناہی آزادی.....ہمیشہ کے لئے.....!!''

☆.....☆.....☆

اسی دن شام کے وقت نواب انور نے نقاب پوش کے بارے میں دلاور کو آگاہ کر دیا تھا، ساتھ ہی وہ بولے:

''وہ بے چاری کافی مصیبت زدہ ہے.....اس کا خاص طور پر خیال رکھنا اور وہ اسی حویلی میں رہائش اختیار کرے گی.....!!''

''جی بہتر.....!!''

''ہاں.....!! اسے ایسا کمرہ دینا کہ جس میں وہ ذرا محفوظ رہے اور رات میں مطمئن ہو کر سو سکے.....!!''

''جیسا آپ کا حکم، سر آنکھوں پر.....!!''

دلاور سر کو خم کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا.....

دوسرے دن شام کے وقت نواب انور ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے کہ دروازے پر آہستگی سے کسی نے دستک دی۔ انہوں نے سر اٹھایا:

''کون ہے.....!! اندر آ جاؤ.....!!''

اور پھر آنے والے کو دیکھ کر وہ بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے: ''تم.....تم آ گئیں.....؟''

وہی نقاب پوش ان کے سامنے موجود تھی.....وہ آہستہ سے ہنسی:

''میں تو صبح سے ہی حویلی میں موجود ہوں جناب.....!!''

''ارے.....!!'' وہ چونکے: ''مجھے تو اس بارے میں معلوم ہی نہیں ہے.....''

''آپ صرف نام کے نواب ہیں کیا.....؟'' وہ برجستہ بولی۔

''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ ہے کہ آپ نے کل اپنا حکم صادر کردیا تھا.....!! ہے نا.....؟''

''ہاں..... میں نے اپنے ایک وفادار کو تمہارے بارے میں بتایا تھا.....!!''

''بس.....تو پھر اس پر عمل ہوگیا.....!!'' وہ چہک کر بولی۔ ''میں صبح یہاں آئی اور آپ کا حوالہ دیا تو مجھے فوراً ہی حویلی میں رکھ لیا گیا.....!! اب میں اپنا کمرہ دیکھ کر آرہی ہوں.....!!''

''اچھا..... واہ بھئی.....!!'' نواب انور کے منہ سے نکلا: ''دلاور نے تو بڑی تیز رفتاری دکھائی.....!!''

''آپ کا سکہ چلتا ہے نواب صاحب.....!!''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، اچانک ہی دروازے پر دستک ہوئی اور وہ دونوں چونک اٹھے:

''یہ..... یہ کون آ گیا.....؟'' نواب انور بڑبڑائے۔

''دلاور ہوگا.....!!'' وہ بولی: ''میں باتھ روم میں چھپ جاتی ہوں۔ آپ اسے بلالیں.....لیکن میری کوئی بات مت کیجئے گا.....!!''

''کیوں.....؟''

''ارے نواب صاحب.....!!'' وہ آہستہ سے بولی: ''اپنے وقار کو سلامت رکھیں..... میں معمولی سی عورت ہوں.....میرے متعلق کوئی بات کرکے آپ ملازموں کے سامنے اپنی قدر نہ کھوئیں.....!! بس آپ نے حکم کردیا، جسے پورا کرنا ان لوگوں کا فرض تھا..... بات.....ختم..... اب میں جاتی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

نواب صاحب نے آواز لگادی:

''کون ہے.....آجاؤ.....!!''

فوراً ہی دلاور نمودار ہوا.....!! وہ غور سے نواب انور کی طرف دیکھ رہا تھا:

''کیا ہوا دلاور.....؟''

''کیا آپ آرام کررہے تھے؟''

''نہیں.....!! تم بولو.....!!''

''سرکار.....!! میں ایک بار پھر اپنے گوٹھ جانا چاہتا ہوں.....!!''

''کیوں بھئی.....؟''

''میرے بیٹے کی طبیعت پھر سے بگڑ رہی ہے.....!!''

''اوہ.....اچھا.....!!'' وہ چونکے: ''کیا تمہارے گوٹھ میں کوئی ڈاکٹر موجود ہے؟''

''ہاں جی.....ایک ڈسپنسری ہے.....سب کو وہیں سے دوا ملتی ہے۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''ہوں.....!! اچھا اب تم ایک کام کرو.....!!''

''جی.....میں طابع دار.....!!''

''تم اپنے بیٹے کو فوراً یہاں لے آؤ..... میں خود اس کا علاج کرواؤں گا..... جب وہ بالکل صحت یاب ہوجائے تو تم اسے گوٹھ واپس لے جانا.....!!''

''جو حکم سرکار.....!!'' دلاور نے سر کو خم کیا: ''میں اسے لے آتا ہوں۔''

پھر دلاور وہاں سے چلا گیا تھا.....نواب انور نے کچھ سوچا اور پھر بلند آواز میں بولا:

''کہاں ہو.....آجاؤ.....!!''

فوراً ہی دروازہ کھلا اور نقاب پوش نمودار ہوئی۔

نواب انور نے کہا:

''تم نے اب تک اپنا نام نہیں بتایا.....!!''

یہ سن کر نقاب پوش نے اپنا چہرہ عریاں کردیا..... بلاشبہ ان آنکھوں کی طرح چہرہ بھی بے حد حسین و جمیل تھا.....!!

یوں لگ رہا تھا جیسے پورا چاند اپنی آب و تاب کے ساتھ اس کمرے میں اتر آیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی اس کے یاقوتی ہونٹ ہلے:

"میرا نام نما شا ہے.....؟؟؟"

نواب انور اس کے حسین پیکر میں اس طرح گم تھے کہ وہ اس کے الفاظ سن نہ سکے، اس لئے فوراً بولے:

"کیا.....!! تم نے کیا کہا.....؟"

"میں نے اپنا نام بتایا تھا۔"

"اوہ.....کیا نام ہے تمہارا.....؟"

"سارہ.....!!"

"خوب.....!! اچھا نام ہے.....!!"

"شکریہ.....!! اب میں جاؤں.....؟"

"کہاں جاؤ گی.....؟"

"فی الحال میرے ذمے حویلی کی صفائی ستھرائی کا کام لگایا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "ابھی کام باقی ہے..... اس کے بعد ہی مجھے وہ کمرہ نصیب ہوگا.....!!"

"اچھا.....!! تمہیں کون سا کمرہ دیا ہے.....؟"

"ابھی تو میں بتا نہیں سکوں گی..... البتہ باہر نکل کر میں ضرور وہاں کا رخ کر سکتی ہوں.....!!"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"آپ کی حویلی بہت بڑی ہے نواب صاحب.....اور میں نو وارد ہوں.....اس لئے فی الحال راستہ ذہن نشین کر لیا ہے....."

"ٹھیک ہے..... میں رات میں تم سے ملنا چاہتا ہوں.....!!"

"تو پھر آپ باغیچے میں تشریف لے آیئے گا....." اس نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میں آپ سے وہیں ملتی ہوں.....!!"

"ٹھیک رہے گا.....!!" وہ خوش ہو کر بولے: "کیا تم وہاں گرما گرم چائے بھی بنا کر لا سکتی ہو.....؟"

"ضرور.....!!" جواب ملا: "میں تھرماس میں چائے بھر کر لے آؤں گی..... تاکہ اگر آپ کو دیر سویر ہو جائے تو چائے گرم رہے.....!!"

"تم واقعی بہت عقل مند ہو.....!!"

سارہ نے سر کو خم کیا اور ایک دلکش سی مسکراہٹ نے نواب انور کو نڈھال سا کر دیا۔

☆.....☆.....☆

نادر اس وقت اپنے آفس میں ہی موجود تھا..... اچانک ہی ٹیلی فون کی بیل بج اٹھی۔

نادر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی فائل ایک طرف رکھی اور ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا:

"ہیلو میں نادر بول رہا ہوں.....!!"

"میں سیما ہوں.....!!" دوسری طرف سے سیما کی دبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "آپ فوراً ہی گھر آ جائیں.....!!"

"کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟"

"وحیدہ آئی ہوئی ہے....."

"اوہ.....!!" نادر کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ جلدی سے بولا:

"تم اسے باتوں میں لگائے رکھو..... میں بس یہاں سے نکل رہا ہوں.....اوکے.....!!"

"جی.....ٹھیک ہے.....!!"

نادر نے فوراً ہی ریسیور کو کریڈل پر پٹخا اور اٹھ کر دروازے کی طرف گویا دوڑ لگا دی۔

جلد ہی وہ اپنے ایک کولیگ کو گھر جانے کے بارے میں آگاہ کرنے کے بعد تیز تیز قدموں سے پارکنگ کی طرف بڑھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس کی کار ایک چوڑی سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی کافی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی.....!!

☆.....☆.....☆

سیما اپنے خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ اچانک ہی کال بیل کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

وہ فوراً ہی دروازے کی طرف بڑھی:

"کون ہے.....؟"

"وحیدہ.....!!" جواب ملا۔

"نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک اٹھا، لیکن دروازہ تو کھولنا ہی تھا..... چنانچہ اس نے آہستگی سے ایک

پٹ کھول دیا۔

سامنے وحیدہ موجود تھی اور عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سیما نے ٹٹولنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر ایک جانب ہو کر اسے راستہ دیتے ہوئے بولی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.....؟ آؤ..... اندر آجاؤ.....!!"

وحیدہ اندر آ گئی..... سیما دروازہ بند کرنے کے بعد پلٹی ہی تھی کہ وحیدہ کی سانپ جیسی پھنکارتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

"تم نے اپنے میاں کے سامنے میرا تذکرہ کیوں چھیڑا.....؟ بتاؤ..... مجھے جواب دو.....!!"

یہ سن کر سیما سناٹے میں آ گئی..... وحیدہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی۔

واقعی یہ حقیقت تھی کہ اس وقت سیما کو اپنے وجود میں سنسنی اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ نہ جانے وحیدہ کے چہرے اور لہجے میں کیا بات تھی کہ وہ اسے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

یک بیک وحیدہ ہنس پڑی اور اس کے کاندھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"ارے..... میں تو مذاق کر رہی تھی..... آؤ..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔

سیما نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اب یہ بھی ضروری تھا کہ وہ نادر کو اس بات کی اطلاع دے تاکہ وہ موقع پر پہنچ سکے۔

کل ہی تو اس نے نادر کے سامنے وحیدہ کے بارے میں انکشاف کیا تھا۔ اور آج وحیدہ نے آخر اسی بارے میں سیما سے دریافت کیا تھا یہ بات وحیدہ کو کس طرح معلوم ہوئی۔

اس وقت شرفو بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ گھر کے ہی کسی کام سے باہر نکلا ہوا تھا۔

ڈرائنگ روم میں آ کر وحیدہ بولی۔

"کیا ہوا.....؟ کیا تم ناراض ہو گئیں.....؟"

"نہیں....." وہ بولی۔ "میں صرف یہ سوچ رہی ہوں کہ تمہیں یہ بات کس طرح معلوم ہوئی کہ میں نے نادر کو تمہارے بارے میں بتا دیا ہے۔"

"ارے وحیدہ بری طرح چونکی۔" تو کیا واقعی تم نے اپنے شوہر کو سب کچھ بتا دیا۔

اوہ وحیدہ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ میں تو م سے یونہی مذاق کر رہی تھی۔ اب مجھے کیا معلوم کہ یہ واقعی ہو چکا ہے۔

پھر تمہارے شوہر نے کیا کہا.....؟"

کچھ نہیں۔ سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔ مجھے چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا آپ بھی چائے پینا پسند کریں گی۔"

نہیں وہ بولی۔ "تم اپنے لئے بنالو جاؤ۔"

سیما فوراً ہی وہاں سے نکلی اس کا رخ ڈائننگ روم کی طرف تھا۔ جہاں ٹیلے فون سیٹ رکھا ہوا تھا۔

اس نے فوراً ہی نادر کے نمبر ملائے اور اسے جلدی جلدی وحیدہ کے بارے میں بتا کر ریسیور رکھ دیا۔

اور پھر جیسے ہی وہ پلٹی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وحیدہ دروازے پر کھڑی ہوئی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کافی عجیب سی مسکراہٹ تھی اس کے چہرے پہ

"تم نے بلا لیا اپنے شوہر کو۔" وحیدہ کے ہونٹ ہلے۔

"آں..... ہاں....." سیما ہونٹوں پہ زبان پھیر کر بولی۔

"تم نے اپنے لئے خود گڑھا کھودا ہے لڑکی....."

"وحیدہ بولی۔" میں تو تمہاری اچھائی کی غرض سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن تم نے اپنے شوہر کو میرا ہی دشمن بنا دیا۔ میں جا رہی ہوں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تم قصبہ جلال پور میں جا کر اس بابا سے نہ ملیں۔ تو تمہیں تباہ ہونے سے کوئی بچا نہ سکے گا۔ تم اپنے شوہر سے ابھی واقف نہیں ہو جب تمہیں اس کے اصل روپ کے بارے میں معلوم ہوگا۔ تو اس وقت تمہیں میری باتیں یاد آئیں گی اور اب میں جا رہی ہوں..... اب میں کبھی تم سے نہیں ملوں گی اور کبھی تمہارے

گھر نہیں آؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ وقت آنے پر تم ضرور پچھتاؤ گی ہاں بہت جلدی وہ وقت آئے گا۔"

یہ کہہ کر وہ گھومی اور چلی گئی۔ سیما بھی جلدی سے کمرے سے باہر نکلی۔ لیکن وحیدہ جا چکی تھی اور صدر دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا۔

سیما ہکا بکا رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

نادر نے کافی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دس منٹ کے اندر ہی اپنی گلی میں داخل ہو چکا تھا۔

اسی وقت نادر کی نظر اپنے گھر کی طرف اٹھی اور وہ چوکنا ہو گیا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس طرف سے ایک نقاب پوش عورت تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

بڑی تیزی دکھائی نادر بڑبڑایا۔

یقیناً یہ ہی وحیدہ تھی۔ ہاں سیما نے بتایا تھا کہ وہ پھولدار چادر اوڑھ کر اس پہ نقاب لگاتی ہے۔

اب کار کو بیک کرنے کا مسئلہ تھا۔ اسے گلی کے کونے تک جانا پڑتا اس میں ڈر تھا کہ کہیں وحیدہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ چنانچہ نادر نے کار کو ایک طرف روکا اور جلدی سے باہر نکل آیا۔

اب وہ دور جاتی ہوئی وحیدہ کے پیچھے گویا دوڑ لگا رہا تھا۔

وہ روڈ پر پہنچ کر ایک رکشہ روک چکی تھی۔ نادر نے بھی بوکھلا کر قریب سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی اور اس میں بیٹھ گیا۔

"کہاں جاؤ گے صاحب.....؟" ڈرائیور نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"اس رکشے کے پیچھے....." نادر نے اشارہ کیا مجھے دیکھنا ہے کہ یہ عورت کہاں جاتی ہے۔

ڈرائیور نے معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو نادر جلدی سے بولا۔

"ارے وہ میری واقف کار ہے.....تم اپنا کرایہ اضافی لے لینا۔"

یہ سنتے ہی ڈرائیور کی آنکھوں میں چمک ابھری وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"جیسے مرضی صاحب....."

"ہاں.....شاباش.....بس خیال رکھنا کہ اسے شک نہ ہو۔"

"آپ فکر نہ کرو صاحب.....میں نے جاسوسی کہانیاں بہت پڑھی ہیں۔"

"گڈ....." نادر خوش ہو گیا۔

اور پھر تعاقب شروع ہو گیا۔ ٹیکسی کا ڈرائیور کافی ہوشیار تھا۔ اور مناسب فاصلہ رکھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔

کافی دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ نادر نے محسوس کیا کہ رکشہ اب گنجان آبادی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک نو آباد علاقے میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ ایسا علاقہ تھا جہاں بہت کم اور فاصلوں سے گھر بنے ہوئے تھے۔ رکشہ ایک گلی کے کونے پر رک گیا نادر نے ٹیکسی والے کا بھی کندھا بادیا۔

"روک دو۔" اس نے مڑ کر پوچھا۔

"ہاں....."

ادھر وحیدہ بھی رکشے سے اتر چکی تھی۔ نادر نے جلدی سے جیب سے بٹوہ نکال کر اس کی طرف پیسے بڑھا دئے۔

"کیا میں بھی رکوں؟" ڈرائیور نے پیسے لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تم جاؤ۔"

نادر نے کہا اور ٹیکسی سے باہر نکل آیا۔ وحیدہ گلی میں داخل ہو کر ایک گھر کے دروازے پر کھڑی تھی۔

جلد ہی دروازہ کھلا اور وحیدہ اندر داخل ہو گئی۔ دروازہ بند ہو چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

شرفو کچھ دیر قبل ہی واپس آیا تھا۔ اس نے سیما سے پوچھا۔

"صاحب کہاں گئے.....؟"

"کیوں.....؟" سیما نے چونک کر پوچھا۔

"ان کی کار تو گلی میں کھڑی ہے۔"

"اچھا....." وہ رواداری میں بولی۔ "تو وہ کار میں نہیں تھے۔؟"

"نہیں....."

"اوہ....." وہ بولی۔ "ہوسکتا ہے کہ انہیں اچانک کچھ یاد آ گیا ہو..... جاؤ تم کار کو پورچ میں لے آؤ۔"

شرفو چلا گیا..... سیما کی آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں..... اب ظاہر ہے کہ وہ شرفو کو کیا بتاتی۔

بہر حال اب وہ اس بات کے لئے متفق تھی کہ اگر نادر اسی کے پیچھے گیا ہے۔

نہ جانے کیوں اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

نادر آج فیصلہ کن انداز میں ہی نکلا تھا۔ چنانچہ اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اسی دروازے پر دستک دے ڈالی۔

قدموں کی آہٹ ابھری اور دروازہ کھل گیا۔ ایک جھپکی سی نادر کی آنکھوں میں لہرا کر رہ گئی۔

وہ اتنی ہی حسین تھی۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے نادر کو دیکھ کر بولی۔

"جی فرمائیے....."

"مجھے وحیدہ صاحبہ سے ملنا ہے....."

وہ قدرے چونکی اور بولی۔

"میرا نام ہی وحیدہ ہے....."

"میں سیما کا شوہر ہوں۔"

وہ چونک سی گئی۔

"اوہ..... آجائیں..... اندر آئیں....."

وہ اسے ایک کمرے میں لے آئی۔ جہاں کافی پرانا اور مختصر سا سامان موجود تھا..... نادر دیک کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"سیما تو کہہ رہی تھی کہ وحیدہ ایک بوڑھی عورت ہے....." وہ بول اٹھا۔

وحیدہ مسکرائی اور بولی۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی اور وحیدہ ہو۔"

"کیا تم مجھے جانتی ہو.....؟"

"ہاں....."

"تم نے سیما سے میرے متعلق غلط بیانی کیوں کی ہے؟"

"کیسی غلط بیانی....."

"اب یہ بھی بتانا پڑے گا۔"

جو بات مجھے نہیں معلوم..... وہ تو بتانا پڑے گی....." وہ اٹھلا کر بولی۔

اس وقت نادر کو وہ اور بھی حسین دکھائی دی۔ پھر وہ آہستہ سے بولا۔

"تم نے سیما سے کہا کہ میرا کسی سے چکر چل رہا ہے، اور تم نے اسے ساتھ لے جا کر دکھایا بھی ہے کہ میں کسی عورت کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوں۔

"اوہ..... تو بات یہاں تک پہنچ گئی۔" وہ طویل سانس لے کر بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"دراصل اولاد نہ ہونے کی وجہ سے سیما کافی دنوں سے ذہنی دباؤ کا شکار ہے۔ وہ آپ کی طرف سے بھی خوف زدہ ہے کہ کہیں آپ اس محرومی کی وجہ سے کسی اور کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ بہر حال میری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہے اور نہ ہی میں کوئی بوڑھی عورت ہوں۔"

نادر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ عورت تو سیما کے بالکل برعکس بات کر رہی تھی۔

"لیکن اس نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ....."

"ہاں بالکل کہا ہوگا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"اکثر مجھ سے بھی عجیب عجیب سی باتیں کرتی ہے، مجھے واقعی اسو پر بہت ترس آتا ہے۔ آپ اس کو کہیں گھمانے پھرانے کے لئے لے جاؤ....."

"ہاں..... میرا پروگرام تو ہے۔" وہ سر ہلا کر بولا۔

"کیا تم اسی گھر میں رہتی ہو۔"

"نہیں....."

"یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے؟"

"ہاں..... آپ کو کیسے معلوم ہوا.....؟"

''مجھے سیمانے بتایا تھا کہ تم بھی جلال پور میں رہتی ہو اور اکثر اپنے بھائی کے گھر آجاتی ہو.....''

''بالکل درست ہے.....'' وہ جلدی سے بولی! تو پھر آپ آرہے ہیں جلال پور.....؟ میں بھی اب جاؤں گی وہاں۔

''ہاں جانا تو ہے۔''

''میں وہاں پرانی بلڈنگ میں رہتی ہوں۔ وہ بولی۔

''جب آپ وہاں آئیں تو مجھ سے ملنے ضرور آیئے گا۔ میں انتظار کروں گی۔''

''کیوں.....؟''

''بس یونہی.....'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ آپ سے باتیں کرنا مجھے کافی اچھا لگا۔

''ہوں..... اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے بھائی کہاں ہیں؟''

''کام پر۔''

''اور کوئی نہیں ہے۔''

''نہیں اسی وجہ سے تو میں یہاں کے چکر لگاتی ہوں، تاکہ اپنے بھائی کی کچھ خدمت ہی کرسکوں۔''

''اوہ..... تو وہ کنوارا ہے.....''

''نہیں..... رنڈوا.....''

''اوہ..... اچھا.....''

''ہاں..... وہ دوسری شادی کے لئے بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ اسے اپنی بیوی سے بہت پیار تھا۔''

''اچھا..... اب میں چلوں؟''

''ضرور..... ارے میں نے کھانے پینے کو تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔''

''ضرورت نہیں.....'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر کبھی سہی..... مجھے بھی تم سے گفتگو کرتے ہوئے اچھا لگا..... پھر ملتے ہیں جلال پور میں.....

ضرور وہ مسکرائی۔

وہ گہری نظروں سے نادر کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر نادر بھی مسکراتے ہوئے باہر نکل آیا۔

اس کا رخ سڑک کی طرف تھا۔ عین اسی وقت قریب سے گزرتے ہوئے ایک بڑے میاں نے اسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

وہ قدرے حیرت سے بڑبڑائے۔

''ارے..... یہ نوجوان اس خالی مکان میں کیا کررہا تھا۔ یہ گھر تو آسیب زدہ ہے۔''

ان کی ہلکی آواز نادر تک نہ پہنچ سکی۔

☆.....☆.....☆

نواب انور حویلی کے کھلے حصے میں نکل کر آئے تو ایک سایہ مسلسل ان کے عقب میں متحرک رہا۔ لیکن وہ اس وجود سے قطعی بے خبر تھے۔

البتہ وہ اپنے اردگرد ضرور دیکھ رہے تھے..... لیکن حویلی کے اندر اس وقت انتہائی رات کا یہ پہر پوری طرح سناٹے اور اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

نواب انور دبے پاؤں باغیچے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اور وہ سایہ اب بھی ان کے تعاقب میں دکھائی دے رہا تھا۔

باغیچے میں بھی رات اپنے عروج پر تھی۔ حویلی کے اوپری میناروں سے پھوٹنے والی روشنی کی بدولت یہاں کا منظر بے حد خوابناک دکھائی دے رہا تھا۔ تیز ہواؤں کے شور کے ساتھ جھومنے والے درختوں اور پودوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

نواب انور ایک مخصوص بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ سایہ بھی اب ایک درخت کی آڑ لے چکا تھا۔

کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ نواب انور متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

سارہ نے رات میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اور پھر وہ واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اچانک وہی سایہ درخت کی آڑ سے نکلا اور نہایت اطمینان سے چلتا ہوا نواب انور کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ان کے منہ سے نکلا۔ ''سارہ..... تم..... آگئیں.....''

☆.....☆.....☆

سیما نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں، نادر کے دونوں ہاتھوں نے اس کا چہرہ تھاما ہوا تھا۔

اسی بناء پر سیما کی نیند ٹوٹی تھی، اس نے حیرت سے نادر کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا.....؟"

"کچھ نہیں....." وہ مسکرایا۔ سوتے ہوئے تم کافی حسین لگ رہی تھیں۔

"اوہ.....اچھا.....!"

'ہاں.....سیما....." وہ سر ہلا کر بولا۔ "میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں.....بے حد....."

"آپ کے لئے چائے بناؤں....."

"ہاں بنا دو....." وہ انگڑائی لے کر بولا۔ آدھی رات گزر چکی ہے لیکن آج نیند نہیں آ رہی۔"

"کوئی خاص وجہ....."

"نہیں.....بس یونہی۔"

"کسی کی یاد تو نہیں آ رہی؟" سیما نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

نادر قدرے چونکا اور پھر ہنستے ہوئے بولا۔

"تم ساتھ ہو تو تمہاری یاد کیسے آئے گی۔"

"کوئی اور ہو....."

"پھر وہی بات....."

"اچھا سوری" وہ جلدی سے بولی۔

پھر اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

نادر نے اس کی طرف غور سے دیکھا پھر بولا۔

"ہاں.....پھر میں تمہیں ایک خبر سناتا ہوں۔"

"کیسی خبر....."

"پہلے گرما گرم چائے.....پھر....."

"بتا دیں نا....."

"ارے میری جان.....بتا دوں گا.....لیکن پہلے چائے....."

"اف.....!!"

یہ بولتے ہوئے سیما کمرے سے نکل گئی۔ جلد اس کے جاتے ہی نادر کے چہرے پہ تفکر کے آثار نمودار ہو گئے، وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لی اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

سیما نے چائے تیار کی اور کمرے میں آ کر ایک کپ نادر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اب تو بتا دیں....."

نادر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ چائے کا ایک سپ لیا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

"پرسوں ہم جلال پور جا رہے ہیں.....!! میں نے اپنے باس سے چھٹیاں لے لی ہیں۔"

☆.....☆.....☆

وہ نقاب میں چھپے ہوئے چہرے کے ساتھ نواب انور کے سامنے موجود تھی۔ اور حویلی کی دیواروں سے منعکس ہو کہ اس کی خوب صورت آنکھوں کی چمک جیسے ماحول کو خیرہ کر رہی تھیں۔

"جی.....میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

پھر وہ ان کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ گئی تو وہ بولے۔

"ہاں لیکن وعدہ ابھی ادھورا ہے۔"

"مطلب؟"

"وعدہ اس وقت پورا ہو گا۔ جب میں تمہارا چہرہ دیکھوں گا۔"

"اوہ.....!" اس کے منہ سے نکلا۔

ساتھ ہی اس کا ایک ہاتھ نقاب کی طرف بڑھا.....اگلے ہی لمحے جیسے بجلی سی کوند گئی۔

اتنی عمر گزار دینے کے بعد اب تک اتنا حسین چہرہ نواب صاحب کی نظروں سے شاید کبھی نہیں گزرا تھا۔

چند لمحوں کے لئے وہ مبہوت سے ہو کر رہ گئے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں۔" وہ پوچھ بیٹھی۔

"تم ناراض ہو جاؤ گی۔"

"نہیں.....آپ بتائیں....."

"تم بہت خوب صورت ہو....."

"ارے نہیں..... وہ نہیں....." یہ تو آپ کا حسن نظر ہے، ورنہ میں کسی قابل ہوں۔"

پھر اچانک ہی وہ زور سے چونکی۔

"کیا ہوا.....؟ نواب صاحب نے بھی چونک کر ہی پوچھا تھا۔

"میں چائے تو لانا بھول ہی گئی۔" وہ بولی۔

"ٹھہریں میں لے کر آتی ہوں....."

"اب چھوڑو....." وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "تم سے باتیں کرنے میں ہی اتنا مزا آرہا ہے۔ ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی۔"

"نہیں..... میں نے وعدہ کیا تھا اور آپ کی فرمائش بھی تھی۔"

"میں ابھی آئی....." وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ فوراً ہی درختوں کے عقب میں غائب ہوگئی..... اب وہاں نواب انور اکیلے تھے۔

عین اسی وقت کسی جانب سے بوڑھے مالی بابا نمودار ہوگئے۔ وہ حیرت سے نواب انور کو دیکھ رہے تھے۔

"ارے..... نواب میاں..... اپ رات کے اس پہر یہاں..... خیریت تو ہے؟"

"جی بابا..... سب ٹھیک ہے..... وہ مسکرائے۔ بس ذرا نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا کہ ذرا باغ کی تازہ ہوا لی جائے۔"

"اوہ..... اچھا....." وہ سر ہلا کر بولے۔ میں تو یونہی اس طرف نکل آیا تھا۔ دراصل رات میں کبھی کبھار شریر بلیاں یہاں آکر آپس میں خوب گتھم گتھا کرتی ہیں۔ اسی خیال سے میں اکثر یہاں رات میں چکر لگا لیتا ہوں..... ورنہ ان کی مسلسل لڑائی باغیچے کو برباد کر کے دے۔"

"ابھی تو کچھ ایسا نہیں ہے۔ نواب انور فوراً بولے۔ آپ جا کر آرام کریں....."

"اچھا....."

"ہاں..... ویسے ایک بات ہے....."

"وہ کیا نواب میاں....."

"آپ اپنے کام کی بڑی فکر رکھتے ہیں..... اس باغ کا رات کو بھی خیال رکھنا واقعی بڑی بات ہے۔" نواب انور نے دل سے تعریف کی۔

وہ مسکرائے اور بولے۔

"میں نے تو زندگی کا سارا وقت ہی اس باغ کو دے دیا۔ اب میں اس طرح خیال نہ رکھوں تو کیا کروں..... میری حیات میں اب اور کیا رہ گیا ہے۔"

"یہ بھی بات ہے..... بہر حال میں آپ کی کار کردگی سے بہت خوش ہوا ہوں....."

"اس طرح میر محنت وصول ہوگئی۔" مالی بابا نے پر مسرت لہجے میں جواب دیا۔

پھر وہ جیسے ہی واپسی کے لئے پلٹے، دوسری جانب سے سارہ نمودار ہوگئی، اس کے ہاتھ میں ایک کپ چائے دکھائی دی۔

"ارے..... تم نہیں پیو گی؟"

"میں چائے نہیں پیتی....." وہ قدرے منہ بنا کر بولی۔ "مجھے فوراً ہی ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔"

"اوہ..... اچھا....." وہ بولے۔

چائے واقعی بے حد شاندار تھی....." سارہ غور سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب..... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں....."

"ہاں..... بولو....."

"کیا آپ کو جہنمی دروازے کے بارے میں کچھ معلوم ہے.....؟" سارہ نے اچانک ہی پوچھا۔

نواب انور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب.....؟"

"میرا مطلب ہے کہ حویلی کے اس اہم راز کے بارے میں آپ کو کیا بتایا گیا ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو.....؟"

"میں صرف جاننا چاہتی ہوں کہ حویلی کے مکینوں نے آپ کو کیا بتایا ہے، جہنمی دروازہ کے متعلق؟"

"لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس کی کوئی خاص وجہ؟"

"وہ کیا.....؟"

"پہلے میں یہ جاننا چاہوں گی کہ آپ کیا جانتے ہیں....."

"تہہ خانے میں کوئی عفریت قید ہے۔" وہ بولے۔

یہ سن کر سارہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"اچھا جی....."

"ہاں.....تو کیا تمہیں یہ بات نہیں معلوم؟"

"جی.....میں جانتی ہوں....."

"تو پھر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ کیا تم جلال پور میں نہیں رہتیں.....؟"

"رہتی ہوں.....جب ہی تو پوچھا ہے....."

"یہ کیا بات ہوئی.....؟" وہ الجھ کر بولے۔

"آئیں.....میں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں....."

"پہلے تم دروازے والی بات کرو....."

"وہیں بتاؤں گی۔"

نواب صاحب خاموشی سے اس کی عقب میں چل پڑی۔ ویسے وہ سارہ کی باتوں میں الجھ سے گئے تھے۔ کیونکہ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جہنمی دروازے کے بارے میں کوئی اہم بات جانتی ہے۔

حویلی کے اس حصے میں کافی اندھیرا تھا۔ اتنا کہ آگے بڑھنا بھی دشوار تھا۔ جبکہ سارہ بے دھڑک ہو کر قدم آگے بڑھا رہی تھی۔

اور پھر وہ ایک دروازے پر جا کر رک گئی۔ جہاں اندر سے روشنی دروازے کی درزوں سے باہر جھانکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

اور پھر وہ دروازہ کھل گیا۔ نواب انور ایک بار پھر چونک اٹھے۔ یہ تو وہی کمرہ تھا۔ جہاں جہنمی دروازے کا تہہ خانہ موجود تھا۔ اور نواب صاحب نے صاف پہچان لیا تھا کہ۔

☆.....☆.....☆

سیما غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ بے یقینی کے انداز میں بولی۔

"کیا.....واقعی.....؟"

"ہاں.....میری جان....."

"یہ اچانک فیصلہ آپ نے کس طرح کر لیا؟ کیونکہ آپ کہہ رہے تھے کہ کمپنی سے چھٹیاں لینی ناممکن ہیں۔"

"ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے.....وہ جلدی سے بولا۔ لیکن میں نے صرف تمہاری وجہ سے یہ کام کیا ہے۔"

"اوہ.....میرا اتنا خیال....." وہ مسکرائی۔

"کیوں.....کیا میں نہیں رکھتا تمہارا خیال؟"

"میں مذاق کر رہی تھی....." سیما نے جواب دیا۔ پھر وہ چونک کر بولی۔

"کیا شرفو کو بھی لے کر چلیں۔"

"نہیں.....وہ گھر کی دیکھ بھال کر لے گا....."

"ٹھیک ہے....." سیما بولی۔ کب چلیں گے؟"

"تم اپنی بھرپور تیاری کر لینا۔ ہم دوپہر تک روانہ ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے....." وہ بولی۔ میں اس وقت کافی خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ آپ نے میری باتوں کو اہمیت دی۔"

نادر کچھ نہ بولا۔ وہ کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

علی بابا اس وقت اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھے۔

یہ وہ کمرہ تھا۔ جہاں انہوں نے نہ جانے کتنے اہم وظائف اور چلے کھینچے تھے۔ ان کے مرشد کے دنیا سے گزر جانے سے قبل بھی ان کی موجودگی میں علاء بابا نے ان ہی کے زیر دست کئی وظائف کا ورد کیا تھا۔

اس کمرے میں دیواروں پر کئی طغرے لگے ہوئے تھے۔ جن میں مقامات مقدسہ کے عکس آویزاں تھے.....

کمرے میں اگربتی کی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں جائے نماز پر عالی بابا دو زانو بیٹھے ہوئے کسی ورد میں منہمک تھے۔

ان کے چہرے سے نہ جانے کیوں پریشانی

پھوٹ رہی تھی۔

حالانکہ کچھ دیر قبل ہی وہ اپنے بستر پر گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن پھر اچانک وہ ہڑبڑا کر جاگے تھے۔

کافی دیر تک وہ بستر پہ ہی موجود رہے۔ پھر وہ اٹھے۔ انہوں نے وضو کیا اور جائے نماز سنبھال لی۔

جب سے ہی ان کا چہرہ تفکر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور اس وقت بھی وہ کسی اہم وظیفے کا ورد کر رہے تھے۔

اگربتیوں کی مہکار چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ عالی بابا کے ہونٹ بدستور جنبش میں تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور ان کے ماتھے سے اب پسینہ پھوٹنے لگا تھا۔

اچانک ہی اگربتیوں کی اس خوشبو میں ایک اور بو شامل ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

عالی بابا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اب بھی ان کا ورد جاری رہا۔ اور پھر یہ دوسری قسم کی بو ان اگربتیوں کی مہکار پہ حاوی ہونے لگی۔

یہ ایسی بو تھی۔ جیسے کمرے میں اچانک ہی چولہے پر رکھا ہوا گوشت جلنے لگا ہو..... حالانکہ یہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔

اور پھر اچانک ہی ایک باریک سی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

"بول عالی..... تو نے مجھے کیوں بلایا.....؟"

عالی بابا کے چہرے پہ قدرے مسرت کے آثار ابھرتے تھے..... اب ان کا ورد ختم ہو چکا تھا، البتہ آنکھیں بدستور بند تھیں۔

پھر وہ آہستہ سے بولے۔

"میں بہت بے چینی محسوس کر رہا ہوں....."

"اس کے لئے مجھے کیوں پریشان کیا.....؟"

"مجھے افسوس ہے۔ عالی بابا آہستہ سے بولے۔ "میں جانتا ہوں کہ تم میرے استاد کے زیر دست تھے۔ اور میں نے تمہیں ان ہی کے بتائے ہوئے طریقے سے بلایا ہے۔"

"میں تیرے لئے کیا کر سکتا ہوں.....؟" پوچھا گیا۔

"اے میرے مرشد کے مؤکل....." عالی بابا نے اسے مخاطب کیا۔ "میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ میری اس بے چینی اور بے اطمینانی کا راز کیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی واقعہ رونما ہونے والا ہے۔ دل بہت بے چین ہے جیسے کسی خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"فی الوقت تو میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔" مؤکل کا جواب ملا۔ مجھے تھوڑی مہلت دے۔ میں آج کا چاند گزرنے کے بعد کچھ بتانے کے قابل ہو سکوں گا۔"

"کیا میں تمہیں اسی طرح بلاؤں"

"نہیں میں خود تمہاری آدھی نیند توڑ دوں گا....." جواب ملا۔

"ٹھیک ہے....." عالی بابا نے طویل سانس لے کر کہا۔

پھر کوئی آواز نہیں ابھری البتہ اب عالی بابا کے چہرے سے تفکر کی پرچھائیاں کافی حد تک چھٹ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

نواب انور نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے سارہ کی طرف دیکھا۔ جس کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ تھی۔

کافی دیر کی خاموشی کے بعد نواب انور بولے۔

"یہ تو وہی کمرہ ہے....."

"ہاں اور وہ رہا تہہ خانے کا دروازہ....." سارہ نے فوراً قالین کی طرف اشارہ کیا۔

"لیک..... تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"مجھے یہی کمرہ دیا گیا ہے۔" وہ سادگی سے بولی۔

"ارے....." نواب انور کے منہ سے نکلا۔ "یہ کیوں.....؟"

"اس کی بھی ایک خاص وجہ ہے....." سارہ بولی۔

"اور اسی خاص وجہ کا تعلق ان باتوں سے بھی ہے جو میں آپ کی سامنے بیان کرنا چاہتی ہوں۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں....."

"میں سب کچھ سمجھا دوں گی....." وہ مسکراتے

ہوئے کہنے لگی۔

پھر وہ نواب انور کے نزدیک آ کر بولی۔

"سب کو چھوڑیں..... فی الحال اس بات کو ذہن سے نکال دیں مجھے صرف یہ بتائیں کہ میں آپ کو کیسی لگی.....؟"

یہ کہتے ہوئے وہ اور قریب آ گئی۔

"تم..... تم بے حد حسین ہو....."

"سچ.....؟؟"

وہ اب ان کے اتنے نزدیک تھی کہ اس کی سانسوں کی تپش انہیں اپنے چہرے پہ محسوس ہونے لگی۔

"کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے؟"

"شادی....." وہ بوکھلا اٹھے۔ لیکن تم تو بے حد جوان ہو، حسین ہو..... میں تو اب بڑھاپے کی سیڑھیوں پہ قدم رکھ چکا ہوں۔"

"ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا....." وہ لاپرواہی سے بولی۔ "مرد تو ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ میں اب اپنی زندگی آپ کے ساتھ اس حویلی میں گزارنا چاہتی ہوں۔"

اس کی باتیں نواب انور کے دل میں گویا چٹکیاں سی بھر رہی تھیں۔ ارمان جاگ اٹھے تھے۔ جسم کے اندر ایک عجیب سی برقی رو گردش کرنے لگی تھی۔ نواب انور کو محسوس ہونے لگا جیسے وہ شدید حیرانی کے عالم میں کھڑے ہوں اور سارہ کسی شفاف آبشار کی مانند ان کو سیراب کرنے کے لئے تیار ہو۔

وہ اس وقت واقعی سب کچھ بھول چکے تھے۔ ایک حسین پیکر ان کے سامنے موجود تھا۔ جو ان پر بے حد مہربان ہو رہا تھا..... اب اور کیا چاہئے تھا۔

انہوں نے بے چین ہو کر سارہ کو تھامنا چاہا، لیکن وہ ہنس کر فوراً ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔

"ایسے نہیں نواب صاحب..... میری ایک شرط....."

"کیسی شرط.....؟" وہ چونک کر بولے۔

سارہ نے چند لمحے توقف کیا اور پھر سرسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ کو..... تہہ خانے کا دروازہ کھولنا پڑے گا..... اور یہ کام آپ اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔"

یہ سن کر نواب انور حیرت سے اچھل پڑے۔

☆.....☆.....☆

پھر سیما اور نادر ٹرین کے ذریعے جلال پور کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

نادر نے فرسٹ کلاس اپارٹمنٹ بک کروایا تھا..... یہی وجہ تھی کہ اس میں مسافروں کی تعداد بھی کافی کم تھی۔

یوں بھی یہ دوپہر کا سفر تھا، کہ جس وقت لوگ کہیں جانے سے اجتناب کر لیتے ہیں۔

ٹرین کے سفر کے لئے تیار تھی۔ پلیٹ فارم پر بھی زیادہ رش نہیں تھا، نادر نے قلی کے ذریعے کمپارٹمنٹ میں سامان رکھوایا اور اسے اجرت دے کر رخصت کیا۔ جس وقت دونوں کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ اسی وقت سر سے پاؤں تک برقعے میں ملبوس ایک عورت بھی چھوٹا سا بیگ لے کر اندر داخل ہوئی۔

اس نے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ نادر نے اس پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور اپنی سیٹ سنبھال لی۔

سیما بھی اس کے ساتھ ہی گویا سیٹ پر نیم دراز ہو گئی۔

نقاب والی عورت نے ان کے سامنے قبضہ جما لیا تھا۔

"مجھے تو نیند آ رہی ہے۔ سیما جماہی لے کر بولی۔

"ہم جلال پور کب پہنچیں گے۔"

"کل صبح 6 بجے....." نادر نے بتایا۔

"اوہ..... اچھا....."

"ہاں..... یہ بھی ٹرین کا مقررہ وقت بتا رہا ہوں..... اگر ٹرین لیٹ ہو گئی تو مزید وقت بھی لگ سکتا ہے۔"

"اوہ..... کیسے گزرے گا اتنا ٹائم....." سیما بے چینی سے بولی۔ نادر مسکرایا۔

"لوکل کمپارٹمنٹ میں تو اور بھی لطف آتا ہے۔ اگر ہم وہاں ہوتے تو سفر کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

"میرے سر میں درد ہو جاتا ہے۔ سیما بولی۔ ویسے

بھی مجھے سفر کی عادت نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ مسکرایا۔ تب ہی ہم اس ڈبے میں دکھائی دے رہے ہیں محترمہ۔"

اس نقاب والی عورت کے علاوہ صرف دو افراد اور دکھائی دے رہے تھے جن میں ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ جو کہ شکل سے ہی کوئی پروفیسر معلوم ہو رہا تھا۔ ٹرین کے سگنل دیتے ہی اس نے ایک موٹی سی کتاب نکال کر اپنے ہاتھوں میں تھام لی اور اب گردوپیش سے بے نیاز ہو کر اسی کی ورق گردانی میں مشغول تھا۔

قریب ہی ایک باریش شخص بھی موجود تھا..... اس کے جسم پر سفید رنگ کا بے داغ شلوار قمیض تھا..... اس نے سر پر براؤن کلر کی ٹوپی لگائی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت کھڑکی کے قریب بیٹھا ہوا بیرونی مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ٹرین اب اپنی مخصوص رفتار کو چھوتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ سیما کافی دیر تک نادر سے جلال پور کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔

اس دوران دونوں نے تھرماس سے نکال کر چائے سے شغل بھی کیا..... نادر اچٹتی نگاہوں سے نقاب والی عورت کو دیکھ رہا تھا جو اب سیٹ کی پشت سے سر لگا کر شاید نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔

سفر جاری رہا..... شام ڈھلتے ہی سیما بھی نیند کی وادی میں کھو گئی۔

آنکھیں تو اب نادر کی بھی بھاری بھاری ہونے لگی تھیں..... چنانچہ اس نے ادھر ادھر طائرانہ نگاہ ڈالی تو باقی مسافروں کو بھی اونگھتے ہوئے دیکھا۔

اب وہ بھی ایک طویل جماہی لے کر آنکھیں بند کرنے والا تھا کہ اچانک ہی نقاب والی نے اپنا سر اٹھایا اور ایک ہاتھ سے نقاب الٹ دیا۔

نادر کی نیند کافور ہو گئی۔ کیونکہ وہ وحیدہ تھی۔

☆.....☆.....☆

"یہ..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو.....؟" نواب انور کے منہ سے نکلا۔

وہ حیرت سے سارہ کی شکل دیکھ رہے تھے۔ سارہ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ نہ جانے کیوں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

ساتھ ہی وہ بولی۔

"میں ذرا باتھ روم سے ہو کر آتی ہوں۔ پھر آپ کو اس تہہ خانے کی اصل کہانی سے آگاہ کروں گی..... میں ابھی واپس آئی۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی..... نواب انور ورطۂ حیرت میں تھے۔ یہ لڑکی آخر کون ہے اور کیا چاہتی ہے۔"

وہ ان ہی باتوں پر غور کر رہے تھے کہ اچانک ہی کسی نے دروازے سے اندر جھانکا۔

یہ کرم دین تھا، جو نواب انور کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"بڑے سرکار..... آپ اس وقت یہاں....."

وہ گھبرا سے گئے..... ظاہر ہے کہ یہ کمرہ اس وقت ایک ملازمہ کے سپرد کر دیا گیا تھا..... اور یہاں نواب صاحب کا موجود ہونا کافی قابل اعتراض بات تھی۔ پھر نواب صاحب خود ہی بولے۔

"ہاں..... میں یونہی اس طرف نکل آیا تھا..... تم لوگوں نے کوئی نئی ملازمہ رکھی ہے؟"

"نئی ملازمہ.....؟" کرم دین حیرت سے بولا۔

"ہاں بھئی....." وہ سر ہلا کر بولے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسے رہائش کے لئے یہ کمرہ کیوں دیا گیا ہے۔"

"نئی ملازمہ..... کرم دین بڑبڑایا..... یہاں رہائش....."

"ہاں بھئی..... وہ بولے میں یہی پوچھ رہا ہوں۔"

"نہیں سرکار..... وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔" ایسا تو کچھ بھی میرے علم میں نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دلاور نے کسی کو رکھا ہو۔ کیونکہ یہ سب کچھ وہی کرتا ہے۔ حویلی کا سامان خورد و نوش اور ملازموں کی ترتیب وغیرہ کے معاملات وہی دیکھتا ہے۔

"اچھا....." ان کے منہ سے نکلا۔

"جی سرکار....." کرم دین سر ہلا کر بولا۔ "ویسے مجھے

حیرت ہے کہ دلاور نے کسی کو اس کمرے میں ٹھہرایا ہے۔"

"میں تو خود حیران ہوں....."

"اب وہ ملازمہ ہے کہاں سرکار....."

"معلوم نہیں....." نواب انور کے منہ سے نکلا۔

کرم دین نے ایک طویل سانس لی اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا آپ اپنے کمرے میں چلنا پسند کریں گے؟"

"ہاں....." وہ چونک کر بولے۔ "چلو۔"

کرم دین نے انہیں کمرے کے دروازے تک چھوڑا اور پھر زیر لب بڑبڑایا۔

"لگتا ہے خواب دیکھا ہے سرکار نے۔"

☆.....☆.....☆

نادر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس عورت سے یہاں بھی ملاقات ہو جائے گی۔

سیما اب بے خبر سو رہی تھی۔ اور وحیدہ کے ہونٹوں پر ایک شریر سی مسکراہٹ تھی۔ پھر وہ آہستہ سے بولی۔

"تمہیں حیرت ہوئی ناں یہاں مجھے دیکھ کر۔"

"ہاں بہت زیادہ....." نادر بڑبڑایا.....

"لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرائی۔ "یہ محض ایک خوب صورت اتفاق ہے۔ میں بھی جلال پور جا رہی ہوں۔"

"اوہ....."

"میں نے پہلے ہی آپ دونوں کو دیکھ لیا تھا۔" اس نے کہا۔ "پھر میں نے بھی اسی کمپارٹمنٹ کا ٹکٹ لے لیا۔ آپ کو حیران کرنا مقصود تھا۔ البتہ میں سیما سے بالکل ہی پوشیدہ رہوں گی۔ کیونکہ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو میں جلال پور میں آپ سے نہ مل سکوں گی۔ یہ پھر میری ٹوہ میں ہی لگی رہے گی۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔"

"آپ کو بھی بہت احتیاط برتنی ہوگی۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "سنیں جب بھی موقع ملے تو پرانی بلڈنگ کا رخ کیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے....."

"مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔ "اور حویلی میں جو کھچڑی پک رہی ہے، مجھے اس سے بھی آپ کو آگاہ کرنا ہے۔"

"حویلی میں کھچڑی.....؟" وہ حیرت سے بولا۔

"ہاں..... یہ باتیں وہیں ہوں گی۔" وحیدہ نے جواب دیا۔

عین اسی وقت سیما کسمسائی اور وحیدہ نے فوراً ہی اپنے چہرے پر نقاب الٹ دیا۔

ٹرین کافی تیز رفتاری سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

عالی بابا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں کمرے میں دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر جلدی سے بستر چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے مخصوص کمرے میں موجود تھے۔ اگر بتی دان میں انہوں نے اگر بتیاں جلائیں اور مصلے پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اگر بتیوں کی مہک تبدیل ہونے لگی اور کمرے میں جلے ہوئے گوشت کی چراندھ پھیلنے لگی۔

عالی بابا کافی مضطرب دکھائی دینے لگے۔ کچھ دیر بعد وہی جانی پہچانی آواز ابھری۔

"عالی تیری بے چینی اٹل ہے۔"

"کیا مطلب.....؟"

"قصبہ ایک بار پھر مصیبتوں کی زد میں آنے کے لئے تیار ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟ عال بابا کے ماتھے پر لکیروں کا جال پھیل گیا۔

"حویلی کا دروازہ کھولنے کی بھرپور کوشش شروع ہو چکی ہے۔" اسی آواز نے انکشاف کیا۔

یہ سن کر جیسے عالی بابا اچھل پڑے۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"یہ..... یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟"

"مجھے یہی اشارے ملے ہیں۔"

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ایسا کون کر رہا ہے؟"

"یہ میرے علم سے باہر ہے۔"

"تو پھر..... اب کیا ہوگا....." عالی بابا کے لہجے میں تشویش تھی تو کیا چاہتا ہے۔"

"میں وہ کام تو نہیں کر سکتا جو مرشد نے کہا تھا۔ عالی بابا نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ لیکن اگر وہ عفریت آزاد ہوا تو میں صرف بے بسی سے تباہی دیکھ سکوں گا۔"

"تو عفریت سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے؟" پوچھا گیا۔

عالی بابا نے حیرت شے سامنے دیکھا۔

"کیا یہ ممکن ہے....."

"ہاں..... مرشد نے جو چلہ کھینچا تھا..... اس کے بارے میں مجھے پوری معلومات ہے۔"

"اوہ....."

"لیکن یہ اتنا آسان نہ ہوگا....." کہا گیا۔ "اگر تم تیار ہو تو میں تمہیں وہ وظیفہ بتا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے..... میں کوشش کروں گا..... عالی بابا نے طویل سانس لے کر کہا۔ پھر تھوڑے توقف سے بولے۔

"یہ چلے کتنے دن کا ہوگا اور کہاں کاٹنا ہوگا۔

"21 دن کی مدت ہے..... اور اگر اس دوران کوئی رکاوٹ ہوئی تو اس کا بھی مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ چلہ کسی کھلے میدان میں کاٹا جائے گا۔ حویلی کے سامنے موجود کھلی جگہ زیادہ مناسب رہے گی۔"

"ٹھیک ہے..... مجھے بتاؤ کہ کیا حویلی کے اندر وہ تہہ خانہ کھولے جانے کی سازش ہو رہی ہے۔"

"ہاں....."

جواباً عالی بابا خاموش رہے۔

"میں جا رہا ہوں..... کل تجھے وظیفہ مل جائے گا۔ اگر اس میں تیری ثابت قدمی نہ رہی تو تو اپنی جان بھی گنوا بیٹھے گا ہے۔ یاد رہے۔"

☆.....☆.....☆

نہ جانے کیوں نادر نے محسوس کیا کہ ان دونوں کی آمد پر نواب انور قدرے متفکر دکھائی دے رہے تھے۔

یہ نادر کا وہم بھی ہو سکتا تھا..... بہر حال حویلی کا ایک صاف ستھرا کمرہ فوراً ہی ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ جس میں ضروریات زندگی کا سامان موجود تھا۔

سیما کو حویلی کا ماحول بہت اچھا لگا..... دوپہر کا پر تکلف کھانا انہوں نے نواب انور کے ساتھ ہی کھایا تھا۔

پھر چند رسمی باتوں کے بعد وہ دونوں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئے تھے۔ سیما بولی۔

"کیا بات ہے..... ابو جان کچھ خاموش خاموش سے ہیں۔"

"ہاں..... میں بھی یہی محسوس کر رہا تھا۔ وہ بولا۔ خیر ابھی تو ہم آئے ہیں۔ میں باتوں باتوں میں ان سے جاننے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کوئی مسئلہ در پیش ہو۔"

"ہاں..... انہوں نے مجھ سے بھی آج صحیح طرح بات نہیں کی۔"

"فی الحال تو سفر کی تھکن اتارو اور آرام کرو۔ رات کے کھانے کے بعد بیٹھک ہوگی تو پھر معلوم کریں گے۔" نادر بولا۔

یہ کہہ کر نادر نے بستر کا رخ کیا۔

ابھی اسے سوئے ہوئے تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

سیما اپنے بال باندھ رہی تھی، اس نے نادر کی طرف دیکھا۔ جو بے خبر ہو کر سو رہا تھا۔ پھر وہ اسی کی نیند کے باعث دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھی اور پھر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا۔

اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ سامنے وحیدہ موجود تھی۔ شاید سیما کے حلق سے حیرت کے مارے کوئی آواز نکل جاتی۔ لیکن اسی وقت وحیدہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"شور مت کرنا سیما..... میں تمہیں صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ تم ان ملنگ بابا سے کہاں مل سکتی ہو۔"

"اوہ....." سیما کے منہ سے نکلا۔

"ہاں..... میں ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہتی ہوں..... تم نے میرے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا تھا..... خیر کوئی بات نہیں....."

"میں تم سے معذرت خواہ ہوں آنٹی....." وہ جلدی سے بولی۔ "اس دن جو کچھ بھی ہوا بس میں غصے میں آ گئی تھی۔"

"دفع کرو..... میں بھی بھول گئی۔"

"کہاں ہیں وہ ملنگ بابا....." سیما نے جلدی سے پوچھا۔

وحیدہ نے ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"چاند کی تیرہ تاریخ کو ملنگ بابا تمہیں اس حویلی کے ایک کمرے میں ملیں گے۔"

"اوہ..... اچھا....."

"ہاں..... وہ ایک خاص ورد کرنے یہاں آئیں گے..... اس رات کے پچھلے پہر ان کا ورد ختم ہو جائے گا..... تم فوراً ہی کمرے میں چلی جانا اور ان سے اپنی خواہش بیان کر دینا..... تمہاری آرزو اسی وقت پوری ہو جائے گی۔ دل میں کوئی بات لانے کا قطعی گھبرانے کی ضرورت نہیں بس تم نے اپنا مقصد حاصل کرنا ہے۔"

"تو کیا اپنی حویلی میں سب لوگ جانتے ہیں؟"

"پورے قصبے میں انکا ڈنکا بجتا ہے۔" وحیدہ کے لہجے میں فخر تھا۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ آج چاند کی کیا تاریخ ہے؟"

"ہاں..... ابھی چاند گھٹ رہا ہے..... پھر نیا اور ستھرا چاند نکلے گا۔ اسی کی تیرہ تاریخ کو تمہیں زندگی کا ایک نیا تحفہ مل جائے گا۔"

"سچ....."

"ہاں..... وہ دعا کریں گے اور ایک ہفتے کے اندر ہی تم اپنے وجود میں نمایاں تبدیلی محسوس کرو گی..... آؤ..... میں تمہیں کمرہ دکھا دوں۔"

عین اسی وقت عقب میں کسی کی آہٹ ہوئی تو سیما چونک کر پلٹی اور بوکھلا گئی۔

آنکھوں میں نیند کا خمار لئے نادر اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اب سیما نے جلدی سے گردن گھمائی اور حیرت زدہ رہ گئی۔

کیونکہ وحیدہ غائب تھی۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن نواب انور اپنے کمرے میں ہی تھے کہ سارہ چھپاک سے اندر آ گئی۔

وہ بری طرح چونک گئے اور گھبرا کر بولے۔

"تم..... یہاں؟"

"جی ہاں....." وہ اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کل کی بات تو ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ کم بخت درمیان میں کود پڑا تھا۔"

"کون..... کرم دین.....؟"

"ہاں..... وہ جو بھی تھا....." سیما نے منہ بنایا۔

"لیکن تم تو اس کی آنے سے قبل ہی نکل گئی تھیں۔"

"جی ہاں....."

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ کوئی آ رہا ہے۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ میرے کان بہت تیز ہیں۔" وہ مسکرائی میں نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی۔

"اوہ....."

"جی ہاں....."

"لیکن ابھی کوئی آ گیا..... تو کیا ہوگا؟"

"کوئی نہیں آئے گا۔ اس نے جواب دیا۔ "میں نے اپنے کام سے فارغ ہو کر چاروں طرف کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے بعد ہی یہاں آئی ہوں۔"

"تم جانتی ہو کہ میرا بیٹا اور بہو بھی آ چکے ہیں۔"

"ہاں..... جانتی ہوں....."

"اچھا..... نواب انور نے سر ہلایا۔

وہ اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اب تک کی نسبت وہ آج بھی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

پھر وہ بولی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"تمہارا حسن....."

"یہ آپ کا ہو سکتا ہے۔ وہ آہستہ سے بولی۔ اگر

آپ میری ایک شرط مان لیں....."

"کیا تم تہہ خان کے دروازے کی بات کر رہی ہو؟"

"ہاں....." اس کے لہجے میں پختگی تھی۔

کوئی اندرونی جذبہ تھا۔ جو آڑے آ گیا تھا۔

"اس کی وجہ.....؟" نواب انور نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ایک بار پھر قصبہ مصیبتوں کی گرفت میں آ جائے؟"

یہ سن کر وہ زور سے ہنسی..... کافی زہریلی ہنسی تھی..... پھر وہ بولی۔

"یہ سب بکواس ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں..... یہ سب جھوٹ اور من گھڑت کہانی ہے..... ایسا کچھ بھی نہیں ہے..... بات دراصل یہ ہے کہ جب حویلی کے سربراہ اور آپ کے دیگر رشتے دار دنیا سے رخصت ہوئے اور حویلی خالی ہو گئی تو....."

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ نواب انور کا بے چینی کے مارے برا حال تھا۔ وہ اکھڑ اٹھے۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں.....؟"

"جو لرزہ خیز داستان میرے دل میں دفن ہے..... اس کے لئے مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی ہوں..... وہ درد ناک لہجے میں بولی۔

نواب انور نے صاف طور پر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمکتے دیکھے۔ جو یکایک اس کے گالوں پہ ڈھلک آئے تھے۔

"داستان.....؟"

"جی نواب صاحب....." وہ بولی۔ "حویلی کا وہ تہہ خانہ ظلم و بربریت کی ایک الم ناک داستان ہے..... جب حویلی اپنے سرپرستوں اور سربراہ اور آوارہ لوگوں سے خالی ہو گئی۔ تو یہاں کھلے عام عیاشی کا بازار گرم ہو گیا..... ہاں آپ کی حویلی کے ملازموں کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی یہاں اپنا منہ کالا کر رہے تھے..... میں آپ کو ان لوگوں کے بارے میں بھی بتاؤں گی....."

نواب انور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔

اب تک انہیں جو کچھ معلوم ہوا تھا۔ اور بتایا گیا تھا..... سارہ کی کہانی ان سب کے بالکل برعکس تھی۔

کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری تھا۔ پھر اس سکوت کو نواب انور کی آواز نے ہی توڑا۔

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا"

یہ سن کر وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"اس کہانی کو میں نہ جانوں گی تو اور کون جانے گا..... میری سگی بہن اس حویلی میں اپنی آبرو اور زندگی کھو چکی ہے..... ہاں نواب صاحب اس تہہ خانے میں نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی عزت اور آبرو لوٹ کر انہیں قتل کر کے دفن کیا گیا ہے..... میری بہن بھی ایسے ہی ایک بربریت کا شکار بنی ہے۔"

"اوہ....."

"ہاں نواب صاحب....." اس کی آواز غم زدہ تھی۔ آپ کیا جانیں آپ تو یہاں آ کر جھانکتے بھی نہیں تھے..... شاید یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کو اور بھی کھلی چھوٹ مل گئی تھی۔

نواب انور حیرت کی تصویر بنے ہوئے خاموشی سے سن رہے تھے اور وہ بولے جا رہی تھی۔

"میں بہت دنوں سے اسی چکر میں تھی کہ کسی طرح تہہ خانے کا راز کھل جائے۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ آپ یہاں رہائش اختیار کرنے آ گئے..... اب میں آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہوں..... لیکن میں ساتھ ساتھ یہ بھی چاہتی ہوں کہ آپ میری بہن اور دیگر معصوم لڑکیوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے ان درندوں کو کیفر کردار تک پہنچائیں..... ہاں..... ان لوگوں کو بھرپور سزا ملنی چاہئے۔"

"اچھا....."

"مجھے آپ کا ساتھ چاہیے نواب صاحب....."

اس کا انداز ملتجیانہ تھا۔ میں انتقام کی آگ میں جل رہی ہوں..... میری مرحوم بہن اکثر میرے خطاب میں آتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولتی۔ اور پھر تڑپ کر میری نیند کھل جاتی ہے..... پھر اس کے غم میں رات بھر جاگتی ہوں۔"

نواب انور اس کے اندازِ بیان سے بہت متاثر دکھائی دے رہے تھے..... حویلی میں موجود اس جہنمی دروازے کی یہ حقیقت واقعی بربریت کی کہانی تھی۔

کافی دیر بعد نواب صاحب نے زبان کھولی۔

''لیکن مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، اس کا کیا مقصد ہے؟''

''سوائے خوف و ہراس پھیلانے کے اور کیا مقصد ہوگا..... وہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ آپ کو اتنا ڈرایا گیا ہے تاکہ آپ اس دروازے کو کھولنے کا خیال تک اپنے دل میں نہ لائیں..... اور مجرموں کے جرائم پر پردہ ہی پڑا رہے۔

''ہوں.....'' نواب انور نے ٹھوڑی کھجائی۔ ''لیکن ان لوگوں نے تو مجھے یہ بھی بتایا ہے کہ حویلی کے عفریت نے قصبے والوں کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔''

وہ ہنسی اور بولی۔

''یہ بھی سفید جھوٹ ہے..... البتہ قصبے کے رہنے والوں میں بھی اسی جھوٹی کہانی کو اڑایا گیا ہے..... آپ تو انسانوں کی نفسیات سے واقف ہی ہوں گے..... لوگ افواہوں اور پراسرار قسم کے واقعات پر فوراً ہی یقین کر لیتے ہیں..... بھلا قصبے والوں کو کیا معلوم کہ ان کی لڑکیاں عفریت کی نہیں بلکہ انسانی درندوں کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کون لوگ ہیں؟''

یہ سن کر سارہ نے نفرت زدہ انداز میں ہونٹ سکیڑے اور بولی۔

''ان میں سرفہرست عالی بابا کا نام ہے..... آپ کے خادم خاص کرم دین اور دلاور کے ساتھ ساتھ وہ بڈھا مالی بھی اس بہتی گنگا میں اپنے ہاتھ دھو چکا ہے..... یہ سب لوگ انسان نہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں..... میں ان لوگوں کو سخت سے سخت سزا دلوانا چاہتی ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ آپ میری مدد کریں گے۔''

''ہاں..... میں تمہاری ضرور مدد کروں گا.....''

''میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔''

''وہ کیا.....؟''

''آپ برا تو نہیں مان جائیں گے.....؟''

''ایسی بات ہے کیا؟''

''جی.....''

''اچھا..... تو پھر میں وعدہ کرتا ہوں کہ برا نہیں مانوں گا۔'' نواب صاحب دھیرے سے مسکرائے۔

سارہ نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔

''آپ کے بیٹے اور بہو کو بھی یہاں لانے میں میرا ہاتھ شامل ہے۔''

''کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ ہے کہ میں حیلے بہانوں سے انہیں بھی یہاں لے آئی ہوں۔''

''کیوں.....؟''

''اگر آپ میری باتوں پر یقین نہ کرتے۔ تو میں ان دونوں کے ذریعے وہ دروازہ کھلوانے کی کوشش کرتی۔''

''اوہ.....'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں نواب صاحب.....'' وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ''میں کافی عرصے سے اس حویلی کے مکینوں کو ان کے انجام سے دوچار کرنے کے چکر میں تھی..... کیونکہ میں ان خبیثوں پر اسی وقت ہاتھ ڈال سکتی تھی کہ جب اس کے اصل مالکان کی مدد میرے ساتھ ہوتی اور میں اب اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکی ہوں۔''

''یہ بات تو.....''

''اور اب..... وہ ڈرامائی انداز میں بولی۔

''مجھے یقین ہے کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گی۔''

یہ کہہ کر وہ مڑی اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆.....☆.....☆

نادر کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے..... اس نے سیما سے پوچھا۔

''کون تھا.....؟''

''کہاں.....''

''تم کس سے باتیں کر رہی تھیں۔''

''کوئی بھی نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

نادر نے اس کی طرف دیکھا پھر بے ساختہ سامنے دیکھا۔ یہ طویل راہداری سنسنا پڑی تھی۔

اب وہ پھر سیما کی طرف گھوما۔

"واقعی..... کوئی بھی نہیں ہے۔"

"میں تو صرف دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔"

"ہاں میں دیکھ رہا ہوں....."

"آپ نیند سے کیوں جاگ گئے.....؟"

"بس مجھے ایسا لگا جیسے کہ تم کسی سے باتوں میں مصروف ہو۔ وہ خجالت آمیز لہجے میں بولا۔ ہوسکتا ہے کہ میں نے کوئی خواب دیکھا ہو۔"

سیما کچھ نہ بولی۔ "وہ تو خود اس حقیقت کو بھی خواب سمجھنے لگی تھی..... ورنہ وحیدہ کا اس طرح اچانک غائب ہوجانا ممکن تو نہیں تھا۔

خیر..... اب تو وہ جا چکی تھی اور یوں نادر کی نگاہوں سے بھی صاف بچ گئی تھی..... ورنہ نادر اس پر سیخ پا ہوتا اور خواہ مخواہ ماحول میں کدورت ہوجاتی.....

وہ جیسے بھی غائب ہوئی۔ لیکن سیما کی جان بخشی ہو گئی تھی..... پھر وہ نادر کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھی۔

"اب تو چائے کا موڈ ہو رہا ہے....." نادر بولا۔ میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں..... تم چائے منگوالو....."

اس کے جاتے ہی سیما نے میز پر رکھے ہوئے انٹر کام کا بٹن دبا دیا..... تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک ملازم کی صورت دکھائی دی۔

سیما نے اسے چائے کا آرڈر دے دیا..... تھوڑی دیر بعد وہ اور نادر بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

نادر کچھ سوچ رہا تھا پھر وہ بولا۔

"میں یہاں آنے کے بعد ابو جان میں واضح تبدیلی دیکھ رہا ہوں۔" اور میں بھی..... سیما فوراً بولی۔ میں تو اس کوشش میں تھی کہ ان کی شادی کروادوں..... اسی لئے تو وحیدہ نے مجھے اپنی بیٹی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔"

"وحیدہ کی بیٹی.....؟" نادر نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ کیا وحیدہ کی کوئی بیٹی بھی ہے۔"

"ہاں..... جوان ہے اور طلاق یافتہ ہے....."

یہ سن کر نادر زور سے ہنسا۔ سیما حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں..... کیا ہوا.....؟"

"میں اس سے مل چکا ہوں۔ نادر بولا۔ وہ تو خود ہی جوان ہے۔ پھر اس کی بیٹی کہاں سے جوان ہوگئی۔"

"یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں..... سیما حیرت زدہ رہ گئی۔ وحیدہ تو کافی بوڑھی عورت ہے۔"

"تم ضرور، دماغی خلل میں مبتلا ہوگئی ہو۔ نادر بولا۔ ارے بابا میں ذاتی طور پر اس سے ملا ہوں۔ وہ جوان ہے۔"

"میرے خدایا..... سیما نے سر کو تھام لیا۔ کیا آپ نے کسی اور کا پیچھا کیا تھا۔"

"وہ تمہیں اچھی طرح جانتی ہے۔ نادر بولا۔ اور اس نے تمہارے بارے میں مجھے کافی باتیں بتائی ہیں۔"

اب سیما یہ کیسے کہتی کہ وہ دروازے پر وحیدہ سے ہی باتیں کر رہی تھی۔ چنانچہ اس نے خاموشی اختیار کرلی۔

وہ اب وحیدہ کی دوسری ملاقات کی منتظر تھی۔ کیونکہ اسے وحیدہ کوئی اہم بات بتانے والی تھی۔ جس کمرے میں ملنگ بابا سے ملاقات ہوسکتی تھی وحیدہ اس کی نشان دہی کرنے والی تھی..... اب وہ کہاں ہوگی..... ہوسکتا ہے کہ وہ دوبارہ اس سے خود ہی رابطہ کرے۔

☆.....☆.....☆

عالی بابا نے حویلی میں قدم رکھ دیا۔ وہ ایک اہم مسئلہ کے سلسلے میں نواب انور سے ملنا چاہتے تھے۔

نواب انور نے مہمان خانے میں ان سے ملاقات کی، عالی بابا نے محسوس کیا کہ نواب صاحب کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا۔

پھر بھی وہ اپنے ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ سجا کر نواب انور سے مخاطب ہوئے۔

"چھوٹے سرکار..... مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے....."

"میں ضرور سنوں گا..... ان کا لہجہ نرم گرم تھا۔ لیکن اس سے قبل ہم دونوں چائے نوش کریں گے..... کیا خیال

نہیں؟"

"میں آپ کا یہ خلوص ضرور حاصل کرتا..... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وقت کافی کم ہے..... اور میں جو کچھ کرنے والا ہوں۔ اس میں آپ کی اجازت کا ہونا ضروری ہے۔"

"کس سلسلے میں:....."

"اسی تہہ خانے کا معاملہ ہے۔"

"ہوں..... ان کا لہجہ قدرے طنزیہ تھا۔" کچھ باقی رہ گیا ہے۔

"میں سمجھا نہیں۔" عالی بابا الجھ کر بولے۔

"سمجھا تو میں بھی نہیں تھا۔" نواب انور نے سر ہلایا۔ "لیکن اب بہت کچھ جان چکا ہوں..... خیر..... بتاؤ کیا ہوا.....؟"

ان کے لہجے پر عالی بابا کچھ پریشان سے ہوگئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے نواب انور طنز کے نشتر چلا رہے ہوں..... نہ جانے کیا بات تھی.....

"مجھے حویلی کے سامنے والے میدان میں چھولداری لگانی ہے۔"

"چھولداری.....؟" نواب انور حیرت سے بولے۔ "کیوں؟"

"مجھے وہاں ایک خاص وظیفہ پڑھنا ہے....." عالی بابا نے جواب دیا اور اس کے لئے یہ جگہ مناسب ہے۔"

"اوہ....." نواب انور عجیب سے انداز میں مسکرائے۔ "لیکن اس وظیفے کا مقصد.....؟"

"دراصل مجھے معلوم ہوا ہے کہ تہہ خانے کے دروازے کو کھولنے کی بھرپور کوشش شروع ہو چکی ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ وہ دروازہ کھل جائے۔ اس لئے میں عفریت سے مقابلے کے لئے روحانی قوت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس پر عبور حاصل کرنے کے بعد میں اس بلاء کا خاتمہ کر سکتا ہوں۔"

نواب انور کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔

"دیکھو..... کسی عمل وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں..... وہ دروازہ بند ہے اور بند ہی رہے گا..... تم اس کے غم میں خود کو ہلکان مت کرو۔"

"جاؤ جا کر آرام کرو....."

عالی بابا نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولے۔ "یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں....."

"میں بالکل درست کہہ رہا ہوں....." نواب انور کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا میں فی الحال اس موضوع کے حوالے سے کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ فی الحال اس موضوع کے حوالے سے کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ قبل از وقت کوئی بھی بات منہ سے نکالنا بے معنی ہے..... میں وقت آنے پر سب کو سچائی سے آگاہ کر دوں گا..... اب تم بھی جاؤ..... اور اگر تم کوئی چلہ وغیرہ کرنا چاہتے ہو تو کوئی اور جگہ دیکھ لو..... میں فی الحال یہاں تمہیں دیکھنا گوارہ نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر نواب انور مڑی اور مہمان خانے سے نکل گئے۔ عالی بابا کی حیرت کا کیا پوچھنا..... ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ نواب انور اس طرح کا رویہ اختیار کریں گے.....

شرمندگی اور ندامت کے آثار لے کر عالی بابا بھی اٹھے اور مہمان خانے سے باہر آ گئے۔

اسی وقت ایک ملازم چائے کی ٹرے اٹھائے ہوئے ان ہی کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ قریب آ کر بولا۔

"بابا جی..... کہاں جا رہے ہیں؟ چائے تو پی لیں۔"

"نواب صاحب نے اچھی خاطر مدارت کر دی ہے....." وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "اب چائے کے لئے جگہ نہیں رہی۔ تم خود پی لو۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے حویلی کے خارجی دروازے کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

ملازم منہ اٹھائے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کندھے اچکائے اور چائے کا کپ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

☆.....☆.....☆

نادر کچھ دیر پہلے ہی حویلی سے باہر نکلا تھا..... اس کا کوئی خاص مقصد نہیں تھا..... البتہ وہ وحیدہ کی جائے رہائش بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

چنانچہ تھوڑی دیر تک وہ قصبے میں بلا مقصد ہی گھومتا پھرتا رہا..... ویسے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ قصبہ کسی تاریخی مقام سے ہرگز کم نہیں تھا۔

یہاں مسلمان بادشاہوں کے زمانے کا لال قلعہ آج بھی اپنی ہیبت اور جلال کے ساتھ کافی بہتر حالت میں موجود تھا..... اور یہی وہ جگہ تھی کہ جس کی وجہ سے اس قصبے کا نام جلال پور رکھا گیا تھا۔

ہاں ..... جلال پور..... اس قلعے کی بلند و بالا فصیلیں آج بھی اس کی بات کی گواہ تھیں کہ مسلمان بادشاہوں نے یہاں پر حق اور باطل کے درمیان ہونے والی جنگیں بہت فخر اور انباط سے لڑی تھیں.....

اس قلعے میں رہائش اختیار کرنے والے آخری بادشاہ کا نام رنگ ریز تھا..... وہ بہت بہادر اور سینہ ٹھونک کر باطل قوتوں کا مقابلہ کرنے والا تھا..... اس کے سامنے کھڑے ہو کر سینہ سپر ہونا بڑے دل گردے کی بات تھی۔

لیکن اس قلعے میں ہونے والی آخری جنگ میں ایک بہت بڑی سازش کے تحت مجاسیہ رنگ باز کو شہید کر دیا گیا۔

وہ اس وقت تلوار کے ہمراہ اسی قلعے کی فصیل پر موجود تھا اور آنے والے دشمنوں کو للکارتے ہوئے مقابلے کے لئے تیار تھا..... لیکن اس سے قبل کہ اس کی تلوار چلتی..... عقب سے اسی کے ایک مشیر نے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔

رنگ باز یقیناً یہ وار سہہ جاتا لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ وہ خنجر زہر آلود تھا..... زہر بھی اتنا خطرناک تھا کہ رنگ باز مجاہد کو تڑپنے کی مہلت بھی نہ مل سکی..... بس..... اس کے لبوں پر کلمۂ شہادت جاری ہوا اور روح پرواز کر گئی۔

"ہاں وہ مجاہد ہی تھا کہ ہر جنگ میں وہ اپنی فوج کو پیچھے رکھ کر خود سب سے پہلے اپنی تلوار سے مقابلے کا آغاز کرتا تھا۔

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے..... چنانچہ رنگ باز مجاہد کے شہید ہوتے ہی اس کی فوج میں شدید رنج و غم کی لہر دوڑ گئی..... کوشش کی گئی کہ موقعے کی مناسبت دیکھ کر رنگ باز مجاہد کی شہادت کو چھپا لیا جائے، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا..... کیونکہ ایک شور بپا ہو چکا تھا۔ نہ جانے کتنے دلوں پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ دشمن کو بھی اس شہادت کا علم ہو گیا۔ ان میں خوشی اور مسرت کا کیا ٹھکانہ..... وہ مشیران ہی چیلا تھا..... اور کچھ عرصے قبل ہی مسلمانوں کی فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ دشمن نے اس موقعے کو سنہری موقع سے تعبیر کیا اور شہید رنگ باز کے قلعے پر یلغار کر دی۔

لیکن..... دشمن کو منہ کی کھانی پڑی..... ہاں..... یہ جنگ بھی رنگ باز مجاہد کے ساتھیوں نے جیت لی..... اور یوں رنگ باز مجاہد کی شہادت اور اس کا خون رائیگاں نہ ہوا۔

اسی قلعے میں رنگ باز مجاہد کا مقبرہ موجود تھا۔ جو گاہے بگاہے مسلمانوں کو اپنی تاریخ یاد دلاتا رہتا تھا۔ یہ مقبرہ آج بھی دشمنوں کے دل پر ہیبت طاری کر دیتا تھا۔

یہ مقبرہ..... آج بھی..... مسلمانوں کو ان کی تاریخ یاد دلا کر ان میں جوش اور ولولہ جگانے کی بھرپور کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نادر نے بھی بڑے ادب اور احترام سے رنگ باز مجاہد کے مقبرے پر فاتحہ پڑھی..... دعا مانگی اور پھر..... باہر نکل آیا.....

قلعے کا کچھ حصہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد کچھ منہدم ہو چکا تھا ظاہر ہے کہ کئی صدیاں گزر چکی تھیں.....

نادر اس وقت اسی حصے سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک آواز نے اس کے اٹھتے ہوئے قدم جکڑ لئے۔

"بیٹا....."

نہ جانے اس آواز میں ایسا کیا تھا کہ نادر نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا۔ قلعے کے ستون کے ساتھ ایک طویل العمر باریش بزرگ بیٹھے ہوئے دکھائی دئے۔

ان کے جسم پر سفید رنگ کا بے داغ لباس موجود تھا..... وہ اس وقت نادر کی طرف متوجہ تھے۔

نادر فوراً ہی ان کی طرف بڑھا۔

''آپ نے مجھے آواز دی۔''

''ہاں بیٹا.....''

''فرمائیں.....'' وہ ان کے قریب جا کر ہمہ تن گوش ہوگیا۔ ''میرے بچے.....'' بزرگ گویا ہوئے۔ ''میں تمہیں آنے والے وقت کے خطرات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں..... کیونکہ حالات کافی سنگینی کی طرف جارہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں.....''

''تم جس مقصد کے تحت یہاں آئے ہو..... اس کے پس پردہ صرف اور صرف تباہی اور بربادی ہے..... لہٰذا احتیاط کرو..... تم خود بھی بچو اور اپنی قرب و جوار کے لوگوں کو بھی اس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرو۔

خاص کر تمہارے قریبی اور خونی رشتے اس ناگہانی کی لپیٹ میں ہیں۔''

''آپ کی باتیں میں سمجھ نہیں پارہا۔''

''سمجھ جاؤ گے.....'' وہ سر ہلا کر بولے۔ ''تم حویلی جا کر حویلی کے رہنے والوں سے معلوم کرو..... وہ تمہیں آگاہ کریں گے..... اس کے بعد تم عقل اور ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے حویلی کو خیرباد کہہ دو۔''

''یعنی..... ہم لوگ واپس شہر چلے جائیں.....؟''

''ہاں..... کیونکہ اگر تم لوگ یہاں رہے..... تو تمہارے ساتھ ساتھ قصبے کے دوسرے لوگ بھی لپیٹ میں آئیں گے۔''

یہ سن کر نادر شش و پنج میں پڑ گیا..... یہ انجانی ہستی اسے کسی خطرے سے آگاہ کررہی تھی..... لیکن صرف اشارہ مل رہا تھا اور وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔

عین اسی وقت بزرگ نے ایک ڈوری اس کی طرف بڑھائی اور بولے۔

''لو..... یہ اپنے گلے میں پہن لو..... خدا تمہارا حامی و ناصر ہو۔ بس اب جاؤ..... اور یاد رکھنا..... حویلی چھوڑنے میں ہی تمہاری عافیت ہے..... باقی جو کچھ بھی ہے، وہ صرف اور صرف دھوکا اور فریب ہے۔''

نادر بزرگ کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔ پھر اس نے وہ ڈوری ان کے ہاتھ سے لے کر اپنے گلے میں ڈال لی۔

باریش بزرگ نے اب اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔

☆.....☆.....☆

عالی بابا کے چہرے پر ایک بار پھر پریشانی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

وہ کافی بے چینی سے مرشد کے مؤکل کے منتظر تھے..... آخر کار گوشت کے جلنے کی چراند پھیلی اور کمرے میں مخصوص آواز ابھری۔ ''تو نے مجھے پھر بلایا.....؟''

''ہاں میں معذرت خواہ ہوں..... لیکن بہت مجبور ہوکر میں نے یہ قدم اٹھایا ہے۔''

''ہوں..... اب کیا ہوا.....؟''

''نواب صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔''

''کیا مطلب.....؟''

''میں حویلی کے سامنے چلہ نہیں کاٹ سکتا۔ انہوں نے مجھے نہ صرف منع کیا ہے بلکہ مجھ سے کافی نفرت کا اظہار بھی کیا ہے۔''

''یہی امید تھی..... کہا گیا۔ خیر اب تو کیا چاہتا ہے؟''

''مجھے بتاؤ..... اب میں کیا کرو.....؟''

''چھوڑ..... بے کار ہے..... تو وہ کام نہیں کر سکتا..... رہنے دے۔'' لاپروائی سے کہا گیا۔

''میں کروں گا..... تم بتاؤ تو سہی.....''

''میں جانتا ہوں کہ تو نے اگر اس کام کی ہمت بھی باندھ لی۔ اس کے باوجود بھی تو اس چلے کو ادھورا چھوڑ کر نکل بھاگے گا۔''

''تم مجھے بتاؤ۔'' عالی بابا بہ ضد ہوگئے۔

''ہوں.....'' ہنکارا بھرا گیا۔ ''اچھا تو سن اس چلے کی دوسری جگہ پرانا قبرستان ہے۔ اب تجھے وہ چلہ اسی ویران قبرستان میں کاٹنا ہوگا..... لیکن خیال رہے..... اگر تو نے اس قبرستان کے ماحول سے ڈر کر وہ چلہ ادھورا چھوڑا، تو تیری جان پر بن جائے گی..... بول..... منظور ہے یہ سودا.....؟''

سوالیہ انداز میں پوچھا گیا۔

(جاری ہے)

کالی

روبینہ عبدالقدیر۔ کراچی

خوبرو حسینہ جب چھ ماہ بعد اسپتال سے گھر آئی تو وہ حیران و پریشان تھی اسے کسی صورت یقین نہیں آکے دے رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے کیونکہ پورے گھر میں کوئی بھی آئینہ نہ تھا، لیکن کیوں؟

حقیقت پر پردہ ڈالتی..... اچھوتی اور انوکھی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی..... کہانی

اسے ڈرنگ رہا تھا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن کوئی تو تھا۔

''فائزہ'' کسی نے دھیرے سے اسے پکارا تو وہ چونک گئی اور فوراً پلٹی اس سے پہلے کہ وہ کچھ دیکھتی اس کی آنکھوں میں کسی نے مٹھی بھر کے مٹی اچھالی۔ آنکھوں میں مٹی کے ذرے گھس گئے تھے۔ وہ بری طرح آنکھیں مسلنے لگی ساتھ ہی وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی روہی رہی تھی لیکن دوسری جانب بالکل خاموشی تھی جیسے کوئی بھی نہ ہو، جیسے کسی کا وجود ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں سے پانی نکلا تو کچھ دھندلا سا دکھائی دینے لگا ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرنے کے بعد ابھی اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے ہی تھے کہ ایک زوردار دھکا لگا اور وہ منہ کے بل گر گئی۔ اسے لگا جیسے اس پر کوئی مائع انڈیلا گیا ہے بدبودار مائع جس نے اسے زندہ جلانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کرنے لگی تھیں۔ اس کے بعد اسے کوئی ہوش نہ رہا اور جب ہوش آیا تو تکلیف کی شدت اور کسی انہونی احساس پر وہ دوبارہ سے ہوش کھو دینا چاہتی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسپتال سے چھ ماہ بعد اسے گھر جانے کی اجازت ملی تھی۔ گھر میں اسے ایک تبدیلی محسوس ہوئی۔ پورے گھر میں کہیں بھی آئینہ نہیں تھا۔ وہ اپنی شکل دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے اپنا چہرہ بار بار آئینہ میں دیکھنے کی عادت تھی۔ لیکن

ڈھونڈنے کے باوجود کہیں بھی آئینہ نظر نہیں آتا۔ ماں سے پوچھتی تو وہ اسے ٹال دیتی۔ اسے گھر سے باہر جانے سے بھی روکا جاتا۔ وہ اس غیر معمولی رویے کی وجہ سے پریشان تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ اپنا میک اپ باکس کھول کر بیٹھی ہوئی تھی۔ عرصہ ہوا اس نے میک اپ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی پسندیدہ لپ اسٹک دیکھی اور دکھ سے مسکرا دی۔ رنگ برنگے شیڈز والی کٹ ڈبے میں بند رکھی ہوئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ یہ کٹ اسے دبئی سے چاچو نے بھجوائی تھی۔ اس نے کٹ کھول کر اس میں لگے آئینے پر نظر دوڑائی آج اسے آئینہ مل ہی گیا تھا۔ اس نے آئینہ کو اپنے چہرے کے سامنے کیا اور اس کا دل پھٹنے لگا۔ اسے لگا جیسے اس کا کلیجہ باہر نکل آئے گا۔ وہ یک ٹک اپنے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ آئینہ میں نظر آنے والا چہرہ اس کا نہیں تھا بلکہ وہ تو کسی اور کا چہرہ تھا۔

☆.....☆.....☆

لٹکی ہوئی کھال اور بدنما چہرہ دیکھ کر اسے جھرجھری آ گئی۔ یہ کون تھی؟؟ وہ اپنے ہاتھ کو چہرے پر پھیرنے لگی۔ سخت اکڑی ہوئی جلد ہتھیلی کو محسوس ہو رہی تھی اور آئینہ اسے وہ احساس مجسم شکل میں دکھا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنا چہرہ ملنے لگی جیسے یہ بدنما کھال ہٹا دینا چاہتی ہو۔ اسے تکلیف ہونے لگی لیکن یہ تکلیف روحانی اذیت سے زیادہ تھی۔

سیاہ چہرہ آنسوں سے تر ہو کر مذید کریہہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی پسندیدہ سرخ رنگ کی لپ اسٹک اٹھائی اور ہونٹوں پر رگڑ رگڑ کر لگا دی۔ چہرہ اور ڈرانا ہو گیا تھا۔ لپ اسٹک رکھ کر اس نے اپنا چہرہ دیکھا اور قہقہے لگا کر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے اس نے آنکھوں میں کاجل پھیلا دیا۔ پھیلے کاجل اور سرخ لپ اسٹک نے اسے بہت ڈرانا کر دیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ تو کسی کوئلے سے بھی زیادہ بدصورت ہے۔ کسی کالی رات کی طرح ڈرانی اور گہری سیاہ!

☆.....☆.....☆

اسے شروع سے ہی سیاہ رنگ ناپسند تھا۔ وہ کالے کپڑے نہیں پہنتی تھی، اس کے جوتے، سینڈلز، بیگ کوئی ایک چیز بھی کالی نہیں تھی۔ اپنے کالے بالوں کو اس نے کلر کروا کے براؤن کر لیا تھا۔ کالے رنگ کی وجہ سے اسے ہر برقع والی لڑکی سے گھن آتی اور جس لڑکی کا رنگ کالا ہوتا وہ اس سے بات ہی نہیں کرتی تھی۔ نفرت تھی اسے سیاہ رنگ سے شدید نفرت اور اسی لیے اسے رات بہت بری لگتی تھی۔ لیکن نہ جانے اسے کالے رنگ سے اتنی نفرت کیوں تھی؟؟

☆.....☆.....☆

''تم کتنی کالی ہو تمہیں اپنی شکل بری نہیں لگتی؟''

یونی ورسٹی میں ساتھ بیٹھی رامین کو دیکھ کر اس نے کرسی فاصلے پر کرتے ہوئے کہا۔ رامین نے غصے سے اس کی شکل دیکھی۔ ''اوہ آئی نو کہ سب سیاہ فام کالے ہی ہوتے ہیں لیکن تم تو کچھ زیادہ ہی کالی ہو'' اس نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔ ''میرے سامنے تو تم رات ہو اور میں رات میں چمکتا چاند'' اس نے تکبر سے جتاتے ہوئے کہا۔

رامین نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی فائل اٹھائی اور طمطماتی ہوئی کلاس سے باہر نکل گئی۔ اس کی پشت دیکھ کر فائزہ مسکرائی اور نفرت سے بڑبڑائی۔ ''ہونہہ! کالے کلوٹے لوگ اور نخرے دیکھو''۔

☆.....☆.....☆

ماضی کی یاد نے اسے پچھتاوے کی گہری آگ میں ڈال دیا تھا، اسے احساس ندامت نے گھیر لیا تھا۔ دل پچھتاوے کی آگ میں راکھ ہو رہا تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اس پچھتاوے کی آگ میں پوری زندگی بسر کرنی تھی۔ یادوں کے دریچے سے ایک دم حواسوں میں آ کر اس نے خود کو ترحم آمیز نگاہوں سے دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

خونی پیاس

عنیزہ فضل داد۔ کراچی

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اچانک دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی تو گھر میں موجود خوبرو حسینہ دھل کر رہ گئی، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور پھر اچانک……

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد، دلوں کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانی

جی بولیں۔

وہ مجھے پانی چاہیے تھا مجھے لگتا ہے تم کمرے میں پانی رکھنا بھول گئی ہو میرا گلا خشک ہو رہا ہے پلیز کچن سے پانی تو لا دو یار۔

کیا ہے بھئی رات میں بھی چین نہیں جاؤ اب خود ہی لے کر آؤ آپ کو پتہ تو ہے کہ مجھے اکیلے ان جگہ سے کس قدر خوف آتا ہے اور اوپر سے یہ تو گھر بھی نیا ہے نا بابا میں تو نہیں جا رہی۔

کیا ہے یار اتنی ڈرپوک کیوں ہو تم چلو اٹھو جاؤ اب ایک تو مجھے پیاس لگ رہی ہے اور اوپر سے تمہاری یہ بحث۔ اچھا…… اچھا۔ دیں جگ لاتی ہوں آپ کے لیے پانی۔

اتنا اندھیرا کیوں کر رکھا ہے گھر میں بندہ ایک آدھ لائٹ جلتی بھی تو چھوڑ سکتا ہے ناں کون سا لاکھوں میں بل آجانا ہے ایک لائٹ سے۔

ڈرڈرڈرڈرڈر۔

کون ہے؟ کیبنٹ کے مسلسل بجے چلے جانے پر میں حد درجہ خوف زدہ ہو چکی تھی اور سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ

بالآخر معاملہ کیا ہے۔کون ہے؟

ڈزڈزڈزڈزڈزڈز۔

کیبنٹ مسلسل بجے چلا جارہا تھا یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اندر کوئی قید ہے جو باہر آنے کے لیے اپنی پُر زور کوشش میں محو ہے خیر اللہ اللہ کر کے میں اس کیبنٹ کی جانب اپنے قدم بڑھانے لگی لیکن کیبنٹ کے بالکل پاس جا کر بھی دل میں ایک ڈر مسلسل مجھے ڈرائے چلا جارہا تھا کہ آخر اس میں ہے کیا خیر اللہ کا نام پڑھ کر اس کیبنٹ کے دروازے کو اپنی جانب کھینچا ہی تھا کہ اندر موجود اس خوفناک مخلوق نے میری سانس نکال دی اور میں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے زوردار آواز سے چلائی۔

ارے ارے کیا ہوا عنیزہ؟ کیوں پاگلوں کی طرح چلا رہی ہو؟ وہ وہ وہ.....

وہ کیا اور تم اتنی ڈری ہوئی کیوں ہو خیریت ہے ناں سب۔وہ وہ وہ وہ وہاں۔وہاں کیا؟

وہ اس کیبنٹ میں کوئی ہے؟

کیا کیبنٹ میں؟

ہاں.....ہاں وہاں کیبنٹ میں کوئی ہے؟

اچھا ہٹو میں دیکھتا ہوں پتہ نہیں کس چیز سے ڈر گئی ہو تم۔ن.....ن.....ن.....نہیں.....

کیا ہو گیا ہے تمہیں پلیز مجھے جانے دو جب تک دیکھوں گا نہیں پتہ کیسے چلے گا کہ کیا دیکھ لیا ہے تم نے

ہٹو میرے سامنے سے.....کیا ہے یہاں؟

یہاں تو کچھ نہیں عنیزہ؟

نہیں ابھی تو تھا۔

میں نے کہاں ناں یہاں کچھ نہیں آؤ تم خود ہی دیکھ لو۔نہیں۔

کیا ہو گیا ہے یار چلو آؤ یہاں۔

میں عاصم کے بار بار اصرار پر کیبنٹ کی سمت بڑھی اور عاصم کو اپنی ڈھال بنا کر کیبنٹ کے اندر جھانکا تو وہاں سچ میں کچھ نہ تھا لیکن جو میں نے دیکھا وہ صرف میرا وہم بھی نہ تھا وہاں سچ میں کوئی اندر پاؤں کے بل بیٹھا خون آلود چہرہ لیے مجھے دیکھ رہا تھا لیکن اب تو یہاں کوئی نہیں وہ بلا اچانک سے کہاں غائب ہو گئی کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا اور دوسری جانب کمرے میں پہنچتے ہی عاصم مسلسل میرا مذاق اڑائے چلے جارہے تھے۔

میں سچ کہہ رہی ہوں عاصم وہاں سچ میں کوئی غیر مرئی مخلوق تھی آپ ہنس کیوں رہے ہیں۔

ارے بھئی دیکھو ناں وہ غیر مرئی مخلوق بھی تمہیں دیکھتے ہی غائب ہو گئی سوچو میرا کیا حال ہوتا ہو گا جو مسلسل تمہیں برداشت کر رہا ہوں اُس سے تو تم ایک لمحہ بھی برداشت نہیں ہوئی ہاہاہاہاہا۔

عاصم آپ بہت برے ہیں۔

بتانے کا شکریہ میری پیاری بیگم۔

اگلے دو دن تو بڑے سکون سے گزرے اور ان دو دنوں میں میرا ڈر بھی کافی حد تک کم ہو چکا تھا اور مجھے بھی اب یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ صرف میرا ایک وہم تھا اور کچھ نہیں لیکن آج رات اس وہم نے حقیقت کا روپ دھارا جب میں رات گئے لاؤنج میں تھوڑی دیر بیٹھے اپنے دن بھر کی تھکان کو دور کرنے میں مصروف عمل تھی تو اچانک کسی کے چلنے کی دھیمی دھیمی سی آہٹ مجھے محسوس ہونے لگی اور اس آہٹ کے ساتھ ساتھ وہ پائل کی جھنکار سارے ماحول کو خوفناک کیے چلی جارہی تھی اس گھر میں میرے اور عاصم کے سوا کوئی نہ رہتا تھا تو یوں کسی کی بجتی پازیب دل میں ایک خوف ایک ڈر کو بڑھاوا دے رہی تھی۔

کون ہے؟

عاصم یہ آپ ہیں ناں مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں ناں آپ.....میں بھی ڈرنے ورنے والی نہیں سیدھا سیدھا میرے سامنے آجاؤ اور آکر یہ بتاؤ کہ یہ کس چڑیل کی پازیب لے آئے ہیں آپ اپنے ساتھ عاصم.....عاصم۔

دوسری جانب سے مسلسل اپنی جانب بڑھتی قدموں کی آہٹ کے سوا جب کوئی جواب نہ پایا تو مجھے سچ میں ڈر لگنے لگا کیونکہ عاصم یہ بات بہ خوبی جانتے تھے کہ میں کس قدر ڈرپوک انسان ہوں اس لیے اگر وہ کوئی مذاق کر رہے ہوتے تو تھوڑی دیر میں ہی ہنستے کھلکھلاتے

میرے سامنے آجاتے لیکن یہاں تو مسلسل خاموشی کا راج تھا۔ کک..... کک کون ہے؟

کک..... کک..... کک کون ہے؟

یہ لائٹس کو کیا ہو رہا ہے۔

اف یہ لائٹ بند کیسے ہوگئی عاصم..... عاصم۔

عاصم۔ موم بتی کہاں رکھی تھی میں نے ہاں یاد آیا۔

آ..... آ..... آ..... چلانے کی آواز۔

یا خدایا مدد فرما۔ آیت الکرسی پڑھتی ہوں ہاں.....

کچھ نہیں ہے یہاں..... نہیں کچھ نہیں یہاں..... یہ صرف میرا وہم ہے اور کچھ نہیں..... کافی دیر خود کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتی میں موم بتی جلائے اپنے کمرے کی سمت بڑھی ہی تھی کہ اچانک کسی کو اپنے بالکل سامنے کھڑا پایا کہ جس کو دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے جلتی موم بتی گر چکی تھی اور ایک زوردار چیخ میرے حلق سے نکلی۔

کیسی ہو عنیزہ ہاہاہاہاہا ہمارے گھر میں تمہارا ویلکم..... ہاہاہاہاہاہا تم جانتی نہیں میں کب سے پیاسی ہوں ذرا میرے پاس تو آؤ..... ہاہاہاہا۔

نہیں..... نہیں..... یہ سب سچ نہیں ہوسکتا..... نہیں۔

وہی خون دار چہرہ لمبے لمبے بال نوکیلے ناخن خون سی لال آنکھیں بدبودار جسم قدموں کو چھوتے لمبے بال منہ سے نکلتے نوکیلے لمبے دانت۔

میرے پاس آؤ عنیزہ..... شاباش آؤ میرے پاس..... تمہارے وجود میں دوڑتا خون ہی میری پیاس بجھا سکتا ہے مجھے اپنی پیاس بجھانی ہے۔

نہیں..... نہیں..... پلیز مجھے چھوڑ دو..... مجھے جانے دو..... پلیز میرے ہاتھ ٹھنڈے پڑ چکے تھے اور جسم بھی زمین بوس ہوجانے کو تیار تھا کہ اس کالی بلا نے میری سمت ایک اور قدم بڑھایا..... یا اللہ میری مدد فرما..... یا اللہ..... یا اللہ..... اس کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر میں وہیں گر کر بیہوش ہوگئی۔

عنیزہ..... عنیزہ..... کیا ہوگیا تمہیں..... عنیزہ اٹھو اپنی آنکھیں کھولو۔ عنیزہ..... عنیزہ..... یا خدایا کیا ہوگیا ہے اسے اب اتنی رات گئے میں اسے کہاں لیکر جاؤں یہاں تو کوئی ہمیں جانتا بھی نہیں اور باہر برف بھی بہت گری ہے آج! پڑوس میں جا کر دیکھتا ہوں شاید کوئی مل جائے۔ ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک۔

کافی دیر دستک دینے کے بعد بالآخر دروازہ کھلا۔

السلام علیکم۔

وعلیکم السلام برخوردار کون ہو تم؟

جی وہ میں آپ کا نیا پڑوسی ہوں وہ سامنے والے گھر میں کچھ دن پہلے ہی شفٹ ہوئے ہیں ہم۔

کیا کہاں؟ اس سامنے والے گھر میں۔

جی جی درست سنا آپ نے بس دراصل وہ میری بیوی بیہوش ہوگئی ہے کیا آپ میری کچھ مدد کرینگے۔

بیٹا تمہارے حلیے سے تو تم کوئی شہری بابو لگتے ہو اس لیے تم میری باتوں پر شاید یقین نہ کرپاؤ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم جس گھر میں رہ رہے ہو وہ گھر گھر نہیں بلکہ چڑیلوں کی آرام گاہ ہے تم وہاں کیسے رہ سکتے ہو کیا تم نے یہ گھر لینے سے پہلے اچھی طرح چھان بین نہیں کی تھی۔

نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں..... اور بھوت ووت کچھ نہیں ہوتے یہ سب تو صرف ہم لوگوں کا ایک وہم ہے حقیقت سے اس کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں پلیز آپ میری کچھ مدد کرسکتے ہیں میری بیوی وہاں بیہوش پڑی ہے کیا یہاں قریب میں کوئی ڈاکٹر ہے۔

بیٹا تمہیں ڈاکٹر کی نہیں بلکہ عقل کی ضرورت ہے اس وقت..... عقل سے کام لو اور یہاں سے تین گھر چھوڑ کر چوتھے گھر میں ایک محترم عامل رہتے ہیں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ وہ تمہاری ضرور مدد کردیں گے۔

عامل؟ میں آپ سے ڈاکٹر کا پوچھ رہا ہوں اور آپ مجھے عامل کا پتہ دے رہے ہیں۔

بیٹا اس وقت تمہیں اپنی بیوی کی زندگی کی فکر ہونی چاہیے باقی تمہاری مرضی۔

یہ کہہ کر ان صاحب نے اپنے گھر کا دروازہ بند کردیا لیکن اپنی باتوں سے مجھے ایک عجیب پریشانی میں مبتلا کر گئے اس وقت واپس گھر جانا بیوقوفی کے سوا کچھ نہ تھا

اس لیے میرے قدم خود بہ خود اس عامل کے گھر کی طرف بڑھنے لگے اور اس عامل کو سارے معاملے سے آگاہ کر کے ان سے مدد کی درخواست کی ہی تھی کہ وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے اور ہم اپنے گھر کی سمت بڑھنے لگے لیکن گھر پہنچتے ہی ہر جانب بدبودار خوشبوؤں نے میرا استقبال کیا اور اس بو سے میرا سر پھٹے چلا جا رہا تھا کہ عامل بابا میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

بیٹا اپنی بیوی کو آواز دو۔ لیکن وہ تو بیہوش پڑی ہے اسے آواز دینے کو کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟

جو میں کہہ رہا ہوں بس وہی کرو زیادہ سوال مت کرو۔ جی بہتر۔ عنیزہ..... عنیزہ..... عنیزہ.....

کسے پکار رہے ہو تم ہاہاہاہاہا تمہاری بیوی اس وقت میرے قبضے میں ہے۔

عنیزہ یہ تمہیں کیا ہو گیا یہ تم کیسے بول رہی ہو یہ سب..... کیا ہے؟

کیا عنیزہ عنیزہ کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے؟

تمہیں سمجھ نہیں آ رہا میں نے کیا کہا تم نے میں رانی ہوں یہاں کی، رانی اور اب اس جسم پر صرف میرا قبضہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارا خون پی کر ہی میری پیاس بجھے گی اب ہاہاہاہاہا۔

یہ سب منظر مجھے ایک خواب کی مانند لگ رہا تھا ایک ڈراؤنا خواب کیونکہ حقیقت تو یہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس سارے منظر کی حقیقت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب عنیزہ کے ایک ہلکے سے دھکے سے میں کافی دور جا لگا تھا اس دن مجھے اس مخلوق کی موجودگی کی حقیقت کا خوب اندازہ ہو چلا تھا۔ چھوڑ دے اس بچی کو؟

نہیں کبھی نہیں۔

آ..... آ..... آ..... نہیں میں اسے نہیں چھوڑوں گی اس سے پہلے میں تیرا خون چوس لوں گی تو بھی بچ کر نہیں جائے گا اب یہاں سے۔

مولانا صاحب مسلسل کچھ پڑھے جا رہے تھے اور اس خلائی مخلوق سے ہم کلام تھے کئی بار اس مخلوق نے انہیں برا بھلا کہا لیکن وہ ہر بار کچھ نہ کچھ پڑھ کر پھونکے چلے جا رہے تھے اور ایک دم سے اس مخلوق پر قابو پاتے ہی مجھے بلا کر عنیزہ کے دونوں ہاتھ باندھنے کا حکم دیا اور اس کے دونوں ہاتھ باندھتے ہی باقی کا عمل کرنے لگے۔

لیکن اچانک سے بہت سی بلائیں ان کے بنائے گئے حصار کے باہر ہمارے اردگرد گھومنے لگیں، انہیں دیکھتے ہی میرے سارے جسم سے جان نکلے چلی جا رہی تھی کہ بابا بولے۔ بیٹا ان کی جانب مت دیکھو اور کچھ بھی ہو جائے حصار سے باہر مت نکلنا۔

جی بابا۔ عاصم..... مجھے بچاؤ عاصم۔

رکو یہ تمہاری بیوی نہیں بلکہ اس بلا کا مکر ہے تم دور رہو۔

میں تجھے نہیں چھوڑوں گی میں نے کہا چھوڑ مجھے چھوڑ مجھے۔ بیٹا وہ آگ سے جلتا دستہ مجھے پکڑانا۔ جی بابا۔

نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے میں نے کہا ہم تجھے نیست و نابود کر دیں گے چھوڑ مجھے چھوڑ۔

تو اس بچی کو چھوڑ کر چلا جا یہاں سے نہیں تو میں تجھے ابھی کے ابھی جلا کر بھسم کر دوں گا۔ میں نے کہا جا یہاں سے..... جا..... نہیں تو میں تجھے جلا دوں گا۔

نہیں..... نہیں..... آ آ آ..... اس قدر زوردار چیخ سن کر لگتا تھا کان بہرے ہو جائیں گے لیکن اس چیخ کے بعد وہاں سب نارمل ہو چکا تھا عنیزہ کو بھی ہوش آ چکا تھا لیکن ڈر کے مارے وہ بستر پر جا لگی اور ہم نے صبح ہوتے ہی عامل بابا کے کہنے پر وہ گھر چھوڑ دیا اور نہ صرف اس علاقے بلکہ اس شہر کو ہی چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس رات کا خوف آج بھی ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے اس رات کا تصور بھی ہماری کتنی راتوں کی نیندیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ عنیزہ اس علاقے سے نکلتے ہی کافی بہتر ہو چکی تھی ہم اب اپنی زندگی اپنے اسی پرانے طرز پر خوشی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ گزار رہے ہیں۔

لیکن وہ دن ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو ہم نے وہاں گزارے تھے۔

کوٹھری کا جن

زیبا حسن مخدوم۔ چنیوٹ

اچانک کمرے میں روشنی پھیل گئی اور کونے سے دھواں اٹھنے لگا اور جب دھواں چھٹا تو ایک لمبا چوڑا بزرگ کھڑا تھا اس کی لمبی داڑھی چمک رہی تھی کہ اس کی گونجدار آواز گونجی.....

کبھی کبھار مذاق بھی حقیقت کا روپ دھار لیتا ہے.....کہانی ضرور پڑھ کر.....دیکھیں

یہ واقعہ میرے بچپن کا ہے۔ میں بچپن میں بہت شرارتی تھا۔ میری شرارتوں میں میرا چھوٹا بھائی بھی ساتھ ساتھ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں آج کی طرح گھر بند بند اور چھوٹے چھوٹے نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ کھلے کھلے حویلیوں کی طرح ہوتے تھے۔ ہمارا گھر بھی بہت کھلا اور بڑا تھا۔ رات کو ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف جاتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ویسے بھی ہمارے گھر کے بارے میں مشہور تھا کہ کونے والی کوٹھری میں ایک باریش بزرگ جن رہتا ہے۔ ہم بچوں نے تو کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن بڑوں اور محلے کے اکثر لوگوں نے دیکھا ہوا تھا۔ ہم ڈرتے تو تھے مگر اس دن ہمارے سر پر شرارت کا بھوت سوار تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے اس جن کو ٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دوپہر کو جب سب سو رہے تھے تو ہم دونوں بھائی اس کوٹھری کی طرف آئے اور اس

جن کو آوازیں دینے لگے۔ پاس ہی ایک برتن پڑا تھا ہم نے وہ برتن اٹھایا اور اور جن کو پکار کر کہنے لگے

''اے جن۔۔۔! آ اور اس برتن میں قید ہو جا۔''

''آ اور اس میں قید ہو جا۔''

ہم کافی دیر تک یہ کھیل کھیلتے رہے اور اسے تنگ کرتے رہے۔ پھر تھک ہار کر اپنے کمرے میں آ گئے۔

گرمی کا موسم تھا۔ رات کو سب صحن میں چارپائیاں ڈال لیتے اور کھلے آسمان تلے سوتے۔ اس رات بھی ہم معمول کی طرح اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ ہم دونوں بھائیوں کی چارپائی ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے پھر جب رات گہری ہوتی تب کہیں جا کے سوتے۔ اس رات سب جلد ہی سو گئے۔ ہم دونوں بھائی بھی کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی سوئے ہوئے کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا میرا چھوٹا بھائی اپنی چارپائی چھوڑ کر میری چارپائی پر آ گیا ہے۔ وہ بہت خوف زدہ لگ رہا تھا اور میرا بازو ہلا ہلا کر مجھے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''مم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' چھوٹے بھائی نے ڈرتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟''

''پ۔۔۔ پتہ نہیں۔۔۔ مجھے لگ رہا جیسے و۔۔۔ وہ ہے۔'' وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔

''کون ہے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہی کوٹھری والا جن۔'' یہ سنتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

''نن نہیں۔ تمہارا وہم ہے۔ سو جاؤ۔'' میں نے اس کا خوف کم کرنا چاہا حالانکہ میں خود بھی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔

''کچھ دیر ہم خاموشی سے لیٹے رہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سر والی سائیڈ پر ہلکی ہلکی سی روشنی ہونے لگ گئی ہے۔ میرے چھوٹے بھائی کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ میرے پسینہ چھوٹنے لگ گیا اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے بھی زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دل چاہ رہا تھا اپنا منہ اپنے اوپر اوڑھے ہوئے کھیس میں چھپا لوں مگر میں اس وقت کوئی بھی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بس آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔

کچھ دیر بعد اچانک کسی نے ''اللہ ہو'' کہا۔ ہم دونوں کی چیخ نکل گئی۔ ہم جانتے تھے اس وقت سب سو رہے ہیں۔ اور آدھی رات کی وقت ہمارے سرہانے کی جانب کھڑے ہو کر اللہ ہو کہنے والا کوئی اور نہیں وہی کوٹھری والا جن ہی تھا۔ میں نے دیکھا وہ بہت لمبا تھا۔ اور اس کی اردگرد بہت روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں اس کی سفید لمبی داڑھی چمک رہی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے زور سے ایک دوسرے کو بھینچ لیا۔ چھوٹا تو رونے لگ گیا۔ میری حالت بھی بہت خراب ہو گئی۔ ٹانگوں سے جان نکلنے لگ گئی۔

''مجھے قید کرنا چاہتے تھے نا۔۔۔ لا آگے کر وہ برتن۔'' اس کی گرج دار آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

چھوٹا بھائی خوف سے بے ہوش ہو گیا۔ اب میں اکیلا اس کی رحم و کرم پر تھا۔ میں زور زور سے رونے لگ گیا۔ اور امی ابو کو آوازیں دینے لگ گیا۔ مگر حیرت کی بات تھی کوئی نہ میرے رونے کی آواز سن کر جاگا اور نہ میرے پکارنے پر۔

''اٹھ۔۔۔ اور لا وہ برتن۔'' اس کی گرج دار آواز کی ساتھ میری چارپائی کو ٹھوکر لگی میں اور اونچی آواز میں رونے لگ گیا۔ روتے روتے میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور سب کو پکارنے لگ گیا۔ مگر پھر جو میری آنکھوں نے دیکھا اس پہ مجھے آج تک یقین نہیں آتا۔

میں نے دیکھا اتنے بڑے صحن میں صرف میری

ایک چارپائی کے علاوہ وہاں کوئی چارپائی نہیں تھی۔ سارے گھر والے غائب تھے۔ اس بات نے مجھے اور وحشت زدہ کر دیا اور میں پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔ مگر میری چیخوں میں بھی اس کی غصیلی اور گرج دار آواز بہت بلند اور واضح محسوس ہو رہی تھی۔

''میں کہتا ہوں برتن آگے کر۔۔۔! بہت شوق ہے نا جن کو قید کرنے کا۔ اب مزہ چکھ۔''

مجھے لگ رہا تھا بس ابھی خوف سے میرا دل بند ہو جائے گا۔ وہ کھڑا شعلہ بار نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے جانے کیا لفظ کہا تو اچانک گھر کی ساری لائٹس بند ہو گئیں۔ ہر طرف اندھیرا ہو گیا۔

مجھے ایسے لگنے لگ گیا جیسے میں کسی ویرانے میں موجود ہوں۔ میری چارپائی آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگ گئی۔ مجھ پہ اتنی وحشت طاری ہوئی کہ میں زور زور سے چلانے لگ گیا۔ چارپائی اوپر ہی اٹھتی جا رہی تھی پھر اسے جھٹکے لگنے لگ گئے۔ میں نے زور سے چارپائی کو پکڑ لیا لیکن کسی چیز نے اٹھا کر مجھے نیچے پھینک دیا۔ میں گرتا چلا جا رہا تھا اور چیختا جا رہا تھا یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں بخار میں پھنک رہا تھا۔ سارے گھر والے میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھ سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ مسلسل چلانے کی وجہ سے میرا گلا بیٹھ گیا تھا۔ گھر والوں سے پتہ چلا کہ ہم۔ دونوں بھائی اگلے دن۔ چارپائی پر بے ہوش پڑے تھے۔ میرا بھائی تو اگلی صبح ہی ہوش میں آ گیا تھا مگر میں دو دن بے ہوش رہا۔ کوٹھری میں رہنے والا جن مسلمان تھا اس لئے اس نے ہمیں چھوڑ دیا ورنہ ہمارا بچنا مشکل تھا۔ اس دن کے بعد ہم دونوں کبھی اس کوٹھری کی طرف نہیں گئے اور نہ کبھی کسی ایسی مخلوق کو تنگ کرنے کی کوشش کی۔

مشہور و معروف رائٹروں کی

تحریر کردہ 40 سے زائد کہانیاں

خوفناک کہانیاں

حاسدہ، نادیدہ مخلوق، خونی انتقام، پراسرار مندر، موت کا سودا، روح کی بے چینی، قلبی اذیت، موت کا سامنا، پراسرار سایہ، دہقان نو، پراسرار سانپ، سپر شپ، موت کی وادی، حویلی کا راز، انوکھا ہمسفر، موت کا قلعہ، خواب پریشان، اندھیری رات، اندھا قتل، قسمت کا چکر، جنات سے دوستی، تباہی بربادی، خواہش ناتمام، غیبی محافظ، خونی حویلی، دلہن کی روح، موت کا بدلہ، ناگ منکا، ناشکرا، دوسری مخلوقات، خبیث روح، اماوس کی رات، ظالم آتما، روح کی مدد، روحوں کا ملن، بے بس روح، موت کا بدلہ، پراسرار دنیا، غلط فہمی، ڈھائی بجے، ادھورا انتقام

صفحات 400 قیمت -/300 روپے

گھر بیٹھے کتاب منگوائیں

ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا

ڈریم پبلی کیشنز

نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی

آفس ٹائم: صبح 10 سے شام 6 تک

رابطہ نمبر: 0324-7232580

زندگی کا ڈر

کائنات رشک تنویر۔ لاہور

خوبصورت لڑکی نے بہت سے بچے دیکھے جن کی عمریں تو کتاب اور کھلونے پکڑنے کی تھیں لیکن ان کے ہاتھ میں مجبوریوں نے "کٹورا" پکڑادیا تھا کہ لے مانگ.....

خودغرضی اور مطلب پرستی کے سمندر میں غوطہ زن دل کو مبہوت کرتی سبق آموز کہانی

''کبھی زندگی سے کہانیاں بنتی ہیں تو کبھی کہانیوں سے زندگی لیکن اس دنیا میں چند ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جن کی زندگی الماری میں پڑی کسی بوسیدہ کہانی جیسی ہوتی ہے لیکن وہ پھر بھی زندگی ''گزارتے'' ہیں۔ ہمارے محلے کے لوگوں کا شمار بھی ایسے ہی ''زندگی گزارنے'' والوں میں ہوتا تھا یہاں کے لوگ سارا سارا دن محنت مزدوری کرتے ہیں خود کا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے گدھوں سے بھی زیادہ محنت کرنے کے باوجود کچھ اچھی آمدن نہ ہونے کے باعث بڑی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ بولتے بولتے رکی تو ایک لڑکی کی آواز سنائی دی کمرے کا در و دیوار کو۔

''ہوں..... کون اپنی زندگی بدلنے کا نہیں سوچتا؟''

''نہیں کیونکہ ان کے اندر اپنی زندگی بدلنے کی یا اچھی زندگی حاصل کرنے کی امید تک مفقود ہو چکی ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید خدا نے ان کے لیے ایسی ہی زندگی لکھی ہے جس کی وجہ سے وہ ''ایسے'' جی رہے ہیں۔ ورنہ جو امیروں کو دے سکتا ہے وہی غریبوں کو کیوں نہیں دے سکتا؟ جب کہ اس پاک ذات کے اختیار میں تو سب کچھ ہے۔ اگر نہیں ہے کچھ اختیار تو اس کی مخلوق کو نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ خود کو عام سمجھتے ہیں جو بہت چاہنے کے باوجود بھی اپنے حال کو بدلنے کے لیے کچھ نہیں کر پاتے۔'' کمرے میں گونجتی وہ واحد نحیف سی آواز بند ہوئی تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

اس چھوٹے سے کمرے کا لوہے کا بوسیدہ دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ ابھری تو دادی کے پاس بیٹھی بائیس سالہ سیدھی سادھی لڑکی نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا دروازے سے ایک دس سالہ لڑکی کا سر ابھرا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کپ چائے والی پلیٹ تھی اور دوسرے ہاتھ میں بسکٹ والی بچی نے کپ والی پلیٹ لڑکی کو پکڑائی تو نائلہ (لڑکی) بولی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی منال؟ تمہاری امی نے اتنا تکلف کیوں کیا؟''

''آپی امی کہہ رہی تھیں کہ آپ ہماری کہانی لکھنے لگی ہو کیا سچ میں؟'' اس بچی کی آنکھیں خوشی سے اور ایک انجانے احساس سے چمک رہی تھیں۔ پتا نہیں وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی جو ان بے ربط جملوں میں بھی مکمل چھپا ہوا تھا۔

نائلہ نے پیار سے اس کے گال پہ ہاتھ رکھ کر ''ہاں'' میں سر ہلایا بچی نے بسکٹ کی پلیٹ دادی کی چارپائی پر رکھ کر جلدی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا خوشی سے مسکراتے ہوئے۔

''کیا ہم بھی اخبار میں آئیں گے؟''

اب اس سوال کا وہ مناہل کو کیا جواب دیتی؟ جب کہ اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ اس کی یہ کہانی شائع ہو گی بھی یا نہیں۔ وہ پہلے بھی دو تین ڈائجسٹوں میں قسمت آزما چکی تھی لیکن کسی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ شاید اس لئے کہ اس کی طرح اس کے موضوع بھی سادے اور عام ہوتے تھے اور اس کی کہانیوں کے ہیرو ہیروئن تھیں۔

وہ اس حوصلہ شکنی سے اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ کتاب اور قلم سے ناطہ ہی توڑ دیا تھا مکمل طور پہ سوچ لیا تھا کہ اب اپنے دماغ کے خیالات لکھنے کے لیے کبھی قلم نہیں پکڑے گی۔ لیکن یہ جو لکھاری ہوتے ہیں نا، یہ چاہے کچھ بھی کر لیں لکھنا نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ ان کا ذہن انہیں کبھی بھی سکون نہیں لینے دیتا ہے اور ہر وقت نئے نئے موضوعات لے کر انہیں لکھنے پر اکساتا ہے۔

سو نائلہ بھی زیادہ دیر اپنے قلم سے دور نہیں رہ پائی۔ دو ماہ اچھا خاصا رو دھو کے، اداس رہ کر، اپنے غم کا سوگ منا کر وہ پھر سے ایک نئے موضوع کے ساتھ قلم سنبھال کر کھڑی ہوئی۔ اس بار اس کا موضوع ڈر تھا۔

لیکن وہ ایک الگ دکھانا چاہتی تھی۔ جنات اور پریوں کی کہانیوں سے دور ایک عام سا ڈر! جو ہر طبقے کے انسان میں ہو۔

وہ تین چار دن سے گھوم پھر کر وہاں کے بزرگوں کے خیالات سن رہی تھی لیکن کسی نے اسے تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

وہ تو ناامید ہو جاتی اگر اچانک ہی اس کے ذہن میں اس کے اپنے محلے کی سب سے طویل العمر فرد کا خیال نہ آتا جو سارے محلے کی ''دادی'' کہلاتی ہیں۔

اس کے ذہن میں تو چارپائی پر پڑا ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ اور جھریوں سے بھرا نحیف ترین وجود تھا۔ اس نے اپنی امی سے ایک بار سنا تھا کہ دادی کی عمر تراسی یا چوراسی کے درمیان ہے۔ سو اس حساب سے نائلہ کا اندازہ ایسے لگانا بھی ٹھیک ہی تھا لیکن نائلہ نہ صرف حیران ہوئی بلکہ دادی سے مل کر بہت دیر تک تو اس کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ بی دادی ہیں جن کی عمر چوراسی سال ہے۔ کیونکہ دادی اماں ابھی تک مضبوط ہڈی، کافی حد تک اچھی صحت کی مالک تھیں۔ اپنی چوراسی سال کی عمر کے باوجود بھی وہ بنا کسی سہارے کے چلتی تھیں اور ان کے گھر والوں کے مطابق وہ بازار سے سودا سلف بھی لے آتی تھیں اور آج بھی اپنے کپڑے خود ''صابن'' کے ساتھ ہاتھوں سے دھوتی تھیں۔

دادی اچھی بزرگ خاتون تھیں، کم از کم نائلہ کا تو ان کے بارے میں یہی خیال تھا۔ ابھی تو اپنے آرام کرنے کے وقت میں انہوں نے نائلہ کو زندگی کے ڈر کے بارے میں مفید معلومات دینے اور اپنی زندگی کے تجربات بتانے کی حامی بھری تھی۔ اور اسی لیے آج دوپہر دو بجے نائلہ ان کے اس چھوٹے سے کمرے میں موڑھے پر بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ نائلہ کی پشت دروازے کی طرف اور چہرہ دادی کی طرف تھا۔ جس طرف دادی کی چارپائی تھی۔ اسی دیوار پر بہت اور اوپر کر کے ایک مربع شکل کا روشن دان تھا جس پر لوہے کی جالی لگائی گئی تھی۔

دادی چارپائی پر دراز تھیں۔ چھت کو تکتے ہوئے پھر سے گویا ہوئیں۔

''آج کل تو حسن کو پوجا جاتا ہے نا؟ لیکن ہمارے زمانے میں حسن سوہنی صورت کو نہیں کہا جاتا تھا کیونکہ سوہنی صورت تو رب کی دین ہے، اس میں انسان کا کیا کمال؟'' دادی نے بات کرتے ہوئے نائلہ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں۔

''صحیح کہا نا؟''

نائلہ کے منہ سے بھی فوراً نکلا۔

''جی ہاں بالکل!'' دادی نے سلسلہ کلام پھر

سے جوڑا۔

''ہمارے زمانے میں تو کہانیوں میں بھی حسن انسان کے اچھے گن اور اخلاق کو کہا جاتا تھا۔ ہمارے ناولوں کے ہیرو چاہے گورے چٹے نہیں ہوتے تھے لیکن وہ محنتی اور غیریت والے ضرور ہوتے تھے۔

اوہ پتا نہیں کیا کیا بول رہی ہیں یہ؟ میں نے تو انہیں ڈرپر بولنے کو کہا تھا اور یہ اپنی کہانیاں لے کر بیٹھ گئی ہیں۔ نائلہ نے دادی کو بنا رکے بولتا ہوا دیکھ کر کوفت سے سوچا دادی ابھی تک بول رہی تھیں۔

''ڈرائیور، گدھا مزدوری کرنے والا، سیکورٹی گارڈ، دھاڑی دار، کوڑا اٹھانے والے چپڑاسی، ریڑھی لگانے والے، مالی، گوالے، ٹیچر، بھنگی اور مانگنے والوں کی تک سمیت اور بھی بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کو کوئی ہیرو ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا جب کہ اصل زندگی کے ہیرو تو یہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں لامحدود مشکلوں کو سہہ کر بھی اپنا گزارا کر رہے ہیں۔

دادی ایک طویل سانس لیتے ہوئے خاموش ہوئیں شاید وہ بولتے بولتے تھک گئی تھیں لیکن نائلہ حیرانی کے عالم میں متاثر ہوتی دکھائی دے رہی تھیں ان سے حالانکہ بات ابھی تک اس کے موضوع تک نہیں آئی تھی۔ لیکن دادی اماں کی یادداشت اور ذخیرہ الفاظ!

''اوہ خدایا کیا کھاتی ہیں دادی؟'' بہت جلد اس نے اپنی سوچ کا اظہار بھی کر دیا۔

''دادی اماں اتنی زیادہ عمر اور سب یاد ہیں آپ کو؟ کمال ہے! یہ سب کیسے؟'' وہ شاید کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی تھی تبھی تو بے ربط جملے منہ سے نکل رہے تھے۔

دادی اماں نے چھت سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا اور مسکرا کر بولیں۔

''ارے میری بچی'' بوڑھی آواز جاندار تھی۔

''یہ بھی کوئی بھولنے کی باتیں ہیں؟ ساری عمر ان ہی لوگوں کے بیچ گزری ہے اور اب تک گزر رہی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ اس گلی کی نکڑ پر جو گھر ہے نا؟ اس میں مالی الیاس رہتا ہے۔''

وہ شاید کوئی نئی بات بتانے لگی تھیں۔ نائلہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''اس کو ہی دیکھ لو بیچارہ سارا سارا دن گھاس کاٹتا ہے۔ پودوں کے ساتھ لگا رہتا ہے لیکن اس کی آمدنی اتنی بھی نہیں ملتی کہ اپنے بال بچوں کے لیے کوئی مہنگی چیز ہی خرید لے یا انہیں زندگی کی کوئی آسائش ہی دے دے۔''

''ساری گرمی گھر کے آٹھ لوگ ایک پرانے سے پنکھے کے نیچے سڑتے ہیں جو شاید نازو (الیاس کی بیوی) کو جہیز میں ملا تھا۔ بیچاروں کے پاس مچھر کی نکی تک خریدنے کے پیسے نہیں ہوتے۔ سارا رمضان بچے پھلوں کا منہ بازاروں میں دیکھ کر گزارتے ہیں اور عید پرانے کپڑے پہن کر مناتے ہیں جو نازو نے اپنے صندوق میں سالوں سے سنبھال رکھے ہیں۔''

''کیا مطلب دادی؟ ان کے بچے بڑے نہیں ہوتے جو وہ اک ہی کپڑے بار بار استعمال کرتے ہیں۔؟''

''ہوتے ہیں میری بچی لیکن نازو بہت کفایت شعار ہے۔ یا شاید غریبی نے بنا دیا ہے۔ تین چار سال پہلے جہاں الیاس کام کرتا ہے، وہاں مالکن کوئی اور ہوتی تھی۔ اس کے دیئے ہوئے کپڑے نازو نے سنبھال کے رکھ لیے تھے جو ہر عید پر اور خوشی کے موقع پر بدل بدل کر اپنے بچوں کو پہنوا دیتی ہے۔ پہلے اک سوٹ بڑے لڑکی نے پہننا۔ آئندہ سال کے لیے وہ چھوٹی کے کام آتا ہے اور پھر سب سے چھوٹی کے۔''

''اوہ!'' سمجھ آنے پر نائلہ افسوس ہی کر سکی۔

''اچھی تھی وہ بے چاری۔ اس کی اولاد میں سے تو کوئی بھی اس پر نہیں گیا۔''

''کون؟'' نائلہ کا ذہن دادی کی بات سن کر الجھا۔

''وہی پرانی مرحومہ مالکن!'' دادی نے سلجھا دیا۔

''اچھا دادی ایک بات بتائیں۔ اگر الیاس انکل کے حالات اتنے خراب ہیں تو محلے والے ان کی مدد کیوں نہیں کرتے۔؟''

''میری بچی پہلی بات یہ ہے کہ یہ محلہ بھی ان جیسے ہی غریب لوگوں کا ہے لیکن پچھلی بار سب لوگوں نے مل کر تھوڑے سے پیسے جمع کر کے ان کو دینے کی کوشش کی تھی، لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ بہت غیرت و شرم والا ہے الیاس۔ اللہ اس کو آسانیاں دے۔''

نائلہ کو لگ رہا تھا کہ دادی ابھی تک موضوع کی طرف نہیں آئی ہیں لیکن پھر بھی دادی کی باتیں نائلہ کو اچھی لگ رہی تھیں۔

''دادی اماں! ماننا پڑے گا آپ کو۔ کافی علم ہے لوگوں کے حالات کا۔'' کہتے ہوئے نائلہ کا ذہن اچانک ہی پتہ نہیں کیوں دادی کے لیے ''ڈیجیٹل کیمرہ'' کا نام ذہن میں آیا۔ لیکن اس نے زبان سے کہنے کی غلطی نہیں کی۔

''لوگوں کے حالات کیسے بچے؟ یہ سب تو اپنے ہی حالات ہیں۔ اپنے ہی لوگوں کے اپنے ہی محلے والوں کے ہم غریبوں کے گھر اگر کوئی چیز ایک بار ٹوٹ جائے تو سالوں بعد اس کا منہ دیکھتے ہیں۔ دو دو مرلے کے گھر میں آٹھ آٹھ لوگ رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ تو اتنے بدنصیب ہوتے ہیں کہ انہیں پختہ چھت ہی نصیب نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو ہر وقت یہ ڈر رہتا ہے کہ خدا جانے بارش انے پر یہ چھت ابھی ان کے سر پہ رہے گی یا نہیں۔ آج جو روکھی سوکھی کھا رہے۔ وہ کل ان کو نصیب ہوگی بھی یا نہیں۔''

دادی کی آواز میں غمزدگی کی کیفیت آتی جا رہی تھی اور نائلہ کے چہرے پر کوفت کی۔

ایک گھنٹے کی طویل گفتگو میں دادی نے صرف ایک بار ڈر کا نام لیا تھا اور وہ بھی اک عام سا ڈر اب تو اس کے اکیڈمی جانے کا وقت ہو گیا تھا اور اسے ہر حال میں جانا تھا یہاں سے۔

''اچھا دادی۔ اب میں چلتی ہوں۔ میری اکیڈمی کا وقت ہو گیا ہے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔'' وہ اٹھی اپنا سر دادی کے آگے جھکایا کہ وہ پیار کر کے جانے کی اجازت دیں۔ دادی سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''اچھا؟ ٹھیک ہے۔ کرنی تو ابھی بہت سی باتیں تھیں تم سے لیکن تمہارا ٹیوشن جانا بھی ضروری ہے۔ چلو خیر کل آنا تمہیں اور بہت سی باتیں بتاؤں گی۔'' تو وہ مسکرا کر سر ہلاتی باہر نکل گئی۔

رات کو وہ اپنے بستر پر لیٹی دادی کی باتوں کو ہی سوچ رہی تھی۔ خود پر ایک چادر ڈالے ایک بازو کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھے، وہ کھلا آسمان دیکھ رہی تھی۔ آسمان پر ایک بھی ستارہ نہیں تھا۔

''سارے تارے کہاں چلے گئے؟'' خالی آسمان دیکھ کر جانے کیوں اس کا دل اداس ہوا تھا۔ وہ ہر وقت پڑھائی کرنے والی لڑکی تھی۔ اسکول سے گھر، گھر سے اکیڈمی بس یہی اس کی زندگی تھی۔ اپنی اس روٹین لائف سے کبھی باہر نکل کر اس نے کچھ دیکھا یا سوچا بھی نہیں تھا۔

اور پھر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

''کیا سچ میں الیاس چچا کے حالات اتنے خراب ہیں؟''

صبح اسکول میں بھی وہ دادی والی باتوں کو سوچتی رہی۔ بچوں کو بھی اچھے سے نہ پڑھا سکی۔ اسکول سے چھٹی پر وہ گھر جانے کی بجائے سیدھا دادی اماں کے گھر چلی آئی۔

''السلام علیکم!'' لوہے کے اس بوسیدہ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ جوش بھرے انداز میں بولی لیکن سامنے دادی اماں کو چارپائی پر نماز پڑھتا دیکھ کر اس کے منہ سے بے اختیار ''اوہ'' نکلا۔ سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور وہ چپ چاپ موڑھا کھینچ کر چارپائی کے پاس اپنی کل والی جگہ پر بیٹھ گئی۔

دادی اماں نماز و دعا سے فارغ ہوئیں تو اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

''دو بج گئے؟''

''نہیں دادی اماں ابھی تو ایک بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ مجھے آپ سے اور باتیں سننے کی اتنی دلچسپی تھی کہ رہا نہیں گیا دو بجے تک۔'' اس نے جلدی سے وضاحت دی۔

''چلو اچھا ہے۔ کسی کو تو ہم بوڑھوں کی باتوں میں دلچسپی ہوئی۔'' دادی مسکرائیں انہوں نے تکیہ کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اس کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی تو نائلہ نے جلدی سے سرکتا ہوا تکیہ ہاتھ سے پکڑا اور ٹیک لگانے میں دادی کی مدد کی۔

''دادی اماں! اک بات پوچھوں؟'' اس نے واپس موڑھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ دادی نے سوالیہ نظروں ہی دیکھا تو نائلہ بولی۔

''آپ کل کہہ رہی تھیں کہ ہم غریب لوگوں کی زندگی تنگ ہوتی ہے؟'' دادی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں، شاید آگے بولنے کا انتظار تھا کہ مدعا کھلے۔

''تو میں سوچ رہی ہوں کہ ہمارے محلے میں اچھی حیثیت کے چند ایک لوگ تو رہتے ہوں گے۔ انہوں نے کبھی توجہ نہیں دی بھائی چارے کے طور پہ ہی سہی؟''

''اسلام میں تو ہمسائے کے بہت سے حقوق ہیں بیٹا، یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص کھا کر سویا اور اس کا ہمسایہ بھوکا سویا تو خدا اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔'' دادی اتنا بول کر چپ ہو گئیں۔

''اسی پر تو پوچھ رہی ہوں دادی، انہوں نے کبھی توجہ کیوں نہیں دی؟'' الجھن تھی کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''اس لئے کہ سب کو اپنی اپنی پڑی ہے، لوگ خدا کی باتوں اور خدا کو بھول گئے ہیں۔ یہ زندگی چند روز کا میلہ ہے۔ کتنا جی لیں گے ہم؟ آخر اس نے ختم ہونا ہے۔ بس اللہ کا ڈر نہیں رہا لوگوں میں کہ اس کو حساب بھی دینا ہے۔'' دادی نے اک لمبی سانس لی اور سلسلہ کلام جوڑا۔

''رہی بات امیر لوگوں کی تو کن امیر لوگوں کی بات کر رہی ہو؟ ان کی جو اپنے پیسے پر ہر وقت غرور کرتے ہوئے اکڑ کر چلتے ہیں۔ یا ان کی جو اللہ کی لازوال نعمتوں کے ہوتے ہوئے بھی شکر نہیں کرتے اور نہ ان نعمتوں میں سے کسی غریب کو تھوڑا سا بھی دیتے ہیں؟ اور خود اپنے دستر خوان پر ہزاروں نعمتوں کو سجا کر بیٹھتے ہیں لیکن اگر خدا کی راہ میں کوئی مانگنے والا آ جائے تو گالیاں بکتے ہیں؟ یا پھر ان لوگوں کی جو اپنے کتے بلیوں کے لیے تو ہر ہفتے ہزاروں کے سکٹ خرید لیتے ہیں لیکن اپنے ملازمین کو جو ان کے لیے کام کرتے ہیں انہیں پوچھتے تک نہیں؟''

دادی نے چپ ہو کر نائلہ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہوں کیا ان ہی کو امیر کہتے ہیں؟

''کہتے تو انہیں بھی امیر ہی ہیں جن کے پاس پیسے ہوتے ہیں نا؟ دادی کو چپ دیکھ کر اسے بولنا ہی پڑا۔ لیکن اس سے جواب نہیں بن رہا تھا کیا کہے۔ وہ تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ جن کے پاس پیسے ہوں، گاڑیاں بنگلے ہوں، وہ امیر ہوتے ہیں۔

''نہیں نائلہ بچی، یہ لوگ امیر نہیں قرضدار ترین لوگ ہوتے ہیں۔'' دادی نے ایک نئے فلسفے کے ساتھ نفی کی۔

''وہ کیسے؟ ان کے پاس تو خود بہت سے پیسے ہوتے ہیں، پھر وہ قرضدار کیسے ہوئے دادی؟'' وہ چونکتے ہوئے ہچکچاہٹ سے بولی کی مبادا کہ دادی کو برا لگے۔

''اسی لیے تو.....'' دادی نے تو پر کچھ اس طرح زور ڈالا کہ نائلہ کی ساری توجہ پھر سے یکجا ہو کر دادی پر ہو گئی۔

''وہ پیسے ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتے ہیں جو یہ لوگ اپنی تجوریوں میں بھر لیتے ہیں۔ جب کہ حدیث مبارکہ بھی ہے کہ جو چیز تمہارے پاس تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو سمجھ جاؤ کہ وہ کسی اور کا حق ہے جو تمہارے پاس امانت ہے۔ سو حقدار کو اس کا حق دو۔

لیکن یہ لوگ سمجھیں تب نا!''

''تو اس کا مطلب کہ امیر ہوتے ہی نہیں ہیں دنیا میں؟'' نائلہ بمشکل بول پائی۔

''ہوتے ہیں، بالکل ہوتے ہیں۔ امیر ہونے کا مطلب دولتمند ہونا نہیں ہوتا۔ امیر ہر وہ انسان ہے جس کے پاس ''احساس'' ہے جو دوسروں کا دکھ سمجھتا اور دور کرتا ہے۔'' دادی نے چھوٹا سا سانس خارج کیا اور پھر سے بولنے لگ گئی۔

پھر چاہے پچھلی گلی میں رہنے والی راشدہ ہو جو ہر شام کسی ایک ضرورت مند کو روٹیاں بھیجتی ہے یا سامنے گھر کی زلیخہ ہو جو ہر روز اپنے گھر سے شام کا کھانا اپنے ہمسایہ کے گھر بھیجتی ہے یا پھر گھر گھر جا کر بھیک مانگنے والی رمضانہ ہو جو دو معذور لوگوں کا خرچہ بھی اٹھائے ہوئے ہے۔

ایک بھیک مانگنے والی اور امیر؟ بات کچھ سمجھ نہیں آئی دادی اماں، پچھلی بار بھی آپ نے اس کو ہیرو کہا تھا۔ بھیک مانگنے کی عادت تو بری ہے نا؟ پھر وہ امیر یا ہیرو کیسے ہو سکتی؟'' کل سے نائلہ کے ذہن میں آیا سوال آخر کار لبوں پر آ ہی گیا۔

''ہر انسان اپنی زندگی میں ہیرو ہوتا ہے اور پھر امیر ہونے کے لیے پیسے نہیں ''احساس'' چاہیے۔

''احساس اس میں بہت ہے۔ سو وہ بھی ہیرو اور امیر دونوں ہی میری نظر میں۔''

''مگر کیسے؟ آپ یہ سب کیسے کہہ رہی ہیں دادی؟ مجھے ان کی زندگی کی کہانی بھی سنائیں۔''

''اچھا تو سنو، تم ٹھیک کہتی ہو کہ بھیک مانگنا برا فعل ہے لیکن کچھ لوگوں کی مجبوری ہوتی ہے جیسے کہ رمضانو اس کا شوہر شادی کے چوتھے سال ہی اک حادثے کا شکار ہو کر چل بسا۔ تب تک وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ رنگ روپ تو تھا نہیں سو لوگوں کے گھروں کا کام پکڑا۔ چار چار گھر اس نے شروع میں کام کے لیے لئے تھے۔ لیکن سارا دن کام کر کے تھکن سے چور ہو کر جب شام کو آٹھ یا نو بجے گھر آتی تو کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا اور بستر پر آتے ہی سو جاتی تھی۔''

''اوہ تو وہ شروع سے بھکارن نہیں تھی۔'' نائلہ نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''نہیں وہ لوگوں کے کام کرتی تھی پھر بھی جب پورے مہینے کے بعد لوگ اس کو تنخواہ یعنی پندہ سو نکال کر دیتے تو ہزاروں باتیں سناتے تھے۔ چاروں گھروں کو ملا کر مہینے بعد چھ ہزار گھر آتے تھے۔ اس کا شناختی کارڈ تو تھا نہیں جو کسی فیکٹری میں کام کر لیتی، صبر شکر کر کے زندگی گزار رہی تھی کہ اک دن اس کو گھر آتے ہوئے ایک بوڑھی عورت زخمی حالت میں ملی۔

جب تھوڑی دیر تک دادی خاموش رہی تو نائلہ کو بے چینی نے گھیرا خود ہی بول اٹھی۔

''پھر کیا ہوا دادی؟''

ہونا کیا تھا؟ اس نے اس بوڑھی عورت کو بنا سوچے سمجھے اٹھایا اور کسی نہ کسی طرح سہارا دے کر پاس کے کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ یہ بھی اتفاق تھا یا اس کی آزمائش کہ اس کو تنخواہ ملی تھی مہینے بھر کی اسی دن ڈاکٹر نے اس زخمی عورت کی پٹی کی اور اس کو ہسپتال میں داخل کروانے کا کہا۔

سرکاری ہسپتال میں بھی دوائیوں اور انجکشن پر کافی پیسے لگ گئے۔ زخم گہرا تھا۔ تکلیف بہت زیادہ تھی کم ہونے میں ایک ہفتہ گزر گیا اور اس ہفتے میں رمضانو کام پر نہ گئی۔ ہفتے بعد جب وہ ساری تنخواہ خرچ کر کے۔ 3 ہزار کا قرض خود پہ چڑھا کر واپس کام پر گئی تو پتا چلا ان لوگوں نے نئی نوکرانی رکھ لی ہے۔ بھئی ہفتہ بھر کون سارے کام خود کرتا گھر کے۔

وہ اس دن شاید بہت روئی تھی گھر آ کر۔ بس تبھی سے اس نے بحالت مجبوری یہ کام شروع کیا تھا۔ اس کام کے دوران اس کو ایک اور بوڑھی عورت سڑک کے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر روتی ہوئی ملی۔ رمضانو اس کو بھی ماں بنا کر گھر لے آئی۔ اب اپنے دو بچوں؟ کے ساتھ ساتھ وہ ان دو بوڑھی عورتوں کو بھی اکیلی سنبھالتی ہے۔ اپنے بچوں کو اسکول ڈالا ہوا ہے اس نے انہیں

بڑا افسر بنانا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنی ماں جیسی زندگی نہ گزاریں صبح اپنے گھر کا کام کر کے نکلتی ہے اور شام تک واپس آجاتی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کو بدلنے کی امید چھوڑ دی ہے۔ اب اس کا سب کچھ اس کے بچے اور وہ منہ بولی مائیں ہیں۔ اپنا آپ تو بھول ہی گئی ہیں۔ اسی لیے میری نظر میں وہ اہم ہے۔ جو خود کی بجائے دوسروں کا سوچتی ہے۔''

دادی اماں بولتی جارہی تھیں اور نائلہ پر جیسے سکتہ طاری ہو چکا تھا۔ وہ تو آج تک بھیک مانگنے والوں کو برا سمجھتی آئی تھی، کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ ان کی زندگی کتنی تکلیف دہ ہوگی؟ جو اپنی عزت نفس کی پروا کیے بغیر دوسروں کی زندگیوں کا بیڑا اٹھاتے ہیں تاکہ دوسروں کو معاشرے سے بھیک نہ مانگنی پڑے۔

دادی کچھ سوچ کر ہلکا سا ہنسیں تو نائلہ کا سر ٹوٹا۔ نائلہ دادی کی طرف متوجہ ہوئی ''چلو اچھا ہوا کسی نے ہی سہی، ان غریبوں کی زندگی کو لکھنے کے بارے میں سوچا تو سہی۔''

نائلہ کے پوچھے بنا ہی دادی نے خود ہی بتادیا۔

''آج کل کے لوگوں کو ہیرو ہیروئن کے حسن اور ان کی محبت کی کہانیوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔ کسی نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ ان غریب لوگوں کی زندگی میں بھی کچھ ہوسکتا ہے۔ یہ غریب لوگ کم از کم ''آج کل کے امیروں'' سے تو بہتر ہی ہو سکتے ہیں جنہیں اپنی ذات سے باہر نکلنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔''

''ہوں'' آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں دادی اماں چلیں آس پاس کے کچھ اور لوگوں کی زندگی پر بھی ذرا نظر ڈال دیں۔ شاید ان نام نہاد امیروں کے ضمیر میں خدا کا ڈر جاگ جائے اور ہر انسان خود میں احساس پیدا کر کے امیر بن جائے تو میرے لکھنے کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔

نائلہ جانتی تھی کہ کہانی پٹڑی سے ہٹ چکی ہے لیکن اب اسے دلچسپی ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ زبان خود بخود پھسل گئی۔ وہ خود میں اپنی سوچ میں کوئی ہلکا سا بدلاؤ محسوس کر رہی تھی، مگر وہ بدلاؤ کیسا تھا؟ اسے علم نہیں تھا۔

''تم نے کبھی اک ڈرائیور کی زندگی پر غور کیا ہے؟'' دادی نے نظریں دیوار پر جماتے ہوئے پرسوچ انداز میں پوچھا۔

تو نائلہ نے سر فوراً نہیں میں ہلایا لیکن دادی اسے دیکھ ہی کہاں رہی تھیں خود ہی بولنے لگ گئیں۔

''تم نے تنویر حسین کا نام تو سنا ہوگا، یہ دو گھر چھوڑ کر بغل میں رہتا ہے۔ وہ ایک ڈرائیور ہے۔ میں تمہیں اس کی زندگی کی کہانی سناتی ہوں۔

بھلا بچہ ہے میری آنکھوں کے سامنے ہی پلا بڑا اور زندگی گزاری ہے۔'' نائلہ دم سادھے دادی اماں کو سن رہی تھی۔ خدا جانے کیا نکلے گا دادی کی یادوں کی پٹاری سے۔

تنویر حسین کا باپ شوکت حسین ایک سیکورٹی گارڈ ہے۔ وہ بھی ایک غریب باپ کی اولاد تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب لوگ لالٹین جلا کر راتیں گزارا کرتے تھے۔ شوکت علی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن ان کے گھر میں لالٹین خریدنے کے پیسے نہیں تھے، ایسے میں گھر والے کتابیں کہاں سے لا کر دیتے؟ لیکن وہ ہمت ہارنے والا بچہ نہیں تھا، اس نے امی اور چچا کو بتائے بنا ہی تعلیم شروع کی۔ دوسرے بچوں سے کتابیں مانگ کر رات کو چاند کی روشنی میں پڑھا کرنا اور صبح محلے کے مولوی صاحب سے سبق لینا۔

یہ سلسلہ آٹھویں جماعت تک چلا اور تب تک وہ قرآن پاک مکمل پڑھ چکا تھا۔ جب اس نے اپنے قرآن پاک مکمل پڑھ لینے کی بات امی اور چچا کو بتائی تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ساتھ ہی بے یقینی کا عالم بھی۔ چچا نے تصدیق کے لیے مولوی صاحب سے جا کر پوچھا تو مولوی صاحب بولے۔

''شوکت بہت ہی عقلمند اور دانا لڑکا ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ یہ ہوشیار ہے۔ دوسرے بچوں کی نسبت اس نے قرآن پاک جلدی پڑھ لیا ہے۔ تم کچھ میٹھا بانٹو۔'' وہ یہ سن کر واپس گھر آگئے اور سارے

راستے روتے آئے کہ ان کے پاس بیٹھا بانٹنے کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔

شوکت حسین نے تب دانائی کا کام کیا کہ چچا سے کہا۔

''آپ کچھ نہیں بانٹ سکتے تو کوئی بات نہیں چچا، مجھے کوئی دکھ نہیں، بس آپ کی اور امی کی دعائیں ہی کافی ہیں۔''

دن گزرتے گئے، شوکت کی عمر بھی بڑھی شادی ہوئی اور بچے بھی۔ خدا نے دو بیٹیاں اور دو بیٹے دیے۔ بچوں کی پیدائش کے وقت شوکت نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو اس طرح ترس کھا کھا زندگی گزارنے کے لیے نہیں چھوڑے گا۔

اور پھر وقت گواہ ہے کہ شوکت نے دن رات دیکھے بنا اتنی محنت کی کہ پورے علاقے میں اس سے زیادہ کھاتا پیتا کوئی نہ تھا۔

لیکن قسمت نے بے وفائی کی اور غریبی نے ایک بار پھر ڈیرہ جمالیا۔ غربت کے عالم میں ہی شوکت نے دونوں بیٹوں کی شادیاں کردیں۔ اخراجات بڑھے ذمہ داریاں بڑھ گئیں اور سب چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو پھر سے ترسنے لگے۔

دادی کی آواز میں افسردگی نمایاں تھی۔ دادی خاموش ہوئی اور چند لمحے ایسے ہی گزر گئے تو نائلہ جو سر جھکا کر شارٹ پوائنٹس لکھ رہی تھی، اس نے سر اٹھایا اور بولی۔

''تنویر انکل کی اولاد کا آگے کیا بنا؟ کیا ان کی اولاد میں سے کوئی حالات نہیں بدل سکا؟''

اس کا سب سے بڑا بیٹا معذور تھا۔ دوسرے نمبر والی بیٹی کی شادی کردی تھی اور تیسرے نمبر والی بیٹی لکھاری بننا چاہتی ہے تمہاری طرح۔ اس کی ایک دوست ہے کوئی گدھا مزدوری کرنے والے کی بیٹی، وہ بھی اس جیسا ہی شوق رکھتی ہے۔ یہی ناول لکھنا پڑھنا یا شاعری کرنا۔ دونوں ایک جیسے حالات سے گزر رہی ہیں۔ بس یہی چیز ان کی دوستی کو مضبوط کر گئی۔ ایک ساتھ ہی میٹرک کر کے دونوں نے چھوٹے چھوٹے جابز پکڑ لی ہیں۔ تنویر کی بیٹی اب ٹیچر ہے۔ پانچ ہزار ماہانہ ملتا ہے اس کو اور اس کی دوست اب کوئی الم غلم کورس کر رہی ہے۔ بس زندگی گزر رہی ہے۔ دونوں کو خدا کا شکر ہی کرتے دیکھا ہے میں نے۔

چوتھے نمبر والی بھی بیٹی ہے، پارلر کا کام اور سلائی وکڑھائی کے کام میں اہر ایک بھائی ہے اس کے بعد اس کی آواز میں بہت سر ہیں لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ آداب کسی کی جاگیر نہیں ہوتے تو بس تمیز داری میں وہ ایسا ہے۔ اور آخر میں ایک بیٹی ہے، فاطمہ نام ہے اس کا شرارتی اور ہنس مکھ ہے زندگی کی ہر فکر سے آزاد۔'' دادی ہلکا سا مسکرائیں۔

''اوہ نائلہ نے لمبی سانس چھوڑی۔ موڑھے پر پہلو بدلا۔ وہ ایک طرف بیٹھی بیٹھی تھک گئی تھی۔ دادی اماں خود ہی دوبارہ گویا ہوئیں۔

''اب میں تمہیں ساتھ والے گھر کا حال بتاتی ہوں۔ اس گھر میں کل چھ لوگ ہیں۔ ایک اسلم مزدور، تین اس کی بیٹیاں اور دو بیٹے۔ اسلم کی بیوی اسے چھوڑ کر دبئی جا چکی ہے۔ دو بیٹیاں بڑی ہیں اور پھر تیسرے نمبر پر بیٹا، نہ پڑھائی کرتا ہے اور نہ کام کاج۔ ایک نمبر کے آوارہ لڑکوں سے مراسم بڑھا رکھے ہیں۔ بڑی دونوں بہنیں اسکول میں پڑھاتی ہیں اور اسی اکیڈمی میں ان کے چھوٹے بہن بھائی پڑھتے ہیں۔ بیوی کے جانے کے بعد اسلم نے دوسری شادی کا نہیں سوچا اور بچوں کی ذمہ داری اپنے سر لے کر پوری ایمانداری سے آج تک نبھا رہا ہے۔''

''دادی اماں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کام کیا کرتے ہیں؟''

''اوہ ہاں، اسلم فیکٹری میں مزدوری کرتا ہے۔ بہت اچھا انسان ہے بے چارہ بلکہ میری نظر میں تو وہ بھی ہیرو ہی ہے جو بھری جوانی میں دوسری شادی کرنے کی بجائے بچوں کا ہو کر رہ گیا۔ وہ فیکٹری کے کام کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کے لیے صبح کا ناشتہ بناتا ہے۔ ان کو

اسکول چھوڑ کر کام پر جاتا ہے۔ بچوں کو زندگی کی تمام سہولتیں دینے کے لیے سارا دن لگا رہتا ہے۔''

''دادی اماں وہ دوسری شادی کیوں نہیں کرتا؟ جب کے اس کی ذمہ داری اور زندگی آسان ہو جائے گی؟'' اس نے ماتھے پر سلوٹیں لے کر الجھن کے عالم میں پوچھا۔

ڈرتا ہے وہ اب شادی کے نام سے بھی ایک عورت بھگت چکا ہے۔ دوسری اس ڈر سے نہیں لاتا کہ پتا نہیں وہ کیسی ہوگی؟ اس کے بچوں کے ساتھ کیسا سلوک کرے گی۔ اب تو ویسے بھی بیٹیاں بڑی ہوگئی ہیں۔ ان کی فکر میں رہتا ہے۔''

''اوہ، سو سیڈ، ان کی بیوی نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''ہوں جیسی کرنی ویسی بھرنی بھگتتی پھرے گی اپنا کیا ہوا۔'' نائلہ نے دادی کی بات سن کر لاشعوری طور پر اپنے بیگ سے فون نکال کر ٹائم دیکھا۔

''اوہ نو، چار بج گئے آج تو بڑی بے عزتی کر دینی ہے سر نے میری۔'' باتوں باتوں میں اسے وقت کا پتا ہی نہ چلا تھا۔

''آج تو آپ نے اتنی مزے کی کہانیاں سنائی ہیں کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''یہ کہانیاں نہیں ہیں بچی، یہ چلتی پھرتی زندگیاں ہیں۔ چلتے پھرتے، جیتے جاگتے وہ ہیرو جن کو یہ دنیا حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے لیکن پھر بھی یہ جیتے ہیں، بنا کسی کی پروا کیے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔''

''اچھا سوری، اب مجھے اجازت دیں کل آؤں گی۔'' اس نے سر نیچے کیا اور دادی کے ہاتھ پھیرتے ہی وہ جلدی سے دروازے سے باہر نکل گئی۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو حسب معمول دادی کی باتیں ذہن میں گونجتی رہیں۔ وہ بھی فلموں کے ہیروز کو مانتی تھی یا پھر اپنے وطن کی حفاظت کرنے والے مجاہدوں کو لیکن اس نظریے سے اس طرح سے تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کے تو کبھی خواب میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہمارے آس پاس رہنے والے عام طرح کے انسان بھی اپنی زندگی میں ایک ہیرو کا کردار ادا کر رہے ہیں چاہے وہ گورے نہیں ہیں۔

چاہے وہ دولت والے نہیں ہیں۔

چاہے وہ دنیا کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

وہ ان کے لیے کتنے ''خوبصورت'' اور دل کے کتنے ''امیر'' ہیں۔ وہ ان کی زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں کتنی ''حیثیت'' رکھتے ہیں ان کے لیے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے روپ و حالات چاہے اچھے نہ ہوں لیکن ان کے دل، ان کی روح بہت خوبصورت ہے۔

سوچ سوچ کے اس کا سر بہت درد ہونے لگ گیا تھا۔ اس نے صبح وہ بچوں پر دھیان نہ دے سکی، دس بجے ہی اسکول سے نکل آئی۔ بلا ارادہ ہی اس کے قدم دادی کے گھر کی طرف اٹھے تھے۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر مناہل نے دروازہ کھولا۔

''مناہل وہ دادی اماں۔'' اپنے اس وقت آنے کا اس کو کوئی بہانہ نہ ملنے پر اس کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا۔

آپی دادی تو باہر سے سودا لینے گئی ہوئی ہیں۔ آپ اندر آجائیں وہ آنے والی ہوں گی۔'' دونوں طرف چٹیا کیے ہوئے وہ معصومیت سے سر ہلاتی بول رہی تھی۔

نائلہ ''اچھا'' میں سر ہلاتی دروازے سے اندر داخل ہوگئی اور مناہل کے پیچھے چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوگئی۔ یہ ہی دادی کا کمرہ تھا۔ وہ ایک طرف پڑا ہوا موڑھا پکڑ کے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی۔

''آپی پانی لاؤں آپ کے لیے؟'' مناہل جو ابھی تک اس کے پاس کھڑی تھی، بولی۔

''نہیں مناہل، بس دادی اماں سے کہانی کے بارے میں بات کرنے کے لیے آئی ہوں۔ کب کی گئی ہوئی ہیں دادی؟'' اس نے بلا وجہ کی وضاحت دینی شروع کر دی۔

''کافی دیر کی گئی ہوئی ہیں۔ اب تو آنے والی

ہیں۔ اچھا آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کہانی لکھ لی؟'' مناہل نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں بس تھوڑی سی رہ گئی ہے۔'' اس نے امید بھرے تاثرات سے کہا۔ کیونکہ لکھنا اس کے بس میں تھا، اب شائع ہوگی یا نہیں، اس بات کا تو اسے بھی یقین نہیں تھا۔

''آپی میں آپ کی اسٹوری میں ہوں؟'' یہ ایک غیر متوقع سوال تھا جو مناہل نے بہت اشتیاق سے پوچھا تھا۔ نائلہ کا ہرن پل بھر میں ایکٹو ہوا۔

''تم؟'' نائلہ نے یقین کرنا چاہا کہ جو اس نے سنا ہے وہی بات مناہل نے بولی ہے۔

''ہاں، کیوں میں آپ کی کہانی میں کہیں نہیں ہوں؟'' نائلہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا وہ کہتی کیا؟ مناہل کے چہرے پر ایک پرل میں ہی اداسی جھلکی۔

اس کا مطلب جب TV والے آئیں گے تو وہ میری ویڈیو نہیں بنائیں گے؟'' اس کی امید پل بھر میں نا امیدی میں بدلی۔

''بھلا TV والے کیوں آئیں گے میری گڑیا؟'' نائلہ نے مناہل کو بازو سے پکڑ کر موڑھے پر بٹھاتے ہوئے پیار سے پوچھا۔

''کیونکہ آپ کہانی لکھ رہی ہیں نا ہماری، پھر جب یہ اخبار میں چھپے گی تو لوگوں کو پتا چلے گا کہ ہم کتنے غریب ہیں۔ پھر TV والے ہمارے ویڈیوز بنا کر لے جائیں گے اور پھر حکومت ہماری مدد کرے گی ہے نا؟'' اس نے جوش سے اپنی معلومات انگلیوں پر باری باری گن کے بتائی۔ کسی بڑے سے سنا ہوگا یہ سب جو اپنے ذہن میں بٹھالیا تھا۔

''یا خدا، کتنی امیدیں لگالی ہیں لوگوں نے مجھ سے اور میں تو ایک عام سی بندی ہوں جس کو تو نے تھوڑا بہت لکھنے کی توفیق دی ہے۔ پتا نہیں لوگوں کو میری بات سمجھ آئے گی بھی یا نہیں۔ خدا ہی جانے میں ان غریب لوگوں کی آواز اوروں تک پہنچا سکوں گی یا نہیں۔ اور ادھر یہ لوگ مجھ سے کیسی کیسی امیدیں لگا بیٹھے ہیں۔'' وہ مناہل کو اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر پریشانی کے عالم میں سوچے جا رہی تھی کہ مناہل کی آواز نے ہوش دلایا۔

''بتاؤ نا آپی، میں آپ کی کہانی میں ہوں؟''

نائلہ نے ''ہاں'' میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ میں بھی ایک امید کی ڈور تھمادی۔

''نائلہ میری بچی آج اتنی صبح کیسے آ گئی؟'' دادی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نائلہ سوچوں میں اتنی گم تھی کہ اسے پتا ہی نہیں، دادی اماں کب کمرے میں آئیں پھر نائلہ نے فوراً سلام کیا۔

''السلام علیکم دادی۔''

''وعلیکم السلام'' دادی نے جواب دیا۔

''وہ بس آپ سے باتیں کرنے کا دل کر رہا تھا تو رہا نہیں گیا۔''

''اچھا یہاں تو اپنے ہی لوگ میری باتوں سے بھاگتے ہیں۔ اور ایک تم ہو جس کو میری باتیں اچھی لگتی ہیں۔ میں ویسے بھی تمہیں آج محلے کے اسکول ماسٹر کی بات سناؤں گی۔'' مناہل کی ماں نے اس کو آواز لگائی جس کی وجہ سے وہ بھاگ کر کمرے سے جا چکی تھی اور دادی اماں حسب عادت اپنی پٹاری کھول چکی تھیں۔

''ہمارے محلے کا جو واحد اسکول ہے نا، جس میں اب تم ٹیچر ہو، یہ اسی اسکول کے ایک ماسٹر کا احوال ہے۔'' نائلہ چپ رہتی اگر اسے یہ سمجھنے میں مسئلہ نہ آتا کہ ماسٹر وہ کس کو کہہ رہی ہیں۔

''ماسٹر کا؟ کیا مطلب دادی؟ کوئی ٹیچر تھا یا پرنسپل؟''

''وہ ایک پرنسپل تھا اور اپنے شاگردوں کا ٹیچر بھی۔ تم کہہ سکتی ہو کہ وہ ایک پرنسپل نما ٹیچر تھا۔ بہت ہی بھلا انسان تھا۔ اپنے محلے کی ہی نہیں بلکہ سارے علاقے کے بچوں کو بنا فیس اور کم سے کم فیس میں پڑھاتا تھا۔ وہ سب کے ساتھ اچھا تھا۔

لیکن جب اس کو ضرورت ہوتی کوئی اس کے کام نہ آتا۔ وہ صبر شکر کر کے پھر بھی اسکول کا نظام چلاتا رہا۔ اس نے اپنی ساری جمع پونجی اور اپنی زندگی کے قیمتی سال اس علاقے کے بچوں کی تعلیم و تربیت پر لگا دیے۔ انسان کے روپ میں فرشتہ تھا۔ بس حالات اور یاروں نے ساتھ نہیں دیا اس کا جب اس کی جیب میں پیسے ختم ہوئے تو اسکول کا کرایہ اور اخراجات سر پر چڑھتے گئے۔ آخر کار ہمت ہار گیا بیچارہ۔ خالی ہاتھ کب تک لڑتا حالات سے؟ سفر کرنا اور قدرت کی خوبصورتی دیکھنا بہت پسند تھا اسے، بہت زندہ دل انسان تھا لیکن اسکل کے لیے اس نے اپنے شوق کو بھی چھوڑ دیا۔ ہر طرح سے کوشش کی تھی اس نے کہ وہ اپنے اس نیک کام سے نہ ہٹے۔ اتنے برے حالات میں بھی وہ اکثر ایک شعر بولا کرتا تھا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

اور اس کی اک بہت لاڈلی شاگردہ بھی اس کی ہر بات کے بدلے ایک شعر لازمی بولا کرتی تھی۔

محبت کرنی ہے تو خدا سے کر فراز
ان مٹی کے پتلوں سے وفا نہیں ملتی

''واہ کمال کی بات ہے دادی اماں، آپ کو تو اشعار بھی یاد ہیں اس عمر میں۔''

''ہاں، بس زیادہ نہیں کوئی کوئی آجاتا ہے ذہن میں۔ جب تمہاری عمر میں تھی تو پورے پورے دیوان یاد کیے تھے۔''

نائلہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ سر میں درد کی شدید لہر اٹھی۔ وہ بے ساختہ ''اف'' کہتے ہوئے دونوں انگلیوں اور انگوٹھے سے سر پکڑ کر رہ گئی۔

''کیا ہوا میری بچی؟ سب ٹھیک ہے ناں؟ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔'' نائلہ کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر دادی اماں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں بس سر میں درد ہے دادی، اچھا اب میں چلتی ہوں گھر جا کر آرام کروں گی تو شاید تھوڑا سکون مل جائے۔''

''ہاں ٹھیک ہے، جا کر کوئی دوائی بھی لینا، پھر جلدی سے ٹھیک ہو کر آنا، میں نے تم سے اور بہت سی باتیں کرنی ہیں میری بچی۔''

''اچھا دادی اماں۔'' وہ بیگ سنبھالتی ہوئی اٹھی۔ ایک ہاتھ ہنوز کنپٹی کو دبا رہا تھا۔ گھر آنے تک اس کا سر درد شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس کی والدہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے شدید ذہنی دباؤ بتا کر تین دن مکمل ریسٹ کے ساتھ ہر وقت خوش رہنے کا کہا۔

نائلہ کی ماں نے اسے تین دن تک نہ گھر سے باہر قدم رکھنے دیا اور نہ گھر کا کام کرنے دیا۔ چوتھے دن بھی اس پر ہلکے ہلکے بخار کا اثر تھا۔ جب منابل اس کو بلانے آئی۔

''آپی دادی اماں آپ کو بلا رہی ہیں، جلدی آئیں۔'' ہمیشہ کی طرح اپنی دونوں چٹیوں کو ہلا ہلا کر بولتے ہوئے کہا۔

نائلہ نے امی سے اجازت لے کر بڑی سی چادر میں خود کو لپیٹا۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ دادی کی چارپائی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ دادی کا ہاتھ نائلہ نے پکڑ رکھ رکھا تھا جو بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔

''دادی آپ کی طبیعت تو بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''ڈاکٹر کب تک ساتھ دے سکتا ہے میری بچی؟ اس عمر میں تو خدا کے بھیجے ڈاکٹر کی آس رہتی ہے۔'' دادی نے سانس روک روک کر تین چار ٹکڑوں میں جملہ مکمل کیا۔

''اچھا اچھا بولیں دادی۔'' نائلہ کو ان سے لگاؤ ہو گیا تھا بہت۔

''یاد آیا..... میں نے تمہیں..... بلایا تھا..... تمہیں اس پٹھان کا پتا ہے نا؟ وہ جو گلی کے آخر میں..... چنے کی ریڑھی لگاتا ہے.....'' دادی نے بات مکمل کر کے نائلہ کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں پتا ہے۔ کیوں کیا ہوا؟'' نائلہ کی

آنکھوں میں دادی کی حالت دیکھ کر ہلکے ہلکے آنسو آ گئے تھے۔ کہاں بنا رکے اتنی لمبی لمبی کہانیاں سنانے والی دادی اور کہاں اب یہ حال ہو گیا تھا کہ ایک بھی بات ان سے نہیں ہو رہی تھی۔

اس کا جو سب سے..... بڑا بیٹا ہے نا..... وہ بھی اپنے باپ کی طرح ریڑھی لگاتا ہے۔'' دادی بات کر کے رکیں۔

''ہاں دادی ہوا کیا ہے؟''

'' بات یہ ہے میری بچی، وہ کلموہا..... چپس لگانے کے..... ساتھ ساتھ لڑکیوں پر بھی..... (لمبا کھینچ کر لیا گیا سانس)..... گندی نظریں جما کر رکھتا ہے..... میں نے کئی بار اسے..... باتوں باتوں میں..... منع کیا ہے..... لیکن وہ یا تو صاف مکر جاتا ہے یا پھر..... بدتمیزی کرتا ہے..... وہ کسی کو کان و کان خبر نہیں ہونے دیتا..... لوگوں کے سامنے شریف بن کر رہتا ہے مگر..... یہ تو وہی لڑکیاں جانتی ہیں..... کہ وہ کتنی..... گندی نیت رکھتا ہے۔ (آواز بھاری ہوئی اور کھانسی آ گئی)..... جو اس کی ان گندی نظروں کا سامنا کر چکی ہوں..... یا ہر روز کرتی ہیں..... اس کا باپ..... عزت داد انسان ہے..... کام کام ہو یا زیادہ..... شکر کرتا ہے خدا کا۔ مگر اس کا یہ بیٹا..... اس کی ناک کٹوا دے گا..... اس کے باپ کو میرا ایک پیغام دو گی.....؟'' دادی اماں کھینچ کھینچ کر سانسیں لینے لگی تھی۔ نائلہ جلدی سے موڑھے سے چارپائی پر بیٹھ گئی اور فوراً بولی۔

'' جی دادی، بولیں میں اپ کی ہر بات پہنچا دوں گی۔''

'' تو اس کے باپ کو ..... جا کر صرف اتنا کہنا..... اس کی بھی آٹھ بیٹیاں ہیں..... اپنی لڑکیوں پر دھیان دے۔''

'' ٹھیک ہے دادی اماں کہہ دوں گی..... آپ آرام کریں بس..... آپ کی طبیعت دیکھیں کتنی خراب ہو رہی ہے۔'' اس نے دادی پر پڑا ہوا میلا سا کھیس برابر کیا اور ان کا ماتھا چوم کر باہر آ گئی۔ آتے وقت وہ مناہل سے اور اس کی امی سے بھی مل کے آئی تھی۔ گھر پہنچی تو اس کی ماں پریشان چہرہ لیے کھڑی تھی۔

''کیا ہوا امی؟'' اس نے اندر داخل ہوتے ہی ماں کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

'' تمہاری بڑی خالہ کے گھر سے فون آیا تھا۔ تمہاری خالہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ تمہارے ابو کو فون کر دیا ہے۔ وہ بھی آنے والے ہیں۔ ہم سب فوراً وہاں جا رہے ہیں۔''

''اللہ خیر کرے، کیا ہوا آنٹی کو؟'' نائلہ سچ میں بہت پریشان ہو گئی فی الحال گھر کے حالات کسی بھی فوتگی کو افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔

''کہہ رہے تھے کہ ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔ امی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''اچھا ہم ابو کے آنے تک سب تیاری کر لیتے ہیں۔ کیا پتا کتنے دن رکنا پڑے۔''

نائلہ نے ماں کا دھیان بٹانے کو کہا۔

'' ہاں چلو آؤ میرے ساتھ، دیکھ لیں کیا کیا ساتھ لے کر جانا ہے۔'' وہ اندر کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ نائلہ بھی ان کے پیچھے ہو لی۔

وہاں نائلہ کو کافی دن لگ گئے جب واپس آئی تو اتنے دن کام کرنے کی تھکن نے اس کو اپنے گھر میں ملنے والے سکون نے فوراً ہی گہری نیند سلا دیا۔ اگلے دن جب وہ اٹھ کر اسکول گئی تو واپسی پر دادی اماں سے ملنے چلی آئی۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر مناہل نے کھولا۔ اور نائلہ کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا۔

''دادی اماں؟''

'' دادی اماں فوت ہو گئی ہیں۔'' مناہل نے سر ہلاتے ہوئے یوں معمولی انداز میں کہا جیسے یہ عام بات ہے۔ لیکن نائلہ اپنی جگہ سن ہو گئی۔

''کیا؟'' وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

'' سچی آپی، دادی اماں فوت ہو گئی ہیں آپ امی سے پوچھ لیں۔'' اسے لگا وہ اور دیر کھڑی نہیں رہ پائے گی۔

''نہیں پھر آؤں گی۔'' گھر آ کر یہ خبر امی کو سنائی شاک کی وجہ سے وہ اکیڈمی بھی نہ جا سکی۔ اگلے دن امی کے ساتھ جا کر وہ مناہل کی ماں سے اظہارِ افسوس کر کے آئی۔

اسکول میں بچوں کے پیپرز شروع ہونے والے تھے پڑھائی کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ ڈیٹ شیٹس اور پیپرز بنانے میں اتنا مصروف ہوئی کہ کسی چیز کا دھیان ہی نہ رہا۔

پیپروں کے بعد رزلٹ نئی کلاسز اور زندگی کے کئی دوسرے کاموں نے اس کی توجہ کھینچ لی۔

ایک دن سب ٹیچرز معمول کے مطابق بیٹھی باتیں کر رہی تھیں بریک ٹائم میں جب ایک ٹیچر نے بتایا کہ اسی چیس والی ریڑھی والے لڑکے نے اس سے کس کس طرح بدتمیزی کی اسے دادی کی بات فوراً یاد آ گئی۔

''اس سے کہنا..... اس کی آٹھ بیٹیاں ہیں..... اپنی لڑکیوں پر دھیان دے۔''

''جو بھی ہو، آج مجھے دادی کا پیغام پہنچانا ہے۔'' اپنے ٹائمنگ رجسٹر پر ٹائم لکھ کر سائن کرتے ہوئے نائلہ نے سوچا۔

''مگر میں کہوں گی کیسے؟''

''کیا کہوں گی؟''

''وہ میری بات پر یقین کریں گے۔''

''اگر انہوں نے مجھے بے عزت کر دیا تو؟'' دل میں ہزاروں خدشے تو تھے لیکن اس بار ہمت زیادہ تھی۔

کسی نہ کسی کو تو آواز اٹھانی تھی، کسی نہ کسی نے تو مزاحمت کرنی تھی، پھر وہ ہی کیوں نہ شروعات کر دے؟

اگر وہ یہ سب دیکھ کر اور سن کر بھی چپ رہتی تو ہو سکتا ہے کہ کل کو کوئی اس لڑکی کی اس کی ''درندگی کا شکار'' ہو جائے۔ یہ سوچ ہی دل دہلا دینے کے لیے کافی تھی۔

اسکول سے نکل کر وہ سوچوں میں گم چنے والے ٹھیلے کے پاس آ گئی۔ ایک خوبصورت سفید کالے بالوں والا، لمبی داڑھی رکھے ہوئے مکئی کے دانے بھون رہا تھا، اتنی گرمی نہیں تھی لیکن ایک بجے کے بعد اب دھوپ چبھنے لگی تھی۔

''السلام علیکم خان بھائی۔'' اس نے تمیز سے سلام کیا اور انتظار کرنے کی غرض سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

''وعلیکم السلام باجی، کیا لینا ہے؟'' وہ مکئی چھان کر کاغذ پر رکھتے ہوئے گاہک کو دے رہا تھا۔ وہ گاہک سے فارغ ہو کر نائلہ کی جانب متوجہ ہوا۔

''نہیں پہلے ان کو دے دیں۔'' وہ ابھی تک گھبراہٹ میں تھی۔ پٹھان نے مخاطب کیا تو کوئی بہانہ ابھی تک نہ سوجھا تھا۔ اس لیے جو منہ سے نکلا کہہ دیا۔

پٹھان نے بات سن کر دوسرے گاہکوں کو دیکھنا شروع کیا۔

اگلے پانچ منٹ تک وہ سب گاہکوں سے فارغ ہو چکا تھا اور نائلہ بات کرنے کا طریقہ سوچ چکی تھی۔

''جی باجی بتائیں کیا لینا ہے؟'' پٹھان نے کہا تو نائلہ کو چار و ناچار کہنا ہی پڑا۔

50 کے بھنے ہوئے چنے 30 کی مکئی۔'' اس نے ریڑھی پر نظر دوڑائی۔

وہاں 10,12 قسم کی چیزیں تھیں۔

50 کے املوک دے دیں، 80 کی گڑ والی مکس مکئی چنے۔'' پٹھان اس کا آرڈر ''اچھا باجی'' کہہ کر پیک کرنے لگا تو اس نے پٹھان کو ہمت کر کے پوچھا۔

''بھائی ایک بات کہوں؟''

''جی باجی کہیں۔'' پٹھان نے مکئی پیک کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ میرا کوئی بڑا بھائی نہیں ہے، ورنہ اس کو کہتی۔ لیکن آپ نے مجھے باجی کہا ہے تو آپ بھی میرے بڑے بھائی ہی ہوئے نا؟'' اس نے لمبی سی تمہید باندھتے ہوئے خود کو بات کرنے کے لیے تیار کیا۔

''انشاء اللہ باجی، آپ میری بہن ہیں۔ بولیں کیا کام ہے؟'' نائلہ کو ہمت ملی تو وہ نظریں جھکا کر (فطری شرم کی وجہ سے) بولی۔

''ایکچولی مجھے ایک لڑکا پریشان کرتا ہے۔ بلکہ مجھے ہی نہیں ہر لڑکی کو تنگ کرتا ہے۔ میری کچھ دوستیں بھی اس کی بے غیرتی سہہ چکی ہیں۔ کیا آپ ہم سب لڑکیوں کو اس سے بچا سکتے ہیں؟ اصل میں وہ لڑکا پٹھان ہے اور اس کے ماں باپ کا نہیں پتا، ورنہ اس کے گھر شکایت کرتی۔'' اس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا کہ وہ نہیں جانتی اس کے ماں باپ کو۔

''نام بتاؤ تم اس خبیث کا۔ دوبارہ تنگ کرنے کے قابل نہیں رہے گا وہ۔ کون ہے وہ۔'' پٹھان کو غصہ کچھ زیادہ ہی جلدی آ گیا تھا۔

''وہاں اس ریڑھی پر کھڑا ہوتا ہے۔ چپس والی ریڑھی پر اس وقت کوئی نہیں تھا۔ وہ ریڑھی فی الحال خالی تھی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا ریڑھی کی طرف۔

''بہت گندی نظروں سے دیکھتا ہے۔ کل شام کو جب میں نے اس سے چپس لی تھی تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں عزت کی وجہ سے خاموش رہی لیکن باقی سب دوستوں کی طرح اگر میں نے اسے کچھ نہ کہا تو کیا پتا کل کو کوئی اور اس کی کسی غلط حرکت کا شکار ہو جائے۔'' اسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کیا بولتی جا رہی ہے اور اس کی ہمت کیسے بحال ہوئی۔

''اس کی بھی تو بہنیں ہوں گی لیکن اس کو شرم نہیں آتی۔ کبھی اس کے ماں باپ ملے تو انہیں انتہائی ادب سے اتنی بات ضرور کہوں گی کہ آپ کی بھی بیٹیاں ہوں گی، اپنے بیٹوں کی تربیت پر دھیان دیں۔'' اس سے زیادہ سننے کی شاید اس پٹھان میں ہمت نہیں تھی۔ بہت ضبط سے بولا تھا۔

''بس باجی میں اس لڑکے کو جانتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس کا چہرہ غصے کے تپش سے سرخ ہو رہا تھا۔ نائلہ کو لگا کہ شاید وہ اس کی بے عزتی کر دے گا فوراً بولی۔

''میرے بھائی، آپ پٹھان ہیں نا، اسی لیے آپ سے مدد مانگی ہے۔ ایک پٹھان کو بہت اچھے سے پتا ہوتا ہے کہ ایک پٹھان کس زبان میں سمجھتا ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں یہ آپ کو دوبارہ تنگ نہیں کرے گا۔'' اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ نائلہ کو اس کی چیزیں پکڑائیں اور پیسے لیے۔ نائلہ بقیہ پیسے واپس لیتے ہوئے بولی۔

اس کو آپ خود ہی سمجھا دینا بھائی اس کے ماں باپ کو نہ بتانا، وہ یقیناً اچھے انسان ہوں گے تبھی تو اس جیسی اولاد آزمائش میں ملی ہوگی انہیں۔''

پٹھان نے لہجہ نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''باجی آپ فکر نہ کریں اس کو میں ہی سمجھاؤں گا۔''

''اچھا بھائی اللہ حافظ!''

''اللہ حافظ''

اس نے مڑتے ہوئے پٹھان کا جواب سنا اور گلی کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کا جسم لرزنے کے ساتھ ٹھنڈے پسینے بھی چھوڑ رہا تھا۔

اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایک کام کر لیا ہے۔ ایک ایسا کام جو بہت مشکل تھا کم از کم ایک عام مشرقی لڑکی کے لیے۔

اس پٹھان لڑکے کا جو بھی حشر ہوا ہو لیکن اگلے دن اس کو ریڑھی پر ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ وہ پہلے والا لڑکا کہیں جا چکا تھا اسے نہیں معلوم لیکن وہ دل میں خوش ہوئی کہ کم از کم اس علاقے کی لڑکیوں کو اس آوارہ لڑکے سے چھٹکارہ مل چکا تھا۔

اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ آنے والے وقت میں جو لڑکیاں اس لڑکے کے چلے جانے پر شکرانے پڑھ رہی تھیں اس کی ہیرو وہ خود تھی یا اس لڑکے کا باپ اس اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ نیکی وہی کارگر ہوتی ہے جو چھپ کر کی جائے۔ ظاہر تو صرف دکھاوا ہی کیا جاتا ہے نا!

نائلہ نے دوسرے دن سے ہی اپنی کہانی پر کام شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے وہ دادی کی باتیں لکھتی جاتی ویسے ویسے اس پر منکشف ہوتا جاتا کہ دادی تو بھی اس کے موضوع ڈر سے ہٹی نہیں تھیں۔ ان کی ہر بات ہر کہانی میں وہ عام سا ڈر موجود رہا تھا جس کی نائلہ کو

تلاش تھی۔

لوگوں سے ان کی طنزیہ نظروں سے ہار جانے کا ڈر۔

''اپنی کاوشوں کے ضائع ہونے کا ڈر!''

''تجربات کی سولی چڑھنے کا ڈر!''

''عام رہ جانے کا ڈر!''

''عزت نفس پر ٹھیس آنے کا ڈر!''

''سفید پوشی کا بھرم ٹوٹنے کا ڈر!''

''کچھ کھو جانے کا ڈر!''

''غریبی اور محرومی کا ڈر!''

''کسی کے نہ ہونے کا ڈر!''

''بھوکے سونے کا ڈر!''

''بے گھر ہونے کا ڈر!''

''اپنے بچوں کے مستقبل کا ڈر!''

''خدا کے قہر کا ڈر!''

''تعلیم حاصل نہ کرنے کا ڈر!''

''دھوکا ملنے کا ڈر!''

''زندگی تباہ ہونے کا ڈر!''

''کچھ نہ کر پانے کا ڈر!''

''خود کو اہمیت نہ ملنے کا ڈر!''

''نام نہاد عزت کا ڈر!''

''خود کے اندر پیدا ہونے والا ڈر!''

''کسی کا سامنا کرنے کا ڈر!''

''کسی کے ہاتھوں بے عزت ہونے کا ڈر!''

اور سب سے بڑھ کر ''مرنے کا ڈر!''

ہر طرح کا ڈر تو بیان کر دیا تھا دادی نے، بس ایک وہی تھی جو نہ سمجھ پائی۔

دادی اماں کے جانے کے بعد سے آج تک نائلہ نے بہت سے لوگوں کے حال دیکھے تھے۔ دادی کے بعد ہی وہ لوگوں کے جنازے میں شریک ہونا شروع ہوئی تھی۔

اس نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو غریبی کی وجہ سے اپنوں کو دو گز کفن اور زمین بھی نہیں دے سکتے تھے اور وہ مانگنے والے بھی دیکھے تھے جو اپنا ضمیر مار کر لوگوں کی باتیں سنتے ہوئے ان کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے سوچتے تھے کہ اگر خدا کے نام پر دینا ہے تو سوچ فکر کیوں؟''

''اور اگر خدا کی راہ میں نہیں دینا ہے تو بد تمیزی کیسی؟''

بہت سے بچوں کو دیکھا جن کی عمریں تو کھلونے اور کتابیں پکڑنے کی تھیں لیکن ان کے ہاتھ میں مجبوریوں نے ''کٹورا'' پکڑا دیا تھا کہ لو مانگ کر اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ بھرو۔''

''نائلہ نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو گلیوں اور سڑکوں کا کوڑا صاف کرتے تھے، گٹر صاف کرتے تھے، لوگوں کے جوتے پالش کرتے تھے لیکن انتہائی کم آمدن پر بھی بہت مشکل سے دو وقت کا کھانا پورا کرتے ہوئے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔

نائلہ کو اب پتا چلا کہ امیر اور غریب دونوں ہی ''مرنے'' سے کیوں ڈرتے تھے!

جو لوگ کہتے ہیں نا کہ ایک ہی کفن اور ایک ہی زمین میں جاتے ہوئے امیر اور غریب کا فرق مٹ جاتا ہے۔ نائلہ ان لوگوں سے سخت خفا تھی۔

کیونکہ کفن کو مہنگے ترین اعلیٰ کوالٹی کے اور سستے ترین گھٹیا کوالٹی ریٹ کے کپڑے میں ناپا جاتا ہے اور زمین کو جیب میں موجود پیسوں کی گڈی سے!

امیر مرنے سے ڈرتے تھے کہ ساری دولت و عیش چھوٹ جائے گی اور اندھیری قبر میں جانا پڑے گا!

غریب ڈرتے تھے کفن کے پیسے کہاں سے آئیں۔ آج کے دور میں جہاں جینا لاکھ کا ہے، مرنا سوا لاکھ کا تو اس صورت میں دو گز زمین بھی نصیب ہوگی یا نہیں، اس بات کا بھی علم نہ تھا۔

نائلہ اپنے تجزیے میں کہاں تک ٹھیک تھی؟ امید ہے فیصلہ قارئین خود کریں۔

رقص اجل

ہما خان-کوٹ رادھا کشن

کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ اچانک اچنبھے میں پڑگئے کیونکہ پلک جھپکتے ہی ایک نادیدہ وجود سامنے آیا تو لوگوں کی آنکھیں پتھراگئیں لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور پھر.....

لمحہ لمحہ.....دل و دماغ.....پرسکتہ طاری کرتی خوفناک.....دہشت ناک.....کہانی

آدھی رات کا سے تھا، ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ افق کی سیاہ چادر پر ننھے ننھے ٹمٹماتے ستارے دلربا منظر پیش کررہے تھے۔ سیاہ مضبوط سڑک سنسان تھی۔ یہ سڑک شہر کی آبادی سے دور واقع تھی۔ سڑک کے دائیں جانب دراز قامت قدیم طرز تعمیر کی حویلی سائیں سائیں کررہی تھی۔ حویلی کا رنگ و روغن اکھڑا ہوا تھا۔ ویرانی ہونے کے سبب عجیب خوف نے ماحول میں بسیرا کررکھا تھا۔ سیاہ جیپ کا انجن حویلی کے نزدیک آتے ہی ایک زور دار جھٹکے کے ساتھ بند ہوگیا۔ روپرڈ ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے اسٹیئرنگ سنبھال رکھا تھا روپرڈ نے ایک بار پھر انجن اسٹارٹ کیا مگر انجن اسٹارٹ نہ ہوا۔ اس نے ایک زوردار مکا اسٹیئرنگ پر رسید کیا۔ ''ڈیم اٹ لگتا ہے کہ جیپ کا انجن خراب ہوگیا ہے۔'' وہ سخت جھنجھلایا۔ ''تو اب کیا ہوگا۔'' پچھلی نشست پر براجمانی سونی فکرمندی سے بولی۔ ''یہ سامنے حویلی دکھائی دے رہی ہے نا ہم اس حویلی میں آج رات قیام کریں گے پھر صبح یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔'' روپرڈ کے دائیں جانب براجمان آتھین نے تجویز دی۔

چند لمحوں بعد وہ تمام دوست حویلی کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑے تھے جو چوڑے پائیدار ستون نے حویلی کی بالائی منزلوں کو تھام رکھا تھا۔ یکدم انتھین کو اس قدیم خستہ حال حویلی کی کھڑکی میں ایک دوشیزہ کھڑی دکھائی دی۔ اس کے لمبے سیاہ ریشمی بال ہولے ہولے ہوا کے سنگ جھول رہے تھے۔ اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں مایوسی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کی اجلی رنگت مہتاب کی مدھم روشنی میں دمک رہی تھی۔ اس کم سن حسینہ کے نین کٹوروں میں فلک پر جگمگاتے چاند کا عکس تھا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ تنہائی کا درد آنسو بن کر آنکھوں سے چھلک پڑا۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر گالوں پر بہنے لگے۔ کشمیری سیبوں کے مانند اسکے سرخ گال عجیب ہی جھیپ دکھلا رہے تھے۔ نجانے کیوں اس انجان حسینہ کی لانبی پلکوں سے گرتے آنسو انتھین کو گراں گزر رہے تھے۔ روپرڈ نے گہرے بھورے رنگ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

دروازے کے پٹ خود بخود وا ہو چکے تھے۔ سامنے زمرد کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہ تمام دوست شبنمی بوند دل سے تر گھاس کو پیروں تلے دباتے ہوئے آگے کی اور بڑھے۔ سامنے ایک قدیم طرز تعمیر کی شاندار عمارت موجود تھی۔ انتھین کے بعد دیگر دوست عمارت میں داخل ہوئے۔ فرش پر میرون رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں جانب ناگن کی طرح بل کھاتی سیڑھیاں اوپر کی جانب جارہی تھیں۔ بائیں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر قطار سے تین کمرے موجود تھے۔ روپرڈ، سونی اور سوزین تیسرے نمبر کے کمرے میں داخل ہوئے۔

انتھین اپنے دوستوں کے پیچھے اسی کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ اچانک سیڑھیوں پر کنکری گرنے کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ انتھین آواز کے تعاقب میں سیڑھیوں کی طرف گیا۔ تیسرے کمرے میں داخل ہوتے ہی چمگادڑوں کا غول روشن دان سے بیرونی جانب چلا گیا۔ سونی اور سوزین نے خوف کے مارے بیک وقت اپنے چہرے روپرڈ کے چوڑے سینے میں چھپالئے۔ ''ڈرپوک لڑکیاں..... چمگادڑیں تم دونوں کو دیکھ کر ڈر کے اڑ گئی ہیں۔'' روپرڈ شریر سا ہنستے ہوئے آنکھیں ٹپٹپا کر بولا۔

''روپرڈ.....'' سوزین نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔ ''انتھین دکھائی نہیں دے رہا'' سونی نے اپنی عقب پر نگاہ ڈالی۔ ''شاید گاڑی میں کوئی چیز بھول گیا ہو..... وہ لینے گیا ہوگا۔'' روپرڈ شان بے نیازی سے گویا ہوا۔ زمین پر بے تحاشا دھول مٹی اٹی ہوئی تھی۔ دائیں جانب کی آہنی دیوار پر ایک لکڑی کا دروازہ موجود تھا۔ سونی دروازے کی اور بڑھی۔ کنڈی کھولی اور دروازے کے پٹ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔ سوزین اور روپرڈ بھی اس کے پیچھے چل دیئے، نرم وملائم بستر پر پھول دار امتزاج کی چادر بچھی ہوئی تھی۔ ایک لمبے سرخ رنگ کے صوفے نے بیڈ کے بائیں جانب ڈیرہ جما رکھا تھا۔ اس کمرے میں بھی میرون رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ ''میرے خیال سے یہی گیسٹ روم ہے۔'' روپرڈ خوش کن انداز میں بولا پھر برق رفتاری سے بیڈ پر دھڑام سے گر کر آڑا ترچھا لیٹ گیا۔

''روپرڈ یہ کیا بدتمیزی ہے یہاں ہم لڑکیوں نے سونا ہے۔'' سوزین نے روپرڈ کو جھنجھوڑا روپرڈ نے خراٹے لینے کی مصنوعی اداکاری کی، جامنی رنگ کی شارٹ شرٹ اور وائٹ جینز میں ملبوس سونی نے ایک کشن روپرڈ پر مارا۔ ''ارے..... کیا مسئلہ ہے۔'' روپرڈ نے ادھ کھلی آنکھوں سے لال بھبھوکا چہرہ طئے سونی کو دیکھا۔ ''مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے کو رات کو مت ستاؤ بلکہ مت چھوؤ۔'' روپرڈ نے کروٹ بدلتے ہوئے شرارت سے کہا۔ ''روپرڈ اٹھو..... صوفے پر جا کر لیٹو۔'' وائٹ شرٹ اور بلیک جینز زیب تن کئے سوزین نے روپرڈ کو ڈپٹا۔ ''دیکھو سوزین..... مجھے تم دونوں کے بیڈ پر سونے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے..... میں کنٹرول کرلوں گا۔ اور اگر تم دونوں..... حسین لڑکیوں سے..... کنٹرول نہیں ہوگا..... تو وہ ایک الگ بات ہے۔'' بلیو ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس روپرڈ چیچھور پن سے بولا۔ ''شٹ اپ'' سوزین مشتعل ہو کر بولی۔ سونی نے ایک دھپ اس کی کمر پر جڑ دیا اور سوزین نے اس کی ٹانگ پر چپت لگائی۔ ''اوہ..... چلا جاتا ہوں..... غصہ کیوں.....

غصہ کیوں کرتی ہو۔'' وہ کسلمندی سے بستر سے اٹھا اور صوفے پر جا کر دراز ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اتھین حویلی کی دوسری منزل پر موجود تھا، اس کے سامنے ایک لمبی راہداری تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر ایک سفید دروازہ ایستادہ تھا۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر اپنے ہاتھ کا وزن ڈالا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ افق کے آغوش میں پڑے مدہوش چاند سے پھوٹتی روشنی کھڑکیوں سے آر پار ہو کر اندرونی جانب آرہی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کے شیشے کی کھڑکیوں نے مبہم سفید روشنی کو اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ کمرے میں چار سو پھیلی مدہم نیلی روشنی خواب ناک منظر پیش کر رہی تھی۔ چست چمکیلے سیاہ ٹوپ زین تن کے سنگ مرمر سے تراشا خراشا نسوانی پیکر نمودار ہوا۔ موسیقی کے دھیمے اور رسیلے سروں پر میری نے اپنے نرم و نازک سرخ و سپید بدن کو لپکایا۔ یوں محسوس ہوا کہ جیسے حسین جھیل کی متلاطم موجیں اپنی خرمستیوں میں مگن ہوں۔

اتھین کے سینے میں ابھرتے جذبات الفت بھڑک اٹھے، اتھین قالین پر براجمان تھا وہ اسے مبہوت سا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ میری نے اپنے دودھیا بازو کو ہولے سے جنبش دی تو ایک دلفریب عطر فضا میں بکھرا جو سانسوں کے ذریعے سرور بن کر اتھین کے وجود میں سرائیت کر گیا۔ میری پر اشتیاق انداز میں سرتاپیر رقص کرنے میں مشغول تھی۔ کبھی من چلی رنگین چنچل مچھلی کی شکل میں مسحور کن انداز میں سمندر کی لہریں بن جاتی۔ تو کبھی اپنی دل افروز اداؤں سے مدہوش کرنے والا شراب بن جاتی تو کبھی باغیچے میں راگ الاپتے پھولوں کی مہک بن جاتی۔

اتھین کی تیکھی سرخ انگارہ نما آنکھیں میری پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ میری رقص کرتے ہوئے اس کے نزدیک آئی اور گلاب کے پھول کو مستی بھرے انداز میں اس کے چہرے پر پھیرا۔ میری کی مقناطیسی کشش والی آنکھوں نے اتھین کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کی آنکھوں کی کشش نے اتھین کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔ بے خودی کے عالم میں اس نے میری کا ہاتھ تھام لیا۔ تشنہ لب اب ساقی کی موجودگی میں جام الفت نوش فرمانا چاہتا تھا۔ میری کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر اتھین نے اس کے لبوں پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ دی۔

حویلی کی بیرونی جانب ابر باراں برسنے لگا۔ وہ اس کی بانہوں کا لمس پا کر مکھن کے مانند پگھل پگھل جا رہی تھی۔ ''یہ دل تم میں اپنا آشیانہ ڈھونڈ رہا ہے۔'' فرط جذبات سے مرعوب ہو کر اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ ''اتنی جلد بازی مت کرو..... میرے دلدار ابھی رقص باقی ہے۔'' میری دھیمی لہجے میں گویا ہوئی۔ ''مگر یہ دل تو رقص ختم ہونے سے پہلے تمہاری زلف کا اسیر بن چکا ہے۔'' اتھین نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔ ''مجھے اتنا مت چاہو..... میں انسان نہیں..... بدروح ہوں۔'' وہ اتھین کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر نرم لہجے میں بولی۔

''مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تم دل کے ایوان پر قابض آ چکی ہو۔'' وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔ ''میرا رقص دیکھنے والا اس دنیا میں زیادہ دن جی نہیں سکتا..... ایک شاداب سرخ گلاب حویلی کے پچھلے حصے میں موجود ہے۔ یہ اس پوری حویلی میں واحد پھول ہے..... اور جانتے ہو یہ گلاب..... تمہارا ہے، جو میرا رقص دیکھنے کی وجہ سے اگا ہے۔ جب اس پھول کی پتیاں سیاہ ہو جائیں گی..... تو تم مر جاؤ گے۔'' اس کی ہیزل گرین آنکھوں میں ایک آنسو موتی بن کر چمکا۔

''مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔ تمہارے لئے تو میں موت سے لڑوں گا..... مگر شاید تمہاری جدائی یہ دل برداشت نہ کر پائے۔'' اس نے انگلیوں کی مدد سے اس کی آنکھوں کے پوروں میں سے آنسوؤں کو چن لیا۔

''میری بولی..... اب تم محبت کی راہوں کے مسافر ہوں۔'' وہ بے اختیار اس کے وجود سے لپٹ گئی۔ دیوار پر رکھے سلگتے دیئے بھی بجھ گئے۔ شاید ان کے خاموش رہنے کا وقت آ گیا تھا۔ مینہ تھم کر برسا۔

☆.....☆.....☆

سوزین شاور لینے کے غرض سے واش روم میں

گھسی۔ اس نے اپنی بھیگی لمبی سنہری زلفوں کو کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اپنے وجود میں شبنمی بوندوں کی تازگی سموئے ڈریسنگ ٹیبل کے عین سامنے کھڑی تھی۔ روپرڈ اپنا دایاں بازو آنکھوں پر ٹکائے صوفے پر دراز تھا یکدم ہی روپرڈ اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک اچٹتی نگاہ سونی پر ڈالی جو بیڈ پر بائیں کروٹ پر لیٹی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس نے اپنے گورے پیروں میں سلیپرز اڑسائے پھر خراماں خراماں چلتے ہوئے سوزین کی اور بڑھا۔ روپرڈ، سوزین کے عین پیچھے کھڑا تھا۔ ''تمہارے بغیر اب نیند نہیں آتی۔'' شرارت سے روپرڈ کی آنکھیں چمکیں۔ سوزین نے پلٹ کر دیکھا پھر اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کر دیئے۔ ''تو کیا کروں اب میں۔'' سوزین نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔ ''بس ہر گھڑی میرا ساتھ دے کر اس رات کو خاص بنادو۔'' روپرڈ نے سوزین کو اپنی بانہوں میں مضبوطی سے جکڑ لیا یکدم بیڈ پر دراز سونی گلہ پھاڑ کر چیخی۔ روپرڈ اور سوزین نے بیک وقت اس کی جانب چونک کر دیکھا۔ سوزین فوراً اس کی اور دوڑی۔ ''سونی کیا ہوا.....'' سوزین نے اسے باقاعدہ جھنجھوڑا سونی نے ایک بھرپور انگڑائی لی پھر روہانسی صورت بنا کر بولی۔ ''تم کہاں چلی گئی تھی..... مجھے اکیلا چھوڑ کر تمہیں پتہ ہے ناں..... تمہارے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔'' سونی، سوزین کے گلے لگ گئی۔ پھر سونی، سوزین کو اپنے حصار میں لے کر نیند کی وادیوں میں گم ہوگئی۔ روپرڈ ہکا بکا سوزین کی جانب دیکھنے لگا۔ حسین خوابوں کو تعبیر ملنے ہی والی تھی کہ بیچ میں سونی ٹپک پڑی۔ دل کے ارمانوں کا خون ہوگیا۔ شکست کی ایک راکھ اس کے چہرے پر اڑی وہ جی بھر کر بدمزہ ہوا۔ پاؤں پٹختا ہوا صوفے پر جا کر لیٹ گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے کسی پہر کمرے کا دروازہ پٹ سے کھل گیا۔ ایک نادیدہ وجود کمرے میں داخل ہوا۔ میری نے ہاتھ میں تھامے مور کے پنکھ سے روپرڈ کے پیروں پر گدگدی کی۔ غنودگی میں روپرڈ نے کروٹ بدلی مگر مسلسل گدگدی کے احساس پر وہ اٹھ بیٹھا۔ روپرڈ نے نیم وا آنکھوں سے دروازے کی اور دیکھا۔ دروازے کی جانب آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ روپرڈ نے قمیض کا دامن درست کیا۔ پھر قدرے آہستگی سے اس کی جانب بڑھا۔ ''روپرڈ..... کہاں جارہے ہو'' یکدم اسے اپنے عقب سے سوزین کی آواز سنائی دی۔ روپرڈ نے حیرت زدہ نظروں سے سوزین کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم یہاں ہو..... تو..... وہ کون ہے۔'' سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی زبان لرزنے لگی۔ بہانے سیڑھیوں کے اوپر فضا میں شیشے کا گلاس معلق تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نادیدہ ہستی نے اسے تھام رکھا تھا۔ ہوا میں معلق شیشے کا گلاس سیڑھیوں سے اوپر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ ان دونوں کی حالت یوں تھی کہ جیسے پیروں سے زمین کھسک گئی ہو۔ وہ دونوں بے ساختہ بیڈروم کی جانب بھاگے اور کمرے کو اندر سے لاک کر لیا۔

☆.....☆.....☆

آتھین، منقش قالین پر براجمان تھا۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے۔ وہ اب کافی کمزور نظر آرہا تھا۔ وقفے وقفے سے اب خون کی قے بھی آرہی تھی۔ حویلی کے باغیچے میں موجود سرخ گلاب پر سیاہ دھبے پڑ چکے تھے۔ آتھین مایوسی سے چھت کو تک رہا تھا۔ اچانک میری کمرے میں داخل ہوئی۔ دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے میری اس کے لئے پیگ بنانے لگی۔ ''کبھی عشق اور شراب کو ملا کر پیو۔'' آتھین نے شیشے کے گلاس میں بھرے سرخ شراب کو لبوں سے لگایا۔ ''آتھین..... کیا تمہیں موت سے ڈر نہیں لگتا۔'' میری کا لہجہ پراسرار تھا۔ ''عشق کی راہیں بہت پرآشوب ہوتی ہیں.....'' وہ مدھم آواز میں گویا ہوا۔ ''ناز ہے مجھے اپنی قسمت پر..... اگر یہ موت تمہاری قربت میں آئے۔'' وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ ''مگر..... اگر ہماری محبت کے بیچ تمہارے دوست آئیں تو'' وہ ٹٹولتی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ ''تمہارے اور میرے بیچ کوئی دیوار حائل نہیں ہوسکتی۔'' اس نے میری کو اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔

روپرڈ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ سوزین

اور سونی کے چہرے پر بھی پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔
''آتھین...... کہاں چلا گیا ہے۔'' روپرڈ فکر مندی سے بولا۔ آتھین کی گمشدگی پر تو سونی کی جان گلے میں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ یونی ورسٹی کے زمانے سے آتھین کو دل وجان سے چاہتی تھی۔ مگر لڑکی ہونے کی بنا پر اس نے کبھی پہل نہ کی۔ الفت کے سحر نے سونی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب محبت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا تب سونی نے محبوب کو حال دل سنانے کے لئے زبان سے ادھار الفاظ لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''فرسٹ فلور پر تو میں نے ہر جگہ تلاش کرلیا...... مگر آتھین کہیں نہ ملا۔ میں سیکنڈ فلور پر دیکھ کر آتا ہوں شاید...... آتھین ادھر کہیں موجود ہو۔'' روپرڈ نے راہ سجھائی۔ سوزین اور سونی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چند لمحوں بعد روپرڈ کی خون سے لت پت لاش لڑکھڑا کر سیڑھیوں سے پلٹا کھاتے ہوئے ان کے قدموں کے نزدیک آ کر گری۔ اس کی گردن پر تیز دھار چاقو سے وار کیا گیا تھا۔ پوری حویلی سوزین اور سونی کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ خوف و ہراس کی کیفیت میں وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ ڈر کے مارے سوزین کے لب کپکپا رہے تھے تو سونی کی آنکھیں حلقوں سے حد درجہ باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ سرد موسم کے باوجود دونوں پسینے میں شرابور تھیں۔ بادل نخواستہ طور پر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ راہداری کے آخری سرے پر سفید دروازہ ادھ کھلا دکھائی دیا۔ وہ دونوں دبے دبے قدموں سے اس کی جانب بڑھیں۔ سونی اور سوزین ادھ کھلے دروازے کی لکیر نما دراڑ پر نظریں ٹکائیں۔ آتھین قالین پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ خلا میں کسی غیر مرئی نقطے کو ساکت آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ آتھین کے نزدیک ہی سفید دیوار پر سیاہ ہیولا دکھائی دیا۔ ہیولے کا زاویہ کچھ اس قسم کا تاثر دے رہا تھا جیسے کوئی کم سن لڑکی آتھین کے اوپر جھکی ہو اور اس کی لمبی زلفیں آتھین کے چوڑے سینے کو چھو رہی ہو۔

وحشت ناک منظر دیکھ کر سونی کا سر چکرا گیا۔ وہ بمشکل گرتے گرتے بچی۔ یکدم اس انجان لڑکی کی سرگوشیاں سونی اور سوزین کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ ''میں نے روپرڈ کو مار دیا ہے...... وہ ہماری محبت کے بیچ آ رہا تھا۔'' میری نے اپنی مخروطی انگلی ایک ادا سے آتھین کے چہرے پر پھیری۔ آتھین کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

''میں جانتی ہوں...... آتھین...... کہ تمہاری زندگی کا سرخ گلاب آدھا سیاہ ہو چکا ہے......'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ''مگر...... میں تمہیں خود سے اتنی آسانی سے جدا نہیں ہونے دوں گی...... تم صرف میرے ہو...... صرف میرے ہو۔'' میری نے آتھین کے سینے پر سر رکھ دیا۔ سونی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں کسی مشاق طواف کے گھنگروں کی چھن چھن کی آواز سنائی دی۔

آتھین فوراً قالین پر براجمان ہو گیا۔ وہ آنکھیں سکیڑے گردن ترچھی کئے پورے انہماک سے میری کے رقص کو دیکھ رہا تھا۔ سونی نے ایک سرسری نگاہ آتھین پر ڈالی اور پھر آہنی دیوار پر مگر اسے دیوار کے اوپر اس کا عکس دکھائی نہ دیا۔ سونی کی بھنوئیں کے بیچ ایک بل آیا۔ یکدم کمرے کے بیرونی جانب سے آتی سوزین کی خوفناک چیخ نے سونی کا دھیان اپنی اور کھینچا۔ وہ عجلت میں باہر کی جانب دوڑی۔ مگر سونی کو سوزین کہیں دکھائی نہ دی۔ اس نے بالکونی سے نیچے جھانکا۔ زمین پر اوندھے منہ سوزین کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر سے نکلتا خون حویلی کی گھاس پر پھیل چکا تھا۔ جو دھیرے دھیرے سرسبز گھاس میں جذب ہو رہا تھا۔

ہیبت ناک منظر نے سونی کے اوسان خطا کر دیئے۔ سوزین کی اچانک موت نے اس کی دھڑکنوں کو تیز کر دیا تھا۔ وہ واپس اسی کمرے میں آ گئی۔ سونی نے ایک بھرپور نگاہ آتھین پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر خلاؤں کو تکتے ہوئے ایک میٹھی مسکان محو رقصاں تھی۔ سونی اتنا تو سمجھ چکی تھی کہ آتھین کسی نادیدہ مخلوق کے شکنجے میں ہے۔
''آتھین...... آتھین'' سونی نے اسے باقاعدہ جھنجھوڑا مگر آتھین کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے۔

یکدم سونی نے اپنے نازک گلابی لبوں کو اس کے سرخی مائل ہونٹوں پر ثبت کر دیئے۔ ماحول میں قوس وقزح

کے رنگ بکھر گئے۔ ایتھین خرد کی دنیا میں واپس آچکا تھا۔ میری نے ایک زوردار مکا سونی کے سر پر رسید کیا وہ بے ہوش ہوگئی۔ ”میری..... یہ تم نے کیا کیا..... وہ میری دوست ہے۔“ ایتھین یکدم چیخ کر بولا۔

میری کو اس کے تیکھے لب و لہجے کی عادت نہ تھی فوراً سیخ پا ہوگئی۔ ایتھین، سونی کو گود میں اٹھا کر بیرونی جانب بڑھا۔

میری نے ایک خون خوار ریچھ کا روپ دھار لیا۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں سے دوڑتے ہوئے ایتھین کے پیچھے لپکی۔ ایتھین برق رفتاری سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس نے سونی کو مضبوطی سے اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ ایتھین فرسٹ فلور سے باہر آچکا تھا۔ ”ایتھین..... تم..... نہیں جاسکتے۔“ میری گرج دار آواز میں غرائی۔

سیاہ ریچھ ایتھین کے بہت نزدیک آچکا تھا۔ اس کے تیور جارحانہ تھے۔ یکدم اس نے سونی کے گلے میں موجود پلس کا لاکٹ ریچھ کی جانب کردیا۔ سونی کو اب ہوش آچکا تھا۔ وہ مندی مندی نظروں سے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔ حویلی کے باغیچے میں موجود سرخ گلاب سیاہ ہوچکا تھا۔ اس پر صرف ایک گلابی دھبا رہ گیا تھا۔ ایتھین کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اسے سینے میں درد اٹھتا محسوس ہورہا تھا۔ اس کا پورا جسم سرد پسینے سے شرابور تھا۔ نزدیک کھڑی سونی اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

”ایتھین..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ اس کا گلا رندھ گیا۔ ایتھین کی بگڑتی حالت دیکھ کر ریچھ نے کھل کر قہقہہ لگایا۔ شش و پنج کے عالم میں کھڑی سونی کو یک لخت منکشف ہوا۔ وہ حویلی کے پچھلی جانب گئی وہاں ایک چھوٹے سے باغیچے میں تنہا سیاہ گلاب موجود تھا۔ سونی نے فوراً سیاہ گلاب کی جڑ کو زمین سے جدا کردیا۔ ایتھین کی بگڑی حالت سنبھل گئی۔

اگلے ہی لمحے وہ ریچھ ایک خطرناک وار کرنے کے لئے ایتھین کی اور بڑھا۔ سونی نے فوراً پلس نما لاکٹ اس کے سامنے کردیا۔ ”یہ تم نے اچھا نہیں کیا ایتھین عشق کا دعویٰ کرکے بیچ رستے میں ساتھ چھوڑ دیا۔“ ریچھ، میری کی شکل اختیار کرگیا۔ میری الٹے قدموں سے حویلی کی جانب بڑھ گئی۔ ایتھین نے سونی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ شاید سونی کی محبت کا آفتاب طلوع ہوچکا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہاں سے چل دیئے۔

☆.....☆.....☆

کئی ماہ بعد..... ایک خوبرو نوجوان اپنے اسکوٹر پر براجمان حویلی کے نزدیک سے گزر رہا تھا کہ یکدم پیٹرول ختم ہونے کے سبب اسکوٹر کا انجن بند ہوگیا۔ مطلع ابر آلود تھا۔ بارش پھوار بن کر خاکستر زمین پر برسنے لگی۔ ایڈی نے ایک سرسری نگاہ حویلی پر ڈالی۔ یہ وسیع و عریض حویلی اس وقت نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے داخلی دروازے کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ ”بارش تھمنے تک کیوں نہ میں اس حویلی میں پناہ لے لوں۔“ وہ دل ہی دل میں جلبلایا۔ اس نے اپنا اسکوٹر ایک جانب پارک کیا اور حویلی میں داخل ہوگیا۔

سائیں سائیں کرتے حویلی کے فرسٹ فلور کے تمام کمرے لاک تھے۔ ایڈی سیڑھیاں چڑھ کر سیکنڈ فلور پر چلا گیا۔ راہداری کے آخری سرے پر موجود کمرہ کھلا ہوا تھا۔ ایڈی لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کمرے کی اور بڑھا۔ کمرہ سلگتے دلوں سے آراستہ تھا۔ سلگتے دلوں سے پھوٹتی روشنی کمرے کی تزئین و آرائش میں اضافے کا باعث تھی۔ یکدم باریک لباس میں ایک نسوانی وجود نمودار ہوا۔ سریلی گیت کا افتتاح ہوا۔

میری بجلی کی قمقموں کے مانند برقی لہریں بن کر مدہوش رقص کرنے لگی۔ وہ حسن کی اعلیٰ مثال تھی۔ اس کی گوری رنگت قیامت خیز منظر پیش کررہی تھی۔ ایڈی کے منہ سے الاؤ سا خارج ہوا۔ وہ فوراً قالین پر براجمان ہوگیا اور ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگا۔

حویلی کے باغیچے میں موجود سیاہ گلاب کے نزدیک ایک اور سرخ گلاب اُگ گیا۔ شاید میری کی تنہائیاں ختم کرنے والا شخص آچکا تھا۔

موت کی سرگوشی

مظہرالحق علوی

قسط نمبر 8

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی جسم و جاں پر کپکپی طاری کرتی اور روح کو دہلا دینے والی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو تحیر کے سمندر میں غوطہ زن کرکے رکھ دے گی صدیوں بعد ہارر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تحفۂ خاص

ایک ایسے..... شخص کی داستان حیرت جو مرنے کے بعد تابوت..... سے نکل آیا تھا

اس کے چہرے پر بے انتہا اذیت کے آثار دیکھ کر میرے دل کو ایک دھکا لگا اور اس میں نے بے اختیار اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ نقاہت سے مسکرائی اور اس نے مجھے چومنے کی کوشش کی۔ چنانچہ خود میں نے اس کا ننھا، خشک منہ چوم لیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''شاباش! بے حد اچھی بچی ہے ہماری اسٹیلا۔ وہ ذرا بھی بے چینی نہ کرے گی، آرام سے لیٹ جائے گی اور پھر اسے سکون ہو جائے گا۔ سچ۔ شاباش۔''

اور وہ بری فرمانبرداری سے لیٹ گئی لیکن نظریں مجھ پر ہی جمارکھیں۔ میں اس کے بستر کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور متفکر و مشتاق نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اسونتا بار بار گیلا کپڑا اس کے خشک پڑے ہونٹوں پر پھیر کر انہیں نم کر رہی تھی اور اس اذیت کو کم کرنے کی ہر ممکن ترکیب آزما رہی تھی۔ جو یہ ننھی سی جان حیرت انگیز صبر سے برداشت کئے جا رہی تھی۔ اسٹیلا کی سانس گھڑی کی ہر ''ٹک'' کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

''آپ میرے پاپا ہی ہیں نا؟'' اسٹیلا نے پوچھا۔

اور میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار اور اس کا ماتھا اور بھی زیادہ تمتما کر اور بھی زیادہ سرخ ہو گیا تھا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کا ننھا سا اور تپتا ہوا ہاتھ اٹھا کر چوم لیا۔

''ہائے! مقدس ماں! خدا باپ! آہ! وقت قریب ہے اب کہ یہ اپنے باپ کو دیکھ رہی ہے۔ بہت چاہتا تھا اسٹیلا کو اور اگر دیویوں نے فرشتوں نے اجازت دی تو وہ اپنی بیٹی کو لے جانے ضرور آئے گا۔''

اور وہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور آنکھیں بند کر کے تسبیح پھیرنے اور دعائیں بدبدانے لگی۔

ادھر اسٹیلا نے ایک بازو میری گردن میں ڈال دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور اس نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان اور لحہ بہ لحہ بڑھتی ہوئی اذیت کو برداشت کرتے ہوئے کہا۔

''پاپا! میرا گلا بہت درد کر رہا ہے۔ آپ اسے اچھا نہیں کر سکتے پاپا؟''

میں تڑپ گیا کس قدر قابل رحم حالت تھی میری بچی کی کہ پتھر بھی رو پڑے۔

''کاش کہ میں کچھ کر سکتا میری بچی۔'' میں نے کہا۔ ''میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہاری تمام تکلیفیں خود اٹھا لیتا۔''

ایک منٹ تک وہ خاموش رہی پھر کہا۔

''پاپ! کتنے بہت سے دنوں تک آپ مجھ سے دور رہے تھے اور اب آئے ہو تو میں اتنی بیمار ہوں کہ آپ کے ساتھ کھیل بھی نہیں سکتی۔ یہ دیکھو..... بیچارا ٹوٹو۔'' اس کی نگاہ اس گڈے پر پڑی جو اس کے پلنگ کر پائنتی کی جانب پڑا ہوا تھا اور جس کو سرکس کے مسخرے کا لباس پہنایا گیا تھا۔ ''میرا بیچارا ٹوٹو میں اس کے ساتھ بھی نہیں کھیل سکتی۔ کیونکہ بہت تکلیف ہے میرے گلے میں۔ ٹوٹو بھی سوچتا ہوگا کہ اب میں اسے نہیں چاہتی۔ پاپا ٹوٹو کو مجھے دے دو۔''

میں نے گڈا اٹھا کر اسے دے دیا۔ تو اس نے اسے اپنے ایک بازو میں سنبھال لیا اور دوسرا باز و بدستور میری گردن میں ڈالے رہی۔

''پاپا! ٹوٹو آپ کو بھولا نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''آپ کو یاد ہے نا کہ آپ اس کو روم سے لائے تھے۔ میرے لئے۔ چنانچہ یہ آپ کو چاہتا ہے لیکن میرے جتنا نہیں۔''

اور اس کی آنکھیں بخار سے جلنے لگیں۔ ان میں الاؤ سے بھڑک اٹھے اور تب اس کی نظر اسونتا پر پڑی جو اپنا سفید بالوں والا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے گھٹنوں پر جھکی ہوئی تھی۔

''اسونتا!''

بڑھیا نے سر اٹھایا۔

''بامبی نیتا۔'' وہ بولی اس کی بوڑھی آواز کانپ گئی۔

''رو کیوں رہی ہو اسونتا؟'' اسٹیلا نے حیرت سے پوچھا۔ ''پاپا کے واپس آجانے سے تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی؟''

اور اس وقت درد اور تکلیف کی زبردست ٹیس نے اس ننھی سے جان کو تڑپا دیا۔ اس کے اعضاء کھنچ گئے، جسم کمان بن گیا، وہ منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ کیونکہ اس کی سانسیں تقریباً رک گئی تھیں۔

میں نے اور اسونتا نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور آہستہ سے لٹا دیا۔ شدید درد کا یہ دورہ رفتہ رفتہ گزر گیا۔ لیکن اسٹیلا کو نڈھال اور اس حال میں چھوڑ گیا کہ اس کے چہرے کا رنگ ڈھلی ہوئی چادر کی طرح سفید ہو رہا تھا اور ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔

میں اسے پچکارنے اور تسلی دینے لگا۔

''بیٹی تمہیں بہت زیادہ نہیں بولنا چاہئے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''خاموش رہو اور پھر تمہارا گلا تمہیں تکلیف نہ دے گا۔ اچھا؟''

وہ حسرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ چند منٹوں کے توقف کے بعد بولی۔ ''اچھا تو ایک پپی لے لو میری اور پھر میں چپ رہوں گی۔''

اور میں نے جھک کر اس کے رخسار چوم لئے اور اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ایسا معلوم ہوا کہ اسے کچھ سکون ہو گیا تھا۔

دس منٹ گزر گئے۔

بیس منٹ گزر گئے۔

تیس منٹ گزر گئے۔

وہ اسی طرح پڑی رہی اور تب ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے یوں مردے کی طرح پڑی ہوئی اسٹیلا کی طرف دیکھا، خشونت کی ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پلنگ کی پائنتی کی جانب بے حرکت اور خاموش کھڑا رہا۔

یکا یک اسٹیلا نے آنکھیں کھول دیں اور ہم تینوں کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

''بہت زیادہ تکلیف ہے میری بچی کو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اسٹیلا نے جواب دیا۔

اس کی آواز اتنی کمزور اور مہین تھی کہ اسے سننے کے لئے ہم نے اپنی سانس روک لی۔

وہ بولی۔ ''اب میں اچھی ہوں۔ اسونتا سے کہو کہ پاپا آگئے ہیں۔ اس لئے اب وہ مجھے سفید فراک پہنا دے۔ میں جانتی تھی کہ میرے پاپا ضرور آئیں گے۔''

اور وہ میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔

''اس کے خیالات بھٹکنے لگے ہیں۔'' ڈاکٹر نے

مجھے مطلع کیا۔ ''بس اب کھیل ختم ہوا جاتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ اسٹیلا نے ڈاکٹر کی بات نہ سنی۔ اس نے کروٹ لی اور میری بانہوں میں سما گئی اور کھوئی کھوئی سی آواز اور سرگوشی میں پوچھا۔

''میں بری لڑکی ہوں اس لئے آپ دوبارہ چلے جائیں گے؟''

''نہیں بیٹی! تم بہت اچھی لڑکی ہو اور اب میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور اس کے بالوں میں منہ چھپالیا۔

''پاپا! آپ نے یہ کالی کالی واہیات چیز کیا لگا رکھی ہے آنکھوں پر۔'' اب اس کی آواز اتنی کمزور اور غم آلود تھی کہ خود میں بھی بہ مشکل سن سکتا تھا۔

اور ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ گھڑی کی ہر ٹک کے ساتھ اس کی سانسیں بھی کمزور سے کمزور تر ہوتی جارہی تھیں۔

''آپ میرے پاپا ہیں۔ ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

اس کے گالوں پر اور ماتھے پر کی سرخی اور بھی گہری ہوگئی۔ تمتماہٹ اور بھی بڑھ گئی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ اس کا ننھا جلتا ہوا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا دیا۔

بوڑھی اسونتا نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''کیا ہوا ہے آپ کی آنکھوں کو؟ کسی نے زخمی کردیا ہے انہیں؟'' اس کی آواز پہلے سے بھی زیادہ کمزور تھی۔ ''مجھے دیکھنے دو آپ کی آنکھیں..... اتار دو چشمے۔''

میں ہچکچانے لگا۔ کیا کروں؟ اس کی یہ آخری خواہش پوری کردوں؟ خوشی اور سکون دوں گا سے جو میرے اختیار میں ہے؟

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ڈاکٹر نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اسونتا نے ایک بار پھر گھٹنوں پر جھک کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ اور سر جھکائے بلکہ بستر کے گدے میں منہ گاڑے دعا میں مصروف تھی۔

اور خیال کی سی تیزی سے میں نے اپنی سیاہ عینک آنکھوں پر سے نیچے کھسکا کر ناک کی نوک پر ٹکا دی اور عینک کے اوپر سے اپنی اسٹیلا کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے خوشی کی سی چیخ نکل گئی۔

''پاپا! پاپا!''

اور اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے اور تبھی ایک زبردست کپکپی نے اس کے پورے بدن کو لرزا دیا۔ جیسے اس کے جسم میں کوئی آتش فشاں پھٹا اور اس کے جسم میں زلزلہ آ گیا ہو۔

ڈاکٹر لپک کر قریب آ گیا۔

میں نے چشمہ واپس اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

میری یہ حرکت کسی نے نہ دیکھی اور اب ہم دونوں..... میں اور ڈاکٹر اسٹیلا پر جھک گئے۔

اس کا چہرہ ست گیا تھا اور رنگ اتنا سفید ہوگیا تھا۔ جتنا ہوسکتا تھا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی، قابل رحم کوشش۔ لیکن اس کے دیدے اوپر چڑھ گئے اور نظر چھت سے ٹک گئی۔ اس کے منہ سے ایک سانس نکلی اور اسٹیلا کا ننھا سا سر میرے شانے پر ٹک گیا۔

وہ مر رہی تھی۔

وہ مر گئی۔

میری پیاری بچی۔ میری اسٹیلا۔

میرے سینے سے ایک ہچکی اٹھی، اور گولا بن کر میرے حلق میں پھنس گئی۔ اس ننھے اور بے جان جسم کو میں نے اپنے سینے سے لگالیا اور میری آنکھوں کے پیچھے کوئی بند ٹوٹ گیا۔ گرم گرم آنسو میرے رخساروں پر بہنے لگے۔

کمرے میں خاموشی طاری ہوگئی۔

لمبی، غمناک اور محترم خاموشی، کسی ویران بیابان کا سناٹا ہو جیسے۔ اور موت کا فرشتہ آیا اور میرے پیارے اور ننھے سفید گلاب کو لے کر چلا بھی گیا کہ اسے اپنے لافانی پھولوں کے باغ میں لگا دے۔

خدا جانے کب تک میں ایک غزدہ سناٹے کے عالم میں رہا اور کتنی دیر تک اس اجاڑ اور موت کی دنیا میں

گم رہتا کہ ڈاکٹر کی ہمدردانہ آواز، جو شدت جذبات سے کانپ رہی تھی، مجھے واپس اس دنیا میں لے آئی۔

''موسیو! اب ہٹ آیئے وہاں سے۔ بچی اب سارے دکھوں اور تکلیف سے چھوٹ گئی ہے۔ اس کا آپ کو باپ سمجھنا خدا کا کرم تھا اس بچاری پر۔ اس طرح اس کی موت آسان ہوگئی اور وہ ہلکے دل سے اس دنیا سے گئی۔ براہ کرام آیئے میرے ساتھ..... میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔''

میں نے ننھے بے جان جسم کو واپس اس بستر پر لٹا دیا جو اس کی حیات کی گرمی سے گرم تھا۔ میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اس کے بال ٹھیک کیے، اس کی اوپر اٹھی ہوئی بے نور آنکھیں بند کیں، اس کے ٹھنڈے موم کے سے گال اور ہونٹ چومے اور اس کے دونوں ہاتھ دعا مانگنے کے انداز میں جوڑ کر اس کے سینے پر ٹکا دیئے۔

اسٹیلا کے زرد اور سرد چہرے پر سنجیدہ مسکراہٹ منجمد تھی..... عظمت اور اطمینان کی مسکراہٹ، جلال اور معصومیت کی مسکراہٹ۔ اسونتا تسبیح پھیرنا بند کر کے اٹھی اور اپنے گلے سے سنہری صلیب نکال کر بچی کے سینے پر رکھ دیا۔ بڑھیا کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر کی جھریوں سے ہوتے ہوئے اس کی ٹھوڑی پر سے مسلسل قطروں کی شکل میں ٹپک رہے تھے۔ اس نے اپنے ایپرن سے آنکھیں پونچھتے ہوئے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مالکن کو خبر کرنی چاہئے۔''

ڈاکٹر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ ہر طرح سے مکمل برطانوی تھا۔ اپنے ارادے کا پکا اور ہر بات منہ پر اور صاف صاف کہنے والا۔

''جی ہاں!'' وہ تلخی سے بولا۔ ''تمہاری مالکن کو اس وقت یہاں ہونا چاہئے تھا۔''

''ننھی نے ایک دفعہ بھی انہیں یاد نہیں کیا۔'' اسونتا نے آہستہ سے کہا۔

''سچی کہتی ہو۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

ایک بار پھر کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

ہم تینوں چھوٹے سے پلنگ کے گرد کھڑے ہوئے تھے اور اس خالی خول کو دیکھ رہے تھے جس میں کچھ دیر پہلے جوہر حیات بند تھا۔ بے داغ معصوم موتی جو اب اس خاکی ڈبیہ سے نکل کر انجانی دنیا کی طرف لڑھک گیا تھا۔ عیسائی روایت اور عیسائیوں کے واہیات عقیدے کے مطابق یہ معصوم موتی مقدس مریم اپنے چغے میں ٹانکے بڑے فخر و غرور سے آسمانوں پر گھوم پھر رہی ہوگی۔

اپنی بیٹی کے مرنے کا مجھے سخت غم تھا لیکن ساتھ ہی میں ایک عجیب طرح کا، پراسرار اطمینان بھی محسوس کر رہا تھا۔ میں یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے اپنی بچی گنوائی نہ ہو بلکہ اب اسے میں نے اپنے لئے حاصل کر لیا ہو اور یہ کہ اب وہ بلا شرکت غیر میری تنہا میری ہو۔ زندگی میں وہ جتنے میرے قریب نہ تھی مر کر وہ اتنے قریب ہوگئی تھی۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا مستقبل کیسا ہوتا؟ وہ بالغ ہوتی، عورت بن جاتی۔ اس کے بعد کیا؟ بہترین سے بہترین عورت کی قسمت میں بھی عموماً کیا ہوتا ہے؟ غم، تکلیفیں، تفکرات، خاک شدہ آرزوئیں، کبھی نہ پوری ہونے والی خواہشیں اور ادھوری اور پابند زندگی کی ناکامیاں اور ستم بالائے ستم مرد کے مقابلے میں عورت کی کمتری، اس کی جسمانی کمزوری، کم عقلی، اپنی دنیا کی بھلائی اور اصلاح کرنے میں اس کی نا اہلیت اور کم مائیگی اور زبردستی..... یہ ان سب باتوں نے عورت کو ابتدائے آفرینش سے ایک قابل رحم مخلوق بنا رکھا ہے، مرد کی محتاج بنا رکھا ہے۔ اگر وہا چھی ہوئی تو اسے اپنے آقا کی ساری ہمدردیاں شجاعانہ راہبری دستگیری، حفاظت اور حمایت ملے گیا اور اگر وہ ''بری'' ہوئی تو پھر اسے وہی ملے گا جس کی وہ مستحق ہے۔ نفرت، حقارت، جھڑکیاں، ڈانٹ ڈپٹ اور کبھی کبھی تھپڑ اور لاتیں۔

اور ان سارے دکھوں سے، ان مظالم سے اور ان خطرات سے میری اسٹیلا بچ گئی تھی۔ غموں کا اور دکھوں کا اب اس کے لئے کوئی وجود نہ رہ گیا تھا اور اس

کی مجھے خوشی تھی اور شاید اس کا مجھے اطمینان تھا۔

اسونتھا کھڑکیوں کی جھلملیاں بند کررہی تھی۔ یہ باہر والوں کیلئے علامت تھی۔ اس بات کی کہ اس گھر میں موت ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر کا اشارہ پاکر میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگیا۔ جب ہم زینے پر پہنچے تو اس نے یک لخت میری طرف گھوم کر پوچھا۔

''آپ اطلاع دیں گے کونتس کو؟''

''مجھے تو معاف ہی رکھا جائے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں تماشہ دیکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

آپ کے خیال میں تماشہ کرے گی وہ؟ ڈاکٹر نے حیرت سے بھوئیں اچکا کر کہا۔ ''لیکن آپ نے سچ ہی کہا۔ وہ حقیقت میں بہت عمدہ اداکار ہے۔'' اس عرصے میں ہم زینہ اتر کر نیچے پہنچ گئے تھے۔

''لیکن ہے بہت خوب صورت۔'' میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ''بے شک۔ بہت زیادہ خوب صورت ہے۔'' اور یہاں ڈاکٹر کے ماتھے پر عجیب بل پڑ گئے۔

''لیکن محترم! جہاں تک میرے ذوق کا سوال ہے میں ایسے حسن پر بدصورت عورت کو ترجیح دوں گا۔''

اور یوں کہہ کر وہ اس گزرگاہ میں چل پڑا جو ''مادام'' کی خلوت گاہ کی طرف جاتی تھی۔

اب میں اکیلا تھا اور ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا اور کمرے میں سجی ہوئی ان چیزوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو میں نے ہماری شادی کے ابتدائی چند مہینوں میں...... میری بیوی کو دی تھیں۔

چند ثانیوں کے بعد ہی میں نے ہچکیوں کی آواز سنی جیسے کسی پر ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔ اور پھر میں نے تیز تیز قدموں کی چاپ اور لباس کی سرسراہٹ کی آواز سنی۔ چند ثانیوں بعد ہی ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر تمسخر آمیز اور تعریف کی مسکراہٹ نہیں بلکہ ہنسی تھی۔

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے کہا۔

''ہسٹریا کا دورہ، بدن ہلا ڈالنے والی ہچکیاں، لیس لگے ریشمی رومال، یوڈی کولون اور غش کھا جانے کی کوشش۔ بہت عمدہ ایکٹنگ، میں نے مادام کو یقین دلایا کہ بیماری لگنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ متعدی دوا کے استعمال سے بیماری کے سارے جراثیم ختم ہوجائیں گے۔ تو اب میں چلتا ہوں۔ ارے ہاں۔ کونتس نے کہا ہے کہ آپ چند منٹوں تک رکے ہیں، وہ کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں۔ آپ کو اور یہ کہ وہ آپ کو زیادہ دیر روک نہ رکھیں گی اور میرا مشورہ اپ کو یہ ہے کہ آپ جلد از جلد اپنے ہوٹل واپس جائیں اور عمدہ شراب کے دو ایک جام پی لیں۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا جھجک حکم کر دیجئے۔''

اور مجھ سے مصافحہ کر کے وہ رخصت ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں ین باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔

ایک بار پھر میں غمزدہ اور اداس دل لئے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ چنانچہ میں نرم قالین پر آنے والے کے پیروں کی چاپ نہ سنی۔ اس لئے جب میں ایک دم سے گھوما تو اپنے سامنے جیاکومو کو کھڑے دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ وہ چاندی کی کشتی میں ایک رقعہ رکھے مجھے پیش کر رہا تھا اور میری طرف ایسی محققانہ نگاہوں سے اور غور سے دیکھ رہا تھا کہ میں ذرا گھبرا گیا۔

''تو وہ ننھی فرشتہ گزر گئی۔'' جیاکومو نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ ''گزر گئی...... ہائے...... افسوس...... برا ہوا...... لیکن میرے مالک نہیں مرے...... نہیں...... نہیں میں اتنا بوڑھا بیوقوف نہیں ہوں کہ اس پر یقین کرلوں گا۔ نہیں۔ میرے آقا نہیں مرے۔''

میں نے اس کی ان باتوں کی طرف دھیان نہ دیا بلکہ انجان بنا رہا اور وہ پیغام پڑھنے لگا۔ جو نینا نے اپنی نازک تحریر میں پینسل سے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے دل کے ٹکڑے اڑ گئے ہیں۔ آپ

ایک مہربانی کریں گے مجھ غمزدہ پر؟ براہ کرم سگنور فیراری کو تار کر کے اس جانکاہ حادثے کی اطلاع دے دیجئے۔ آپ کا یہ احسان مجھ پر۔"

میں نے عطر بیز خط پر سے نظریں اٹھائیں اور بوڑھے بٹلر کے جھریوں پڑے چہرے پر جمادیں۔ وہ نا ٹے قد کا اور خمیدہ کمر آدمی تھا جس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ لیکن میرے دیکھنے کے انداز اور نظر میں کوئی خاص بات تھی کہ بوڑھے بٹلر نے ایکدم سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور کچھ بڑبڑایا جو میں سمجھ نہ سکا۔

"اپنی مالکن سے کہنا۔" میں نے نیچی اور کرخت آواز میں کہا۔ "ان کے حکم کی تعمیل ہو جانے کی۔ کہنا ان سے کہ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ سمجھ گیا۔" جیا کومو نے قدرے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میرے آقا نے مجھے کبھی کند ذہن اور بیوقوف نہیں سمجھا۔ میں ہمیشہ ان کی ہر بات سمجھ لیتا تھا۔"

"ایک بات کہوں بڑے میاں۔" میں نے قصداً بے حد سرد لہجے اور کٹیلے انداز میں کہا۔ "تمہارے آقا کے متعلق سن سن کر میرے کان پک گئے اور یہ موضوع اب مجھے بیزار کرنے لگا ہے اگر تمہارے آقا زندہ ہوتے تو وہ یقیناً یہی کہتے کہ تم سٹھیا گئے ہو۔ جاؤ۔ اب مزید بکواس کئے بغیر میرا پیغام فوراً کونتس تک پہنچا دو۔"

بڑے میاں کا رنگ فق ہو گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے اپنی جھکی ہوئی کمر سیدھی کی اور اپنے مرجھائے ہوئے ضعیف جسم کو کوشش کر کے کھینچا اور یوں وقار سے سینہ تان کر اس نے جواب دیا۔

"حضور! معاف کیجئے گا۔ لیکن میرے مالک نے مجھے کبھی حقیر نہیں سمجھا اور وہ اس طرح مجھ سے کبھی بات نہ کرتے۔"

پھر اس کا منہ لٹک گیا اور اس نے ملائمت سے کہا۔

"حالانکہ میں سمجھ رہا تھا۔ نہیں یہ میری غلطی تھی۔ حقیقت میں میں سٹھیا گیا ہوں..... کوئی مشابہت نہیں ہے۔ ذرا بھی نہیں۔"

چند ثانیوں تک وہ خاموش رہا اور پھر بڑی عاجزی سے بولا۔

"میں آپ کا پیغام مالکن تک پہنچا دوں گا حضور۔"

اس کے جاتے ہی میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا۔ میں بوڑھے ملازم سے بڑی سختی سے پیش آیا تھا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ ضروری تھا۔ اس کا مجھے غور سے دیکھنا، میرے قریب آتے ہوئے اس کی جھجک، اس کے سلوک میں میرا احترام، جب میں اسے مخاطب کروں تو اس کے بدن پر طاری ہوتی ہوئی کپکپی۔ یہ سب باتیں مجھے خبردار کر رہی تھیں کہ مجھے اپنے اس بوڑھے نمک خوار سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے۔ اگر اس نے مجھے کہیں پہچان لیا تو میرے سارے کئے کرانے پر پانی پھر جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو یہ میری بہت بدقسمتی ہوگی۔

میں نے اپنی ہیٹ اٹھائی اور گھر سے باہر آ گیا جب میں بالائی برآمدہ طے کر رہا تھا تو میں نے گھاس پر کوئی سفید چیز پڑی ہوئی دیکھی۔ یہ اسٹیلا کی گیند تھی جسے وہ کتے واولیس کے ساتھ کھیلتے ہوئے پھینکتی تھی اور کتا دوڑ کر اسے اٹھا لاتا تھا۔

میں نے وہ گیند روتے ہوئے دل کے ساتھ جھک کر اٹھائی اور اپنی جیب میں رکھ لی پھر نظریں اٹھا کر ان اندھیری کھڑکیوں کی طرف دیکھا جن کے عقب میں اندھیرے کمرے میں میری ننھی میری پیاری میرے دل کے ٹکڑے کا بے جان جسم پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اپنے ہونٹوں سے چھو کر ابدی نیند سوئی ہوئی اپنی اسٹیلا کی طرف آخری اور الوداعی بوسہ اچھال دیا اور پھر ان نامردانہ، کمزور اور زخمی جذبات کو، جو مجھ پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے تھے نہایت ہی سختی سے دبا کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا سڑک پر آ گیا۔

ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں تار گھر پڑتا تھا۔ چنانچہ وہاں سے میں نے جیدو کو روم تار بھیج کر اسٹیلا کے انتقال کی اطلاع دے دی۔

''اس خبر سے اسے حیرت ضرور ہوگی غم نہیں۔'' میں نے سوچا۔ وہ شروع سے ہی اس کے راستے کا کانٹا رہی ہوئی تھی..... بے چاری اسٹیلا''۔

تو کیا وہ اب اس ''نئی بیوہ'' کو جواب بے اولاد بھی رہ گئی تھی۔ تسلی اور دلاسے دینے کے لئے نیپلز آجائے گا؟ نہیں۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس پتھریلی عورت کو تسلیوں اور دلاسوں کی ضرورت ہی نہیں۔ کوئی المناک حادثہ اس پر انداز نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس بچی کے مرنے کا اسے کوئی غم نہ ہگا جس طرح کہ میرے مرنے کا بھی اسے کوئی غم نہ تھا۔ اسے تو وہ ایک مبارک فال سمجھے گی۔ میری موت پر بھی اس نے غمزدہ ہونے کے بجائے بے سک وشبہ خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ چنانچہ اب بھی..... اسٹیلا کی موت پر بھی وہ دل ہی دل میں شکر ادا کررہی ہوگی۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ دنیا کو دکھانے کے لئے وہ آنسو بہائے گی اور شاید پچھاڑیں بھی کھارہی ہوگی اس وقت بھی۔

ہوٹل کے اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے اپنے خادم ونسانزو کو ہدایت کردی کہ کسی کا بھی فون کیوں نہ آئے وہ کہہ دے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ اور دن کا بقیہ حصہ میں نے اپنے کمرے کی تنہائی میں گزارا کیونکہ بہت کچھ سوچنا تھا مجھے۔

مجھ میں اور میری بیوی میں جو ایک کمزور بندھن تھا۔ سو وہ اب ٹوٹ گیا تھا۔ جھوٹ اور فریب کے طویل سلسلے کی آخری کڑی۔ وہ ننھی سی جان..... اب نہ رہی تھی۔

''اس آخری کڑی کے ٹوٹ جانے کی مجھے خوشی ہے یا غم؟'' ایک سو دسویں دفعہ میں نے یہی سوال اپنے آپ سے پوچھا۔

اور میں نے حقیقت کا اعتراف کرلیا۔ حالانکہ اعتراف کرتے ہوئے میری روح کی بنیادیں تک لرز گئی تھیں۔

میں خوش تھا۔ جی ہاں..... مجھے خوشی تھی۔ اس کی کہ میری اپنی بچی مرگئی تھی۔ آپ شاید مجھے سنگدل بلکہ حیوان یا درندہ کہیں گے۔ لیکن کلیوں؟ میری طرح آپ بھی سوچئے کہ اگر وہ زندہ رہتی تو اس کی زندگی کتنی دکھ بھری ہوتی؟ اچھا ہوا وہ مرگئی۔ اب شاید وہ سکھی ہوگی دوسری دنیا میں۔ بشرطیکہ ایسی کوئی دنیا ہے۔

جی ہاں۔ میں خوش تھا کہ اسٹیلا اب اس دنیا میں نہ رہی تھی اور اب اس کے والدین کی زندگی کا سایہ اس پر نہ پڑے گا۔ کیونکہ میں اپنے ارادے کا پکا ہوں۔ اگر اسٹیلا زندہ رہتی تب بھی میں اپنا انتقام اس کی ماں سے ضرور لیتا اور ذرہ برابر بھی رعایت نہ کرتا۔ ایسا ہی سخت اور اذیت ناک انتقام ہوتا میرا جس کا نقشہ میں نے بنالیا تھا۔

اچھا ہوا کہ وہ زندہ نہ رہی۔

''اسٹیلا کا کیا ہوگا؟'' یہ سوال اب میرے انتقام کی راہ میں حائل نہ تھا۔

اب میں کھلے دل سے اور بلا جھجک مکمل ترین انتقام لے سکتا تھا اور لوں گا۔

میری خود داری، میری وفا اور میری میرے خاندان کی عزت کا نیلام کرنے والوں کو میں نہ بخشوں گا۔

کبھی نہ بخشتا۔ اسٹیلا زندہ ہوتی تب بھی نہیں۔

لیکن اس نے مرکر میرا کام آسان کردیا تھا۔

میری بچی..... بے چاری اسٹیلا۔

☆.....☆.....☆

اسٹیلا کی موت کو دس دن سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کی والدہ نے اپنے آپ کو سخت ''غمزدہ اور بیمار'' اور کسی بھی کام کے ''ناقابل'' ظاہر کرکے مجھ سے کہا تھا کہ بچی بچی کی تجہیز وتکفین کا سارا انتظام میں کروں گا۔

اس کی یہ درخواست میں نے بڑی خوشی سے قبول کرلی۔ کیونکہ اس طرح مجھے اس کی تدفین کے لئے خاندانی رومانی کے مقبرے کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو پسند کرنے کا موقع مل گیا۔ میں تو اس خیال سے بھی کانپ

جاتا تھا کہ اس ننھے جسم کو اس تہہ خانے میں سڑنے گلنے کے لئے رکھ دیا جائے جہاں میں نے ایسے پاگل کردینے والے ''عذاب'' برداشت کئے تھے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں کو مطلع کر کے میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ کونٹس کے حکم سے کر رہا ہوں، میں نے قبرستان کے کھلے خط میں اسٹیلا کی تدفین کے لئے عمدہ اور سائے دار جگہ کا انتخاب کیا اور اس درخت کے نیچے اس کی قبر کھدوائی جس درخت پر میں نے اپنے مقبرے کی مایوسانہ اور بھیانک قید میں رہ کر ایک بلبل کو گاتے سنا تھا۔ یہ درخت تہہ خانے کے دروازے کے قریب ہی تھا۔

اور یہاں اس درخت کے سائے میں، میری پیاری اسٹیلا کو میرے جگر گوشے کو دھرتی ماں کی گرم آغوش میں لٹا دیا گیا۔ میں نے قبر کے چاروں طرف بنفشے اور سنتی پھولوں کے پودے لگا دیئے اور قبر کے سرہانے سنگ مرمر کا کتبہ نصب کیا جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

''اونا اسٹیلا اور نینا۔''

اور اس کے نیچے اس کے والدین کے نام اور اس کی تاریک پیدائش اور تاریخ وفات کندہ تھی۔

غالباً یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طرف سے فرصت پا کر میں کئی دفعہ دیار رومانی میں اپنی بیوی سے ملنے گیا۔ نینا نے مجھ سے ملاقات کی، بظاہر اخلاقاً..... حالانکہ بچی کے مرنے کا اسے اس قدر ''غم'' تھا کہ وہ میرے علاوہ کسی اور سے ملاقات نہ کرتی تھی۔ وہ خوبصورت تو تھی ہی اور بیٹی کے مرنے پر اس نے اپنے اوپر جو اداسی اور افسردگی طاری کر لی تھی۔ اس نے اسے اور بھی زیادہ خوبصورت بنا دیا تھا اور وہ حرارت خانے میں رکھے ہوئے کنول کی طرح معلوم ہوتی تھی کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتا تھا۔

وہ اپنے حسن کے جادو سے پوری طرح واقف تھی اور مجھے مسحور کرنے کے لئے وہ بڑی تندہی سے یہ جادو مجھ پر چلا رہی تھی۔

لیکن اب میں ان اپنی تدبیریں بدل دی تھیں۔ میں اس کی طرف بہت کم متوجہ ہوتا تھا اور اس کے مسلسل بلاوے اور اصرار کے بعد ہی اس سے ملنے جاتا تھا۔ اس کی طرف میرے سارے التفات اور تمام تحفے تحائف موقوف ہو چکے تھے۔ وہ مجھے لبھا رہی تھی مجھ سے عشق لڑا رہی تھی اور میں بڑی بے حسی اور خاموشی سے یہ سب قبول کر رہا تھا۔ میں ایک کم سخن اور بے حس دل والے بوڑھے کا کردار ادا کر رہا تھا جو حسن کی موضوع کی تکابوں کے مطالعہ کو ترجیح دے رہا تھا۔ اور جب وہ ڈرائنگ روم میں میرے ساتھ بیٹھنے پر مصر ہوتی تو میں کوئی کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دیتا تھا اور اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیتا۔ اور وہ اپنے ماتمی، سیاہ نقاب میں سے میری طرف احترام، تعریف اور محبت کے ملے جلے جذبات سے دیکھتی لیکن چہرے پر ایسی اداسی اور غم طاری رکھتی کہ میں دل ہی دل میں اس کی اس ایکٹنگ کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکتا۔

ہم دونوں کو جیدو فیراری کا خط ملا تھا۔ میری بیوی کے نام اس کا جو خط آیا تھا وہ بے شک میں نے دیکھا نہ تھا۔ لیکن نینا نے مجھے بتایا تھا کہ ''اسے..... جیدو کو..... اسٹیلا کی موت سے سخت صدمہ ہوا تھا۔''

لیکن جو خط اس نے مجھے لکھا تھا تو وہ ایک مختلف کہانی ہی بیان کر رہا تھا۔ میرے نام جو خط آیا تھا اس میں جیدو نے یوں لکھا تھا:

''میرے عزیز دوست کونتے!

آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فابیو کی بیٹی کے مرنے کی خبر سے مجھے کوئی صدمہ، کوئی افسوس نہیں ہوا اگر وہ زندہ رہتی تو اس کی موجودگی مجھے دو باتیں یاد دلاتی رہتی جنہیں میں بھول جانا چاہتا ہوں۔ اس شیطان نے مجھے کبھی پسند کیا ہی نہیں۔ چنانچہ اگر وہ زندہ رہتی تو میری راہ کا کانٹا، ایک مصیبت بلکہ ایک عذاب بنی رہتی۔ چنانچہ سچ تو ہے کہ کونتے کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ وہ مر کر میرے لئے راستہ صاف کر گئی۔''

آگے چل کر اس نے اپنے اس خط میں مجھے مطلع کیا۔

''میرے چچا موت کی دہلیز پر پہنچ گئے ہیں اور حالانکہ دروازہ ان کے لئے پاٹوں پاٹ کھول دیا گیا ہے لیکن وہ اس میں داخل ہونے کا ارادہ اب تک نہیں کر سکے لیکن ڈاکٹروں کے بقول ان کا یہ شش و پنج زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے گا اور وہ بہت جلد موت کے اس کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ امید ہے کہ مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا لیکن اگر ایسا ہوا..... یعنی میرے چچا کو جلد موت نہ آئی تو میں سب کچھ چھوڑ کر پنج کرا اپنے ورثے پر خاک ڈال کر واپس نیپلز آ جاؤں گا۔ کیونکہ میں نینا سے دور رہ کر عجیب طرح کی بے چینی اداسی اور فکر محسوس کر رہا ہوں۔ حالانکہ جانتا ہوں کہ آپ کے ہوتے ہوئے میری نینا محفوظ ہے اور اس کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہ ہوگی۔''

یہ آخری پیرا میں نے خصوصیت سے اپنی بیوی کو سنایا۔ یہ الفاظ میں آہستہ آہستہ پڑھ کر اسے سنا رہا اور کنکھیوں سے اس کے چہرے پر کے اتار چڑھاؤ کو دیکھتا جا رہا تھا۔

وہ غور سے سنتی رہی اور میں نے دیکھا کہ اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی..... یہ غصے کی سرخی تھی اور اس کی بھوئیں ناک کے اوپر آپس میں مل گئیں اور میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ اس کی سخت برہمی کی علامت تھی۔ اس کے ہونٹ نصف شیریں اور نصف سرد و تلخ مسکراہٹ سے کھلے اور اس نے کہا۔

''میں آپ کی مشکور ہوں کونتے کہ آپ نے مجھ سے کچھ نہ چھپاتے ہوئے مجھے خط سنایا اور اب مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ سگنور فیراری کی کود غرضی اور گستاخی کس انتہا کو پہنچ سکتی ہے۔ حیرت تو مجھے اس بات کی ہے کہ اس نے آپ کو ایسا خط لکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے مرحوم شوہر سگنور فیراری کے درمیان اتنا گہرا لگاؤ تھا اور دونوں میں ایسے عزیزوں کے سے تعلقات تھے کہ اب سگنور فیراری یہ سمجھنے لگے ہیں کہ مجھ پر انہیں بڑے اختیارات حاصل ہیں۔ وہ مجھے حقیقت میں اپنی بہن سمجھتے ہیں اور یہ کہ حکم چلا سکتے اور پابندیاں عائد کر سکتے ہیں جیسا کہ دنیا کے بڑے بھائیوں کا حال ہے۔ مجھے واقعی اب پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں سگنور فیراری کے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آتی رہی۔ ہوں اور انہیں کچھ زیادہ ہی آزادیاں دے رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب سر چڑھ گئے ہیں۔''

''سچ کہا۔'' میں دل میں بولا۔

اور تلخی سے مسکرایا۔ میرا کھیل اب شباب پر تھا، بازی میرے ہاتھ میں تھی۔ چنانچہ اب شش و پنج کی اور سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ مجھے اپنی چال فوراً ہی چلنی تھی۔

''میں سمجھتا ہوں مادام۔'' میں نے جیدو کا خط تہہ کر کے اپنی پاکٹ بک میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں مادام کہ سگنو فیراری آپ کے بھائی سے زیادہ آپ کے کچھ اور بننے کی..... اور وہ بھی بہت جلد..... آس لگائے بیٹھے ہیں۔''

ہائے! عورت ذات کی مکاریاں۔ کوئی تعجب نہیں کہ ٹانگوں اور اسٹیج پر یہ ایسی کامیاب ایکٹریس ثابت ہوتی ہیں۔ ایکٹنگ ان کی فطرت ہے اور جھوٹ اور بناوٹ ان کی زندگی کا عنصر۔

چنانچہ اس عورت نے بھی خجالت اور پریشانی اور گھبراہٹ کا ذرا بھی اظہار نہ کیا اس کے برخلاف اس نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اور بے تحاشہ میری طرف دیکھا اور پھر حقارت سے ہنسی۔

''اگر ایسا ہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''تو پھر مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سگنور فیراری کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی میرے عزیز کونتے۔''

اور یہاں وہ اپنی کرسی پر سے اٹھی اور بڑی سرعت سے جو مجھے ہمیشہ چیتے کی چال یاد دلا دیتی تھی، کمرے کی لمبائی عبور کر کے میرے قریب آئی۔

''میرے عزیز کونتے! کیا سچ مچ اس کی احمقانہ جسارت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ توبہ..... توبہ..... کس قدر واہیات!''

اور وہ میرے قریب والی کرسی میں ''دھپ'' سے بیٹھ گئی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

عورت کیا اس دورنگی پر دم بخود ہو کر میں نے کہا۔

''جی میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔''

''پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں؟''

''سگنور فیراری نے تو مجھ سے ایسا ہی کہا تھا۔''

وہ تمسخر سے مسکرائی۔

''واہ! یہ تو بڑی عزت افزائی کی گئی ہے میری۔'' وہ ہنس کر بولی۔

''اور کونتے! کیا آپ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی درخواست میں قبول کرلوں گی؟''

میں خاموش رہا۔ کیونکہ میں الجھ گیا تھا اور میرا دماغ پریشان ہوگیا تھا۔ اس طرح کے فریب سے واسطہ پڑے گا تو یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ ایسے جھوٹ اور دھوکے بازی کا سامنا کرنا اور پھر اسے برداشت بھی کرلینا میرے لئے بہت مشکل تھا۔

اس عورت کے پاس ضمیر جیسی کوئی چیز تھی بھی یا نہیں؟ وہ تمام پرجوش آغوشیاں، وہ گرم بوسے، وہ راز و نیاز وہ لگاوٹ کیف اتیں اور وہ وعدے وعید..... کچھ مطلب نہ تھا ان کا؟ جھوٹ اور دھوکا تھا وہ سب کچھ؟ کیا وہ سب کچھ اس عورت کے ذہن سے یوں مٹ گیا تھا جس طرح گیلا اسفنج سلیٹ کی تحریر مٹا دیتا ہے؟ سچ کہتا ہوں مجھے جیدو کی حالت پر رحم آ گیا۔ اس کا مقدر نینا کے ہاتھ میں تھا اور اس کے ہاتھوں اس کا وہی حشر ہونے والا تھا جو میرا ہوا تھا۔

لیکن مجھے حیران اور پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ کیوں ہمدردی کروں اس سے؟ کیوں ترس کھاؤں اس پر؟ کیوں؟ یہ تو میرے انتقام کا ہی ایک حصہ تھا۔ ایسا ہی تو نقشہ بنایا تھا میں نے بدلا لینے کا۔

''آپ ہی بتایئے کونتے۔'' میری بیوی کی جاندی کی گھنٹیوں جیسی آواز نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کردیا۔ ''کیا واقعی آپ کا خیال ہے کہ سگنور فیراری کی ایسی کوئی درخواست میں قبول کرلوں گی؟''

اب میرا بولنا ضروری تھا۔ اس طریقہ کو مجھے انجام پہنچانا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

''سچ تو یہ ہے مادام کہ میرا تو ایسا ہی خیال ہے۔''

''وجہ؟''

''حالات کے پیش نظر نہ صرف میں بلکہ کوئی بھی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا۔''

''کیسے حالات۔''

''میرا مطلب ہے صورت حال۔''

''پھر بھی۔''

''دیکھئے کونتس! سگنور فیراری جوان ہیں، بے حد قبول صورت بلکہ خوبصورت ہیں اور اپنے چچا کے انتقال کے بعد بری دولت کے بھی مالک بننے والے ہیں.....''

''تو۔''

''.....تو اس سے زیادہ آپ کو کیا چاہیے۔ اس کے علاوہ آپ کے شوہر کے دوست ہیں۔''

''اور اس وجہ سے میں کبھی ان سے شادی نہ کروں گی۔'' اس نے میری بات کاٹ کر فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اگر سگنور فیراری مجھے پسند بھی ہو۔ حالانکہ نہیں ہیں۔''

''جھوٹی، دغا باز عورت۔'' میں نے دل میں کہا۔

''تب بھی میں ان سے شادی کرکے دنیا کو انگشت نمائی کا موقع دینا نہیں چاہتی۔ توبہ..... توبہ! کیا کہیں گے دنیا والے ایسی شادی پر؟ کتنی ہی انگلیاں اٹھیں گی میری طرف؟ کتنی کانا پھوسیاں ہوں گی؟ نا بابا نا۔ میں یہ شادی کرکے ایسا خطرہ کبھی مول نہ لوں گی۔''

''معاف کرنا کونتس لیکن میں سمجھا نہیں کہ اس میں خطرہ کہاں سے آ گیا؟''

''آپ جانتے کونتے کہ مارنے والے کے ساتھ پکڑے جاسکتے ہیں، لیکن بولنے والے کی زبان نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ سگنور فیراری میرے مرحوم شوہر کے جگری دوست تھے۔ اب اگر میں نے ان سے شادی

کرلی تو لوگ یہی کہیں گے کہ میرے شوہر کی زندگی میں بھی میرے اور سگنور فریاری کے درمیان کوئی ایسا ویسا سلسلہ چل رہا تھا۔ ضرور ایسا ہی کہیں گے اور میں ایسا زبردست بہتان برداشت نہ کرسکوں گی اور ..... اور..... مارے غیرت کے مرجاؤں گی۔''

کہتے ہیں۔ ''قتل ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔'' اور ''جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔'' اور یہاں جرم ایک حد تک اپنے آپ کو ظاہر کررہا تھا۔ ایک مجرمہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنے آپ کا اقرار کررہی تھی۔ کیونکہ ایسی عورت جو بالکل ہی بے گناہ ہو یوں فوری طور پر سماج کی ''انگشت نمائیوں'' اور ''کانا پھوسیوں'' کے متعلق نہیں سوچ سکتی، اگر وہ بے گناہ ہو تو اسے یہ خیال آ ہی نہیں سکتا۔ معصومیت اور بے گناہی کو تو سماج کے بہتانوں اور انگشت نمائیوں کی پرواہ ہوتی ہی نہیں کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ آخرکار فتح اسی کی ہوگی۔

لیکن میری بیوی (افسوس کہ مجھے اب بھی اسے اپنی بیوی کہنا پڑ رہا ہے) اول درجہ کی بدخصائل اور جھوٹی عورت تھی۔ اس کے باوجود وہ اندھے سماج کو بیوقوف بنانے اور دنیا پر اپنی اچھائیوں کا سکہ جمانے میں کوشاں تھی۔ بے چارہ سماج! بے چاری دنیا! کتنی آسانی سے اسے بیوقوف بنایا جاسکتا ہے اور یہ دنیا بھی کس قدر فراخ دلی سے بیوقوف بن کر گنہگار کو ظاہر دیکھتی ہے اور ان کی ''اچھائیوں'' کی تعریف کرنے لگتی ہے۔ میری بیوی بھی دنیا سے اپنی تعریف کروانا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس کا..... میری بیوی کا..... باطن کچھ اور تھا اور وہ پرلے درجے کی جھوٹی تھی۔

لیکن مجھے اس حسین جھوٹی کو جواب دینا ضروری تھا جس نے اب اپنے حسین فریب کا جال مجھے پھانسنے کے لئے پھیلا رکھا تھا چنانچہ میں نے دل پر جبر کرکے خوش خلقی سے کہا۔

''کونٹس! آپ پر کوئی بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ میرا مطلب ہے میرے ہوتے ہوئے۔''

اور وہ سر جھکا کر دل لوٹ لینے والے انداز میں مسکرائی۔

''لیکن۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ سچ ہے کہ آپ سگنور فیراری کو پسند نہیں کرتیں.....''

''یہ سچ ہے۔'' وہ ایکدم سے جوش میں آ گئی۔ ''وہ گنوار اور حد درجہ کا بداخلاق اور بدتمیز آدمی ہے۔ میں نے اسے مچھلی کی طرح شراب پیتے اور نشے میں دھت اور اس حالت میں دیکھا ہے۔ اسے اپنے پرائے کی تمیز نہیں رہی۔ اکثر اوقات تو وہ ناقابل برداشت بن جاتا ہے۔ آپ پسند کو کہتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کو نتے کہ مجھے اس شخص سے ڈر لگتا ہے۔''

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہوگیا تھا اور اس کے ہاتھ جو ریشمی کپڑے پر کشیدہ کاری کررہے تھے۔ کانپ رہے تھے۔''

''اس صورت میں۔'' میں نے کہا۔ ''سگنور فیراری کو سخت مایوسی ہوگی۔ بے چارا فیراری۔ اس پر ترس آتا ہے مجھے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ آپ کے اس فیصلے سے میں خوش بھی ہوں کیونکہ.....''

''کیونکہ کیا؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے آگے کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیونکہ۔'' میں نے بناوٹی گھبراہٹ سے کہا۔ ''اس طرح ان دوسرے مردوں کے لئے راستہ کھل جائے گا جو مہذب اور خوبصورت کونٹس رومانی کے ہاتھ کے خواہاں ہیں۔''

اس نے اپنا خوبصورت سر آہستہ آہستہ نفی میں ہلایا اور لمحہ بھر کے لئے اس کے بشرے سے انتہائی مایوسی کے آثار ظاہر ہوکر مٹ گئے۔

''بقول آپ کے یہ دوسرے مرد ایسی جرأت نہیں کرسکتے۔'' اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

''کیوں؟''

اور اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی چمک آ گئی۔

''خصوصاً اس لئے۔'' وہ بولی۔ ''کہ سگنور فیراری نے میری حفاظت اور نگہبانی کرنے کا فرض اپنے اوپر لادلیا ہے۔''

''خود انہوں نے یہ فرض اپنے اوپر لادلیا ہے!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جی ہاں میں نے تو انہیں اپنا محافظ اور نگہبان نہیں بنایا۔''

''ایسا کیوں؟''

''اس لئے کہ میں سمجھتی ہوں کہ وہ مجھے اپنے لئے ہی رکھنا چاہتے ہیں۔ کس قدر احمقانہ اور محال خیال ہے یہ ان کا۔ اب میرے لئے تو صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔

''کون سا۔''

''میں نیپلز چھوڑ دوں۔''

''کیوں چھوڑ دوں۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سرخ ہوگئی۔

''میں سگنور فیراری سے بچنا چاہتی ہوں۔''

چند ثانیوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''میں سچ ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ پچھلے ایک عرصے سے سگنور فیراری نے اپنی حرکتوں سے مجھے سکت پریشان اور ناراض کر رکھا ہے۔ مجھے نہ تو ان کی مہربانیوں کی ضرورت ہے اور نہ ہی میں یہ عذاب برداشت کرسکتی ہوں۔ آپ کی ''پناہ'' میں تو پوری طرح سے محفوظ ہوں لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ ''پناہ گاہ'' مجھے ہمیشہ میسر نہیں آسکتی۔''

اور اب وہ وقت آ گیا تھا۔

''کیوں میسر نہیں آسکتی؟'' میں نے کہا۔

''جی!!''

''اس کا انحصار آپ پر ہے۔''

وہ چونکی، کرسی پر سے ذرا اٹھی، بیٹھ گئی۔ ریشمی کپڑا اور کڑھائی کا سامان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

''میں سمجھی نہیں۔'' اس نے کچھ شرما کر لیکن زیادہ تر اشیاق سے پوچھا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا کونتے؟''

''مطلب وہی ہے جو میں نے کہا۔''

''میری آواز کرخت اور لہجہ سرد تھا۔ میں نے اس کی گری ہوئی چیزیں جھک کر فرش پر سے اٹھائیں اور اس کی آغوش میں رکھ دیں۔

''کونتس! آپ نے کہا ہے کہ آپ کو ہمیشہ میری پناہ نہیں مل سکتی۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''حالانکہ آپ ہمیشہ میری پناہ میں رہ سکتی ہیں۔ برا نہ مانیئے۔ میری بیوی بن کر۔''

''کونتے!'' اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔

میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ٹھیٹھ کاروباری انداز میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ میری اور آپ کی عمر میں کئی برسوں کا فرق ہے اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میں نہ جوان ہوں، نہ خوب صورت ہوں اور نہ میری صحت ایسی قابل رشک ہے کہ میں اسی کے ذریعے آپ سے اپنی سفارش کرسکوں۔ حوادث کے طوفانوں پر مصائب اور سخت مایوسیوں نے مجھے ایسا بنا دیا ہے جیسا کہ اس وقت آپ کے سامنے ہوں، لیکن میرے پاس دولت ہے، بے پناہ دولت جو کبھی ختم نہ ہوگی پھر میری عزت ہے، میرا ایک مقام ہے اور رسوخ ہے۔'' اور یہاں میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کے علاوہ آپ کی قابل رشک خوبیوں اور خصوصیات سے پورا پورا انصاف کرنے کی آرزو ہے میرے دل میں۔ اور میں کوئی کسر اٹھائے بغیر آپ کو وہ سب کچھ دے ڈالنا چاہتا ہوں جس کو آپ بجا طور پر مستحق ہیں۔ اب اگر آپ میرے ساتھ خوش رہ سکتی ہیں تو بلا جھجک صاف صاف کہہ دیجئے۔ ایک بات دھیان میں رکھئے کہ میں جوان مرد کا سا پیار اور گرمی تو آپ کو نہ دے سکوں گا کیونکہ عمر کے لحاظ سے میرے خون میں ایسی گرمی نہیں اور نہ ہی نبضوں میں ایسی دھڑکنیں ہیں۔ البتہ اس کا میں یقین دلاتا ہوں

میں جو کچھ کرسکتا ہوں۔ ضرور کروں گا۔ اس میں بھی کوئی کوتاہی نہ ہوگی۔''

اور یوں کہہ کر میں خاموش ہوگیا اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ اس کے چہرے پر پہلے زردی اور پھر سرخی دوڑ گئی اور ایسا معلوم ہوا کہ چند لمحوں کے لئے وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر..... فتح مندی کی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹ کو ہلکا سا خم دے کر مہرابی بنا دیا، اس نے اپنی بڑی بڑی اور خوبصورت آنکھوں پر سے پلکوں کی چلمن اٹھائی اور میری طرف ان نگاہوں سے دیکھا جو زاہد خشک کے دل میں ہلچل پیدا کرسکتیں۔ اور فرشتوں کی عبادات میں خلل ڈال سکتی تھیں۔ اس نے سلائیاں رکھ دیں اور اٹھ کر میرے قریب آ گئی اور اس کی گرم اور معطر سانس میرے گالوں پر بکھر گئی۔ اس کی عجیب نگاہوں نے مجھے مسحور کرلیا اور ایک طرح کی ہلکی جھنجھناہٹ نے میرے اعصاب کو جھنجھنا دیا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ۔'' وہ بولی اور اس کی آواز میں، میں نے ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ اپ کا مطلب ہے کہ آپ مجھ سے شادی کرنے کو تیار ہیں لیکن۔ آپ حقیقت میں مجھ سے پیار نہیں کرتے؟''

اور اس نے تقریباً ملتجیانہ انداز میں اپنا نازک اور سفید ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اور ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے انداز دل ربا اور پتھر کو پگھلا دینے والے تھے۔

میں خاموش تھا اور اس خواہش کو دبانے کی جدوجہد کررہا تھا جو میرے دل میں بیدار ہوچکی تھی۔

جی ہاں۔ اس حسین اور جھوٹی ساحرہ کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگانے کی اور اس کے ہونٹ چوم لینے کی زبردست خواہش میرے دل میں بیدار ہوگئی اور میرا جی چاہتا تھا کہ اپنی ''گرم اور جوان'' آغوش سے اسے چونکا دوں۔

لیکن میں نے کوشش کرکے اپنی اس دیوانی خواہش کو دبا دیا اور خاموش کھڑا رہا۔ وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر اس نے میرے شانے پر سے اپنا ہاتھ آہستہ سے اٹھالیا اور پھر اس ہاتھ کی انگلیوں سے میرے سفید بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

''نہیں..... تم مجھ سے پیار نہیں کرتے۔'' ساس نے بے حد نیچی اور جذباتی آواز میں کہا۔ ''لیکن میں اعتراف کئے لیتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ..... میں کہیں چاہتی ہوں۔''

اور وہ تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور یہ سفید جھوٹ بولتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ جھوٹ تھا۔ اس کے باوجود میں نے وہ ہاتھ تھام لیا جس کی انگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کررہی تھیں اور میرے رگ و ریشے میں جھنجھناہٹ کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر میں نے کہا۔

''آپ مجھے چاہتی ہیں؟''

''آپ نہیں..... تم کہو۔''

''تم مجھے چاہتی ہو؟ نہیں..... نہیں..... یقین نہیں آتا..... یہ ناممکن ہے۔''

وہ ہنسی اور چاندی کی سیکڑوں گھنٹیاں بج اٹھیں۔

حالانکہ یہ سچ ہے۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ تمہیں پہلی دفعہ دیکھتے ہی میرا دل تمہاری طرف کھنچ گیا۔ اسی کو کہتے ہیں پہلی نظر کا پیار میں اسی وقت سے تمہیں چاہنے لگی تھی۔ اپنے شوہر کو بھی میں نے کبھی پسند نہیں کیا اور حالانکہ کئی باتوں میں تم ان سے مشابہ ہو لیکن بہت سی باتوں میں ان سے قطعی مختلف ہو اور ہر طرح سے اس سے بہتر اور بڑھ کر ہو۔ مانو یا نہ مانو تمہاری مرضی لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں تم ہی وہ تنہا آدمی ہو جس سے میں نے پیار کیا ہے۔''

اس نے ذرا بھی سرخ ہوئے بغیر، ذرا بھی جھجکے بغیر بڑے تکبر اور خودداری اور بے حیائی سے یوں اقرار محبت کیا کہ میں سناٹے میں آ گیا اور چند ثانیوں تک بت بنا کھڑا رہا اور پھر پوچھا۔

''تم تو میری بیوی بنو گی؟''

''ضرور بنوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور یہ

بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟ سیزر ہے نا؟''

''ہاں۔'' میں نے میکانکی طور پر جواب دیا۔

''تو پھر میرے پیارے سیزر! یقین کرو کہ میں تمہیں اپنی محبت میں گرفتار کرلوں گی اور تم مجھے اتنا پیار کرو گے، اتنا پیار کرو گے کہ کبھی کسی مرد نے کسی عورت سے اور کسی شوہر نے اپنی بیوی سے نہ کیا ہوگا۔''

اور پھر اٹھلا کر اور لچکدار شاخ کی طرح لچک کر آگے بڑھی اور میرے سینے سے لگ گئی اور اپنا سرخ و سفید جس سے نور کے فوارے پھوٹ رہے تھے، چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

''سیزر! بوسہ لو میرا۔'' اس نے کہا اور انتظار کرنے لگی۔

اور جیسے خواب میں، جب آدمی پر خود اپنا اختیار نہیں ہوتا، میں نے جھک کر وہ جھوٹے ہونٹ چوم لئے..... حالانکہ اس کے بجائے میں زہریلے سانپ کے اپنے ہونٹ رکھنا زیادہ پسند کرتا۔

اس کے باوجود اس بوسے نے میرے دل میں ایک عجیب کا غضبناک جوش پیدا کردیا۔ میں نے اس کی کمر میں اپنے بازو ڈال دیئے اور اسے اپنے سے الگ کرکے اس کاؤچ پر بٹھا دیا جس پر سے وہ اٹھ کر آئی تھی۔ میں بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں نے اب بھی اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے آپ سے لگا رکھا تھا۔

''واقعی تم مجھ سے پیار کرتی ہو؟'' میں نے مجنونانہ جوش سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''اور میں وہ پہلا آدمی ہوں جس کو تم نے اپنے دل میں جگہ دی ہے؟''

''بالکل۔''

''اور فیراری کو تم نے پسند نہیں کیا؟''

''کبھی نہیں۔''

''اس نے کبھی بھی تمہیں اس طرح نہیں چوما ہے۔''

''ایک دفعہ بھی نہیں۔''

خدایا! جھوٹ کس طرح اس کے ہونٹوں سے نکل رہا تھا۔ آبشار تھا جھوٹ کا جو ابلا آرہا تھا اور یہ جھوٹ اس معصومیت اور یقین سے کہے جارہے تھے جیسے سچ ہوں۔ اس خوبصورت عورت کی زبان سے جس آسانی سے اور بلا جھجک یہ جھوٹ نکل رہے تھے۔ اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ایسی حیرت آپ نے، میں سمجھتا ہوں ضرور جادو کے تماشے میں محسوس کی ہوگی۔ جب شعبدہ باز کو اپنے منہ سے رنگ برنگی فیتوں کو مسلسل کھینچ کر نکالتے دیکھا ہوگا..... وہ کھنچتا جاتا ہے اور فیتہ ہے کہ اس کے منہ سے نکلتا چلا جاتا ہے اور آپ حیرت سے سوچتے ہیں کہ یہ گزوں لمبا فیتہ اس کے پیٹ میں کہاں سے اور کیسے آگیا۔ بس ایسی ہی حیرت اس وقت میں محسوس کررہا تھا کہ یہ اتنے بہت سے جھوٹ اس زبان سے ایسی آسانی سے کیسے ٹپک پڑتے ہیں۔

میں نے اس کا وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کی ایک انگلی میں ہماری شادی کی وہ انگوٹھی اب بھی چڑھی ہوئی تھی جو خود میں نے اسے اپنی شادی کے دن گرجا میں پہنائی تھی۔ اسی انگلی میں اب میں نے وہ سنہری چھلا پہنا دیا۔ جو بہت قیمتی، نازک اور خوب صورت تھا اور چمک رہا تھا۔ ایک مدت سے میں یہ چھلا اپنی جیب میں اسی وقت کے لئے پھر رہا تھا جو میں جانتا تھا کہ ضرور آئے گا۔

خوشی کے ایک نعرے کے ساتھ وہ میری بانہوں میں سے نکل گئی۔

''ہائے سیرز! کس قدر خوبصورت! کتنے اچھے ہو تم۔''

اور پھر وہ مجھ پر جھک گئی اس نے مجھے چوم لیا اور پھر اپنا سر میرے شانے پر ٹکا کر اپنا چھلے والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور چھلے میں جڑے ہوئے ہیرے کو دیکھنے اور اس کی چمک سے خوش ہنے لگے۔

اور پھر اس نے ایک دم سے فکرمند ہوکر کہا۔

''سیرز! تم یہ بات جیدو سے تو نہ کہو گے ناں؟ کم سے کم فی الحال نہیں۔''

''نہیں کہوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''کم سے کم اس کے واپس آنے تک تو نہ کہوں گا۔ ورنہ وہ حضرت فوراً ہی روم چھوڑ کر اس طرف بھاگ پڑیں گے اور فی الحال ہم کباب میں یہ ہڈی نہیں چاہتے۔ ہے نا؟''

اور میں اس کی کاکلوں سے کھیلنے لگا اور میں دل ہی دل میں اپنے منصوبوں کی اس فوری کامیابی پر حیران تھا۔ ادھر نینا کسی سوچ میں سر جھکائے ہوئے اور کچھ اداس رہی۔

چند ثانیوں تک گہری خاموشی کا وقفہ رہا۔

اگر وہ جانتی..... میں نے سوچا۔ اگر اسے شک بھی ہوگیا ہوتا کہ جس شخص نے اسے اپنی آغوش میں لے رکھا ہے۔ وہ خود اس کا شوہر ہی ہے، وہی شخص ہے جس سے اس نے بیوفائی کی، دھوکا دیا، وہی بیوقوف ہے جس کا اس نے مذاق اڑایا اور اس جس سے نفرت کی، وہی ہے جس کی زندگی اس کی راہ کا روڑا بنی رہی، وہی ہے جس کے مرنے پر اس نے خوشیاں منائی تھیں۔ ہاں۔ اگر اسے یہ شک بھی ہوگیا ہوتا تو کیا وہ یوں دلربائی سے مسکرائی ہوتی؟ کیا تب اس نے میرے ہونٹ چومے ہوتے؟

وہ میری بانہوں میں سمٹی رہی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے سے ٹکا دیا تھا اور اسی انگوٹھی کو اپنی انگلی میں گول گول گھما رہی تھی۔ جو ابھی ابھی میں نے اسے پہنائی تھی۔

اور پھر اس نے اپنی خوب صورت آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

''ایک بات مانو گے میری؟'' اس نے کہا۔

''بے معمولی بات ہے۔ لیکن اس سے مجھے اتنی خوشی حاصل ہوگی کہ بیان نہیں کرسکتیت۔''

''کہو..... ضرور کہو..... بندہ ہوں تمہارا۔'' میں نے کہا۔ ''حکم تمہارا بجا آوری میری۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو پھر..... اپنی یہ کالی عینک اتار دو۔ میں تمہاری آنکھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

میں ایک دم صوفے پر سے اٹھ گیا اور بے حد سرد لہجے میں جواب دیا۔ ''اور جو جی چاہے مانگ تلو لیکن یہ نہیں۔ میری آنکھ پر ذرا بھی روشنی مجھے تکلیف میں مبتلا کردیتی ہے۔ یہ ایسی تکلیف ہوتی ہے جو بعد میں کئی گھنٹوں تک میرے اعصاب کو جھنجھناتی رہتی ہے۔ چنانچہ فی الحال تو میں جیسا بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں۔ اسی پر مطمئن رہو اور مجھے اسی طرح قبول کرلو البتہ اس کا میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہوگی.....''

''کب؟'' اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

اور میں نے جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا اور پھر بولا۔

''ہماری شادی کے دن کی شام کو ہی۔''

اس نے شرم سے سرخ ہو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''تب تو مجھے بہت زیادہ طویل انتظار میں کرنا پڑے گا۔''

''میرے خیال میں تو اتنا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔'' میں بولا۔

''اس نے سوالیہ اور پر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''اس وقت کون سا مہینہ چل رہا ہے؟ نومبر۔'' میں نے جیسے حساب جوڑتے ہوئے کہا۔ ''چنانچہ اب اگر میں نئے سال کے دوسرے مہینے کی کوئی مبارک ہماری شادی کے لئے ے کرلوں تو تمہیں خوشی ہوگی؟ میرا مطلب ہے کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟''

''لیکن میری یہ تازہ بیوگی..... اور اسٹیلا کی موت۔'' اس نے لنگڑا لولا اور احتجاج کیا اور اپنا معطر ریشمی رومال آنکھوں پر رکھ لیا۔

''فروری میں آپ کے شوہر کی چھماہی ہوجائے گی۔ یعنی ان کے انتقال کے چھ مہینے گزر جائیں گے پورے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور تمہارے جیسی جوان کے لئے سوگواری کی اتنی مدد کافی ہے۔ رہی اسٹیلا

کی موت تو اس کی موت کے بعد تو تمہاری تنہائی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے اور اتنی بھیانک ہوگئی ہے کہ اب تمہارے لئے ہی محافظ کی پناہ میں جلد از جلد چلے جانا ضروری ہوگیا ہے ورنہ خدانخواستہ تمہارے دل و دماغ پر اثر ہوگیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ یقین کیجیے سماج آپ کو ملامت نہ کرے گا۔ رہی لوگوں کی انگشت نمائیاں اور کانا پھوسیاں تو میں جانتا ہوں انہیں خاموش کرنا۔''

شعوری کامیابی کی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹ یوں کھول دیئے کہ اس کے سفید اور انار کے دانوں جیسے خوب صورت دانت چمک گئے۔

''جیسی تمہاری مرضی سیزر۔ تمہاری خوشی سو میری خوشی۔'' اس نے بڑی متانت سے کہا۔ ''تم پورے نیپلز میں عورتوں کے معاملہ میں۔ ''ٹھنڈے میٹھے فالسے'' کے طور پر مشہور ہو اور جب تم ہی اب ایسے بے تاب اور بے صبر عاشق بن گئے ہو تو میں انکار اور اعتراض کرنے کی جرات نہیں کرسکتی۔''

اور اس نے اپنی پلکوں کی چلمن سے میری طرف دیکھا، اس کی خوبصورت، خوفناک اور کالی آنکھوں میں فتنہ انگیز شرارت اور دل لگی کی چمک تھی۔

میں نے یہ چمک دیکھی لیکن جلدی سے جواب دیا۔

''تم بھی جانتی ہو..... اور میں بھی جانتا ہوں کہ میں وہ ''عاشق'' نہیں ہوں جیسے کہ عموماً عاشق ہوتے ہیں۔ البتہ مجھے اعتراف ہے کہ میں بے تاب اور بے صبر بے شک ہوں۔''

''کیوں؟''

''اس لئے کہ۔'' میں نے نپی اور اثر انگیز آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میری..... صرف میری بن جاؤ..... پوری طرح میرے اختیار میں آجاؤ، کوئی نہ ہو ہمارے درمیان اور تمہارے سلسلے میں میری جو آرزو نہیں ہیں انہیں میں اپنے طور پر اور اپنی مرضی سے پوری کرسکوں اور کوئی مخل نہ ہو۔''

وہ خوش دلی سے ہنسی۔

''تم اقرار چاہے نہ کرو میرے سیزر لیکن تم نہیں جانتے کہ تم ایک زبردست عاشق ہی ہو۔ تمہارا وقار اور تمہاری خودداری تمہیں اقرار کرنے نہیں دیتی کہ تم میری محبت میں گرفتار ہو..... اس کے باوجود تم میری محبت میں گرفتار ہو۔ میاں مجنوں! تم میرے عاشق بلکہ دیوانے ہو۔''

میں اس کے سامنے چند ثانیوں تک بے حد سنجیدگی سے خاموش کھڑا رہا۔ پھر کہا۔

''اگر تم کہتی ہو تو بے شک ایسا ہی ہوگا۔ یہ دل اور عشق وغیرہ کے معاملات کا مجھے کوئی تجربہ نہیں ہے۔ چنانچہ میں اپنے دل میں جو کچھ محسوس کررہا ہوں..... جیسا جذبہ اس میں اسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کیا ہے..... میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ زبردست خواہش مجھے بے قرار کئے ہوئے ہے کہ جلد از جلد تمہارے مقدر کا پوری طرح سے مالک و مختار بن جاؤں۔''

اور یہ آخری الفاظ کہتے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔

میری ''پچھلی بیوی'' اور اور ''ہونے والی بیوی'' نے میری بے اختیاری حرکت نہ دیکھی۔ البتہ اس نے میرے ان معنی خیز اور خوفناک آخری الفاظ کے جواب میں اپنا نازک سر جھکا دیا۔ گویا ''سر تسلیم م ہے۔'' اور ملکوتی تبسم کے ساتھ کہا۔ ''اس سے زیادہ خوش قسمتی میری اور کیا ہوسکتی ہے؟ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے اختیار اور تمہاری مالکی میں میرا مقدر بے حد درخشاں اور خوبصورت ہی ہوگا۔''

''بالکل ایسا ہی ہوگا جس کی تم مستحق ہو۔'' میں نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔

اور پھر اپنے مزاج اور حالت کی فوری تبدیلی کے ساتھ میں نے کہا۔

''تو اب میں اجازت چاہتا ہوں کونٹس اور تمہیں خدا حافظ کہتا ہوں۔ رات زیادہ ہورہی ہے اور میری صحت مجھے زیادہ دیر تک جاگنے اور خواب گاہ سے

باہر رہنے کی اجازت نہیں دے رہی۔''

وہ اپنی کرسی پر سے اٹھی ہمدردی اور رحم دلانہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''سچ مچ ایسی ہی تکلیف ہے تمہیں؟'' وہ بولی۔

''یقین کرو تمہارا دکھ میرا دکھ ہے..... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ مناسب تیمارداری سے یہ دکھ درد دور ہوجائے گا۔ چنانچہ اگر میری وجہ سے تمہاری صحت عود کر آئی تو مجھے نہ صرف خوشی حاصل ہوگی بلکہ اس پر میں فخر بھی حاصل کرسکوں گی۔''

''بلاشک آرام اور بے فکری اور مسرتیں میرے لئے بہت کچھ کرلیں گی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تاہم! میری جان! میں تمہیں خبردار کئے دیتا ہوں کہ مجھے قبول کرکے تم ایک ٹوٹے ہوئے آدمی کو اپنا شوہر بنا رہی ہو۔ ایک ایسے آدمی کو جو من موجی ہے اور جس کے ضبط بہت سے اور عجیب وغریب ہیں اور جس کا پرانا مرض خود تمہاری زندگی اور حالات پر ایک بوجھ بن سکتا ہے۔ اس لئے.....''

''اس لئے کیا؟''

''اس لئے پوچھتا ہوں کونسس کہ تمہیں یقین ہے کہ تمہارا یہ فیصلہ مناسب ہے؟''

''مناسب ہی نہیں بلکہ صحیح بھی ہے۔'' اس نے بڑے یقین سے جواب دیا۔ ''آخر پیار کرتی ہوں میں تم سے اور پھر تم ہمیشہ تو بیمار نہیں رہو گے۔ کیونکہ ماشاء اللہ خاصے تندرست اور جسمانی طور پر طاقتور معلوم ہوتے ہو؟''

''ہاں۔ طاقتور ہوں تو ں۔ لیکن ایک حد تک۔''

میں نے جواب دیا اور لاشعوری طور پر تن کر کھڑا ہوگیا۔ ''جہاں تک میرے پٹھوں وغیرہ کا تعلق ہے تو وہ کافی مظبوط ہیں۔ البتہ میرے اعصاب وہ بڑے بے ٹھکانہ اور بے ترتیب ہیں اور میں..... ایں! کیا ہوا؟ طبیعت خراب ہوگی؟''

اس کا رنگ ایک دم سے زرد ہوگیا تھا اور آنکھیں پھیل گئی تھیں اور ان سے خوف و دہشت عیاں تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ بے ہوش ہونے جارہی ہے۔ چنانچہ اسے سنبھالنے کے لئے میں نے اپنے دونوں بازو آگے بڑھادیئے۔ لیکن اس نے جیسے چونک کر اور گھبرا کر میرے بڑھے ہوئے بازو ہٹادیئے۔

''نہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے مردہ آواز میں کہا۔ ''چکر سا آ گیا تھا ذرا..... خدا جانے کیوں..... ایک بات بتاؤ سچ مچ۔''

''پوچھو۔''

''رومانی خاندانی سے تمہارا کوئی رشتہ تو نہیں؟ دور کا ہی سہی۔''

''یہ کیوں پوچھنا پڑا؟''

''ابھی ابھی جب تم تن کر کھڑے ہوگئے تو۔ تو۔ بالکل فابیو معلوم ہورہے تھے۔ اس حد تک کہ میں نے تو سمجھا کہ فابیو کا بھوت کھڑا ہے۔ میرے اسمنے۔''

میں اسے سہارا دے کر کرسی تک لے گیا جو کھڑکی کے قریب رکھی ہوئی تھی اسے کرسی میں بٹھا کر میں نے ہوا کے لئے کھڑکی کھول دی۔ حالانکہ شام سرد و خنک تھی۔

''ایک تو تم تھک گئی ہو اور پھر کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گئی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ تم وہمی بھی ہو۔''

میں چند ثانیوں تک خاموش رہا۔ پھر بولا۔

''نہیں۔ رومانی خاندان سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ دور کا بھی نہیں، گھماؤ پھراؤ کا بھی نہیں..... البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ میرے طور طریقے یا اکثر عادتیں ایسی ہی ہوں جیسی کہ اس خاندان کے افراد میں شاید پائی جاتی ہیں اور ایسا اکثر ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے عادات واطوار کسی دوسرے خاندان کے شخص سے ملتے جلتے ہوں بلکہ دنیا میں کئی لوگ آپس میں بالکل ایک سے ہی حتیٰ کہ ہم شکل بھی ہوتے ہیں۔ تقریباً حالانکہ ان میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ خیر۔ تمہیں اس قسم کے وہموں میں مبتلا نہ ہونا چاہئے۔ اچھا اب آنکھیں بند کرکے سکون سے پڑی رہو تھوڑی دیر۔ طبیعت سنبھل جائے گی۔''

میں نے ایک گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کے اسے

دیا۔ وہ آرام کرسی میں آرام سے بیٹھ کر گھونٹ گھونٹ بلکہ چسکی چسکی پانی حلق سے اتارنے لگی اور ہم دونوں خاموشی سے کھڑکی سے باہر ماہ نومبر کی پھیلی ہوئی رات کو دیکھتے رہے۔

آسمان میں چاند نکلا ہوا تھا۔ لیکن اس بنا پنے رخ روشن پر بادلوں کی نقاب ڈال رکھی تھی لیکن کبھی کبھی جیسے کوئی غیبی ہاتھ یہ نقاب اٹھا دیتا تھا اور زرد چاند تھوڑی دیر کیلئے کسی مقتول خوبصورت کی روح کی طرح زرد اور اداس دکھائی دیئے جاتا تھا۔ بہتی ہوئی ہوا جھاڑیوں اور درختوں میں کراہ رہی تھی اور شاہ بلوط کے درخت کی ٹہنیوں اور پتوں کو سرسرا رہی تھی جو باہر لان میں تن تنہا کھڑا ہوا تھا جیسے کوئی دیوقامت کسی کے جلوس جنازہ میں شریک ہونے کے لئے سیاہ ماتمی لباس پہنے منتظر کھڑا ہوا ہو اور کبھی کبھی بادلوں بھرے آسمان سے بارش کا اکا دکا بوندیں یوں ٹپک پڑتی تھیں جیس رات کے کالے آسمان کے آنسو ہوں۔

میری بیوی ہولے سے کانپ گئی۔

''کھڑکی بند کردو سیزر۔'' اس نے کہا۔

اور بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ کیونکہ میں اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ ''اب میری طبیعت اچھی ہے۔ حماقت تھی وہ اور کیا..... لیکن خدا جانے کیا ہو گیا تھا مجھے! ایک لمحے کے لئے میں بری طرح سے ڈر گئی تھی۔''

''ڈر گئی تھیں؟ کس سے؟''

''تم سے۔''

''واہ بڑی تریف کی ہے یہ تم نے اپنے ہونے والے شوہر کی۔'' میں نے کھڑکی بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو روٹھ کر چلا جاتا۔''

وہ ہنسی۔ اس کی یہ ہنسی اعصابی مریضہ کی سی تھی۔ وہ اپنی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی سے کھیلنے لگی۔

''دیکھو اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔'' میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر واقعی تمہیں مجھ سے خوف آیا ہے تو بے شک صاف صاف کہہ دو۔ میں نہ تو برا مناؤں گا اور نہ ہی تمہیں الزام دوں گا بلکہ اسے اپنا مقدر سمجھوں گا۔''

اس پر وہ چونکی، اٹھی اور ملتجیانہ انداز میں اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''خفا ہو گئے؟'' وہ بولی۔ ''حقیقت میں میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ دراصل۔ دراصل۔ وہ میری حماقت تھی۔ وہم تھا۔ میں۔ میں۔ سمجھا ہی نہیں سکتی لیکن اب میں اچھی ہوں..... اور بہت خوش۔ سچ کہتی ہوں اگر ایک طرف ساری دنیا ہو اپنی تمام تر دلچسپیوں اور رعنائیوں کے ساتھ اور دوسری طرف صرف تمہاری محبت ہو اور مجھ سے کہا جائے کہ دونوں میں سے ایک چیز اپنے لئے پسند کرلوں تو یقین کرو سیزر، میں تمہاری محبت کا انتخاب کرلوں گی اور تمہیں قبول کرلوں گی۔''

اور اس نے پچکارنے کے سے انداز میں میرا ہاتھ اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ میں نے اپنا یہ ہاتھ آہستہ سے کھینچ لیا اور اس کے بالوں میں تقریباً پدرانہ شفقت سے انگلیاں پھیرنے لگا۔

اور پھر میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''اگر ایسا ہی ہے اور ہم دونوں کو منظور ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اب ایک بات مانو گی میری؟''

''کہو۔''

''تمہارے اعصاب کمزور ہیں اور اس وقت کچھ زیادہ ہی جھنجھنا گئے ہیں۔ چنانچہ سارے وسوسے اور اندیشے دل سے نکال پھینکو اور آج رات بھر سکون کی نیند سو رہو۔ صبح طبیعت بشاش ہوگی۔ ہاں تو تم چاہتی ہو کہ یہ بات فی الحال راز ہی میں رہے؟''

چند ثانیوں تک وہ سوچتی رہی پھر دل ہی دل میں لطف اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''فی الحال تو میرے خیال میں یہی مناسب رہے گا۔ حالانکہ۔'' اور وہ ہنسی۔

''دوسری عورتوں کو مارے حسد کے انگاروں پر لوٹتے اور میری خوش بختی پر رشک میں جلتے دیکھنے میں سچ مچ بڑا مزہ آسکتا ہے لیکن اگر ہماری اس خاموش نسبت کی خبر تمہارے یا میرے کسی دوست کو دی گئی تو تم جانو اکثر لوگ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں چنانچہ ہوسکتا ہے کہ یہ خبر

اتفاقاً جید و تک پہنچ جائے اور.....''

''سمجھ گیا۔ تم میری راز داری پر بھروسا کرسکتی ہو۔ اچھا تو شب بخیر کونٹس۔''

''ارے یہ کیا کونٹس کونٹس لگا رکھا ہے۔ نینا کیوں نہیں کہتے مجھے؟''

وہ ٹھٹک کر بولی۔

''اچھا..... تو..... نینا ہی سہی۔'' میں نے کہا اور دل پر جبر کرکے اس کے ہونٹوں کا ایک ہوائی بوسہ لیا۔

''شب بخیر میری نینا۔ خدا کرے کہ آج رات تم بس میرے ہی خواب دیکھتی رہو۔''

اس کے ہونٹوں پر ملکوتی تبسم کھل اٹھا جو آنکھوں تک پھیل گیا اور ساتھ ہی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ یہ ادا ایسی تھی کہ جو مرد نینا کو نہ جانتا ہوتا وہ اس وقت اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

میں اس سے رخصت ہوکر کمرے سے باہر نکلا تو اس نے رخصتی سلام کے طور پر اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر ہلایا اور میری ہیرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں چھوٹے سے آتشی حلقے کی طرح چمک گئی اور چھت سے لٹکتے ہوئے گلابی رنگ کی چمنیوں والے ہنڈوں کی روشنی اس کے چہرے کے حسین نقوش پر پڑی اور انہیں اور بھی حسین اور نازک بنا کر اس عورت کو یاسمین کے پھولوں کا سہانا خواب بنا دیا۔

اور جب میں گھر سے نکل کر باہر رات کے اندھیرے میں آ گیا تو آنے والے خوفناک طوفان کے خیال سے میرا دل بوجھل تھا اور نینا کا خوب صورت چہرہ اور نازک جسم میری نظروں کے سامنے آتشی سانپوں کی طرح لہرا اور بل کھا رہے تھے..... اس کے نازک ہاتھ مجھے اشاروں سے بلا رہے تھے۔ اور اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ گئے تھے۔

اپنے اذیت ناک خیالات میں گم کئی گھنٹوں تک چلتا ہی رہا۔ آخر کار طوفان بادو باراں پھٹ پڑا اور چھاجوں پانی برسنے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پر کوئی بند ٹوٹ گیا..... لیکن اس طوفانی موسم سے بے پروا میں ایک راستہ بھولے ہوئے مفرور کی طرح سنسان راستوں اور ویران گلیوں میں بھٹکتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طوفان اور اندھیرے کی اس دنیا میں صرف میں ہی ایک انسان باقی رہ گیا ہوں۔ بادو باراں کی گرج، ہوا کے شور اور میرے ننگے سر پر برستا ہوا پانی۔ یہ سب چیزیں میں نہ سن رہا تھا اور نہ محسوس کر رہا تھا۔

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ انتہائی دماغی اذیت کا دباؤ انسان کی جسمانی حسوں کو سن کر دیتا ہے اور آدمی کوئی اذیت کوئی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ اس کے حواس گم ہوتے ہیں، نظر کے آس پاس سب کچھ گم ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے بس وہی تصویریں ہوتی ہیں جو اس کا سلگتا ہوا ذہن اسے دکھاتا ہے۔

اور اس وقت میرا کچھ ایسا ہی حال تھا۔ مجھے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ حتیٰ کہ اپنے چلنے کے عمل کا بھی نہیں۔ ایک خوفناک خاموشی تھی جو میری تخلیق کردہ تھی اور مجھے ایسا لگا کہ سارے عنصیلے، طوفانی عناصر مجھے راستہ دے رہے، مجھ سے کترا رہے تھے اور پوری کائنات میں کوئی نہ تھا، سوائے میرے کچھ نہ تھا سوائے اس بھیانک اور لرزہ خیز چیز کے جس کا نام ''انتقام'' ہے۔

یکا یک میرے دماغ پر کی دھند چھٹ گئی۔ اب میں اندھے اور بہرے پن کی غفلت سے باہر آ چکا تھا۔ اب میں ہوش میں تھا اور سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے بجلی بار بار کوند رہی تھی اور بادل بار بار گرج رہے تھے اور میں نے دیکھا کہ اپنی مدہوشی یا غفلت کے عالم میں کتنی دور آ چکا تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا۔

میرے عین سامنے وہ جناتی پھاٹک تھا، اس کے پیچھے ویران اور خاموش قطعہ زم، بینا ور اس قطعہ میں سفید سفید، تابوت نما ڈھیریاں سی اور ہر ڈھیری کے سرہانے گڑے ہوئے سنگ سیل کے سفید پتھر۔ میں اچھی طرح سے اس جگہ کو جانتا تھا۔

یہ قبرستان تھا۔

قبرستان کا دروازہ بند تھا اور اس کے آہنی جنگلے

میں سے دوسری طرف میں اس تماشائی کی سی سنسنی خیز دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس کے سامنے اس اسٹیج پر سے پردہ اٹھ رہا ہو جس پر المئیے ناٹک کا آخری ایکٹ کھلا جانے والا ہو۔

آسمان پر پھر بجلی چمکیا ور گھڑی بھر کے لئے مجھے قبرستان کے انتہائی سرے پر سنگ مرمر کی ایک عمارت دکھائی دے گئی۔ یہ ہمارے خاندان کا...... روبانی خاندان کا مقبرہ تھا......

وہیں سے یہ ناٹک شروع ہوا تھا۔ ختم کہاں ہوگا؟

اور تب میری نگاہوں کے سامنے ایک دھندلی دھندلی تصویر ابھری جو رفتہ رفتہ صاف اور واضح ہوتی چلی گئی...... یہ میری بچی اسٹیلا کا چہرہ تھا...... اسٹیلا جو اب اس دنیا میں نہ رہی تھی۔ اس وقت اس کی آخری وقت کی تصویر میرے سامنے تھی۔ پرسکون اور معصوم جس پر موت کی مسکراہٹ منجمد تھی۔

اور یکا یک عجیب طرح کا جذبہ......رحم اور ترس کا جذبہ اب بھی حاوی ہوگیا۔

ہائے میری بچی کا کومل جسم اکڑ گیا ہوگا اور ہمارے مقبرے کے تہہ خانے کے کسی طاق میں نہیں بلکہ قبر میں منوں مٹی تلے ایسے طوفان بادو باراں میں پڑا ہوگا اور اس کا خاکی بستر گیلا ہوکر کیچڑ میں تبدیل ہورہا ہوگا۔

میں اسے اس گیلے اور سرد بستر سے اٹھالینا چاہتا تھا۔ اسے کسی ایسی جگہ لے جانا چاہتا تھا جہاں اجالے ہوں اور گرمی ہوئی اور ہنسی ہوتا کہ اس کے جسم میں ایک بار پھر گرمی اور حیات کی لہر دوڑ جائے اور میں اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لوں۔

اور جب میرا دماغ ان احمقانہ خیالات سے کھیل رہا تھا تو میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو میرے رخساروں پر لڑھک آرہے تھے اور سرد رخساروں پر گرم لکیریں کھینچ رہے تھے۔

ان آنسوؤں نے معجزے کا کام کیا۔ میری طبیعت ہلکی ہوئی تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے اور میرا اطمینان اور سکون آہستہ آہستہ عود آیا۔

قبرستان اور سفید سفید قبروں کو پیٹھ دے کر میں طوفان بادو باراں میں ایک بار پھر شہر کی طرف جارہا تھا اور اس دفعہ میرے قدم بڑے یقین سے اٹھ رہے تھے اور میں جانتا تھا کہ میں کہاں جارہا ہوں۔

آدھی رات گزر چکی تھی جب میں اپنے ہوٹل پہنچا۔ لیکن نیپلز میں اس دیر کو دیر سے آنا نہ کہتے تھے۔ چنانچہ ہوٹل کے فرانسیسی پہرے دار نے میرے آدھی رات کے بعد آنے پر حیرت کا اظہار نہ کیا البتہ میری ظاہری حالت دیکھ کر وہ متفکر اور پریشان ہوگیا۔

''ارے خدایا!'' وہ بولا۔ ''موسیو جیسی متاز ہستی کو ایسے طوفانی موسم میں خدا جانے کہاں سے پیدل آنا پڑا خدا معاف کرے! موسیو نے بگھی کیوں نہ بلوالی؟''

میں نے اس کے ہردم تیار ہاتھ میں پانچ فرانک تھما کر اس پڑ چلتی ہوئی زبان کے آگے روک لگادی اور اسے یقین دلادیا کہ برستے پانی اور پھنکتی ہوئی ہوا میں یوں پیدل اور بے حفاظت چلنا میرے لئے ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ چنانچہ بہت مزا آیا۔ اس پر وہ مسکرایا اور میری خوشی میں اتنا ہی خوش ہوا جتنا کہ مجھے بدحال دیکھ کر فکر مند ہوا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو میرے خادم خاص نے بھی مجھے بھیگ کر چوہا بنے اور مرے کپڑوں سے پانی ٹپکتے دیکھا، سر سے پیر تک دیکھا، اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں، سر نامعلوم طور سے ہال لیکن۔ لب سلے ہی رہے وہ فوراً اپنے کام میں لگ گیا۔ اس ین جلدی جلدی میرے بھیگے ہوئے کپڑے اتارے اس کے بجائے مجھے گرم۔ اونی گون میں لپیٹ دیا اور پرتگالی شراب کا گرجام میرے لئے لے آیا۔ اس نے ساری خدمات تندہی، خاموشی اور سنجیدگی سے انجام دیں کہ میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔

چند منٹوں بعد میں اپنی خواب گاہ کی طرف سونے کے لئے جارہا تھا تو میں نے ایک سنہری سکہ و

ونسانزو کی طرف پھینک دیا۔ چند ثانیوں بعد تک وہ اس سکے کی طرف دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

''حضور کچھ خریدنا چاہتے ہیں؟''

''تمہاری خاموشی، میرے دوست اور کچھ نہیں۔'' میں نے ہنس کر جواب دیا۔''ایک بات سمجھ لو ونسانزو کہ کچھ پوچھے بغیر میرے حکم کی تعمیل کرنے میں ہی تمہاری اور میری بہتری ہے۔ بڑا خوش قسمت ہوتا ہے وہ ملازم جو ہر رات اپنے آقا کو شراب کے نشے میں دھت دیکھتا ہے لیکن ہر صبح لوگوں سے کہتا ہے کہ ایسے بجا حواس والے، کبھی نشہ نہ کرنے والے اور ہوشیار آقا کی خدمت کا موقع اسے پہلے کبھی نہیں ملا۔ یہ ہے تمہارا کردار، یہ ہے تمہاری خصوصیت۔ سمجھے؟ قائم رکھو اسے اور ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہ ہوگا۔

وہ سنجیدگی سے مسکرایا اور مسکرا دیا سکہ شکریہ کا ایک لفظ تک کہے بغیر جیب میں رکھ لیا۔

اور اب میں اپنی خواب گاہ میں تھا، اکیلا تھا اور سونے کے لئے بستر پر ابھی لیٹا نہ تھا بلکہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے اپنا وہ کالا چشمہ اتارا جو میری ایسی زبردست خدمت انجام دے رہا تھا اور اب میں تجسس اور اشتیاق سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہا تھا اپنے خادم ونسانزو کو میں نے اپنی خواب گاہ میں رات کے وقت اور صبح اپنا لباس پہن لینے سے پہلے آنے کی سخت ممانعت کر رکھی تھی۔ مبادا وہ مجھے اس کالی عینک کے بغیر جو میرے بہروپ کا اہم ترین حصہ تھی، دیکھ لے اور پھر اس کی اس خاموشی کو جس پر مجھے اتنا اعتبار تھا، شوق تجسس دفعتاً توڑ دے۔ کیونکہ کالی عینک کے بغیر میرا راز فاش ہو جانا تھا اور میں وہی دکھائی دیتا تھا جو میں حقیقت میں تھا یعنی اپنی سفید داڑھی اور سفید بالوں کے باوجود جوان، چاق، چوبند اور چست میرا چہرہ جو مقبرے سے میرے نکلنے کے بعد۔ ستا ہوا، زرد اور مردہ سا تھا۔ اب بھر گیا تھا۔ اس پر حیات کی دمک اور سرخی تھی اور میرے خیالات کی نقیب میری آنکھیں...... تو وہ قوت ارادی، قوت جسمانی، ہمت اور عزم کی چمک سے باقاعدہ روشن تھیں۔

میں اپنا عکس آئینے میں دیکھ رہا تھا اور حیرت سے سوچ رہا تھا کہ یہ کیا بات ہوئی کہ میں بیمار اور ضعیف معلوم نہیں ہوتا! میں جس دماغی کرب اور ذہنی اذیت سے مسلسل گزر رہا تھا اس کے کچھ اثرات تو دو چار علامتیں تو میرے چہرے سے نمایاں ہوتیں۔ مثلاً آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے یا دھنسی ہوئی آنکھیں۔ چہرے کی لٹکتی ہوئی کھال، خمیدہ کمر، لڑکھڑاتی ٹانگیں، پھیکی پھیکی رنگت یا چہرے پر مردنی...... ایسی کوئی بات مجھ میں نہ تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ کرب واذیت نہیں بلکہ اپنے اوپر لادے ہوئے تفکرات اور گلے لگائے ہوئے غم ہی آدمی کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔

چنانچہ میرے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔ یعنی میں بوڑھا نہ ہوا تھا۔ مقبرے کی مختصر سی ہیبت ناک قید نے میرے بال سفید کر دیئے تھے اور بس۔

اور میں سوچنے لگا کہ اس وقت میری خواب گاہ کی تنہائی میں اگر نینا مجھے یوں ''بے نقاب'' دیکھ لے تو کیا کہے؟

اس خیال کے ساتھ ہی دماغ میں ایک دوسرا خیال ابھرا اور ایک ایسا خیال جس نے نے مجھے تلخی سے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

''میری نسبت ہو چکی ہے اور اب میری شادی ہونے والی ہے خود میری اپنی بیوی کے ساتھ...... میں دوسری دفعہ کا منگیتر ہوں۔ اسی عورت کا جس کا پہلے بھی منگیتر رہ چکا ہوں۔''

میری اس پہلی منگنی اور اس دوسری منگنی میں کس قدر فرق تھا؟ اس وقت مجھ جیسا بڑا اچغد اپنی ہونے والی بیوی کا جاں نثار اور اس کا غلام دنیا میں کوئی دوسرا نہ تھا۔

اور اس وقت مجھ جیسا عیار، اپنی ہونے والی بیوی کا بے رحم دشمن اور پتھر دل منگیتر پوری دنیا میں کوئی دوسرا نہ ہوگا۔

☆......☆......☆

میرے انتقام کی آخری منزل قریب ہی تھی۔

انتقام اپنے نکتہ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ میں آنے والے دنوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جس طرح جہاز کا کپتان دوربین کے ذریعے وسیع و عریض سمندر کی طرف دیکھتا ہے۔ میں انجام کو ایک بھوتیے جہاز کی طرح قریب آتے دیکھ رہا تھا، آہستہ آہستہ..... وہ قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ رفتار نہ زیادہ تیز تھی اور نہ زیادہ سست..... بلکہ انتقام کا یہ بھوتیا جہاز اپنی مناسب رفتار سے، ثابت قدمی اور خاموشی سے آگے بڑھ رہا تھا، منزل کی طرف قریب آرہا تھا۔

میں ہر ہونے والے واقعہ کا حساب اس کی ترتیب سے لگا سکتا تھا۔ اور میں جانتا تھا کہ ناکامی کا اندیشہ نہیں۔ مکمل ترین کامیابی یقینی ہے۔ اس کا مجھے یقین تھا خود قدرت..... چاند، سورج، ستارے اور بدلے ہوئے موسموں کا دائرہ..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب قدرت اور اس کا پورا کارخانہ حق اور انصاف قائم کرنے میں میری مدد کررہے تھے۔

آدمی کی عیاری اور اس کا فریب عارضی طور پر حقیقت پر پردہ ڈال سکتا ہے۔ لیکن آخر میں سچائی ظاہر ہوکر رہتی ہے اور اسی کی فتح ہوتی ہے۔

ایک دفعہ آدمی مصمم ارادہ کرلے اور اس پر سختی سے عمل پیرا ہوجائے تو پھر یہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ پھر ہر چیز آپ کا ساتھ دے رہی ہے۔ آپ کی مدد کررہی ہے، آپ کے لئے راستے کھول رہی ہے، بشرطیکہ آپ کے قدم نہ ڈگمگائیں، ہاتھ نہ کانپیں، کمزوری کا اظہار نہ کریں اور شش و پنج میں نہ پڑ جائیں۔

پہلے میں کمزور تھا، سخت کمزور ورنہ خود میری بیوی اور میرا دوست مجھے الو نہ بناتے لیکن اب جیسے کوئی آسیبی قوت میرے بدن میں حلول کرگئی تھی اور وہی قوت اپنا کام کررہی تھی، میری آہنی گرفت، میری فولادی مٹھی دو نالائق اور بیکار زندگیوں پر اب بند ہوچکی تھی۔ دونوں زندگیاں میرے اختیار میں تھیں۔

اور میں نے قسم کھائی تھی کہ ''کبھی آرام نہ کروں گا، کبھی رحم نہ کروں گا۔'' جب تک کہ میرا انتقام پورا نہیں ہوجاتا۔''

اور آسمان و زمین گواہ ہیں، چاند و سورج گواہ ہیں، بدلتے ہوئے موسم اور بہتی ہوائیں گواہ ہیں کہ میں اپنی قسم پر قائم رہا تھا۔ نہ تو میں چین سے بیٹھا تھا اور نہ میں نے اپنے دل میں رحم کو جگہ دی تھی۔

اور اب میرا انتقام پورا ہونے والا تھا۔

بے حد سخت اور عبرت انگیز انتقام۔

☆.....☆.....☆

موسم سرما یا وہ موسم جسے نپولین لوگ سرما کے طور پر قبول کرتے ہیں، دفعتاً نازل ہوگیا۔ پچھلے ایک عرصے سے فضا اس ٹھنڈک اور کہر یلی رطوبت سے بوجھل تھی۔ جو طبیعت پر خوامخواہ اثر انداز ہوتی اور آدمی کو کچھ بے چین رکھتی ہے اور طبیعت گھبراتی رہتی ہے اور کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا اور سستی اور کاہلی مزاج پر حاوی ہوکر آدمی کو بستر پر پڑے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ آتے اور جاتے موسم کا یہ اتصال اکثر لوگوں کے لئے بے حد آزمائشی ثابت ہوتا ہے۔

لیکن موسم کی یہ تبدیلی زندہ دلان نیپلز کے مزاجوں پر زیادہ اثر انداز نہ ہوئی..... پہلے بھی کبھی نہ ہوئی تھی اور نہ اب ہوئی۔ اب وہ معمول سے زیادہ گرم بلکہ کھولتی ہوئی کافی پینے لگے اور آدھی رات کے بعد سے صبح تک رقص گاہوں یا کیفے میں رقص کرکے اپنے جسم اور خون کو گرم رکھنے لگے۔ طاعون کی وبا جس نے نیپلز کے بے شمار گھر اجاڑ دیئے تھے۔ اور خاندان مٹا دیئے تھے ماضی کی چیز بن چکی تھی شہر کی صفائی اور وہ تمام احتیاطیں جو وبا سے بچنے کے لئے اور اس کے دوبارہ نہ پھوٹنے کے سلسلے میں نافذ کی گئی تھیں، بھلا دی گئی تھیں۔ اب نہ کسی کو شہر کی، گھر کی، اور اپنی صفائی کا خیال تھا اور نہ ہی وبا کے دوبارہ پھوٹنے کا خوف۔ زندگی ایک بار پھر پرانی ڈگر پر آگئی تھی اور ہنستے اور مزے اڑاتے ہوئے لوگ ان سینکڑوں قبروں پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے تھے جن میں ان

کے عزیز و اقارب طاعون کا شکار ہو کر جا سوئے تھے۔ طاعون کی وبا کے زمانے کو تو بہر حال تاریک کے اوراق نے محفوظ کر لیا تھا۔ چنانچہ آنے والی نسلیں اسے یاد تو کرے گی۔ لیکن ان لوگوں کو نہ اب کوئی یاد کر رہا تھا اور نہ آئندہ نسل یاد کرے گی۔ جنہیں قبروں نے اپنی آغوش میں سمالیا تھا۔

اوگی! اوگی۔'' ان ہنستے کھلکھلاتے اور داد عیش دیتے ہوئے لوگوں کا نعرہ تھا..... ''اوگی! اور۔'' یعنی ''آج! آج'' گزشتہ کل جو ہوا اس کو بھول جاؤ اور آئندہ کل کی فکر نہ کرو، جو ہوگا سو ہوگا۔ اس کو ''ای سگنوری سانتی'' اور ''لاسگنور'' میڈونا (مقدس مریم) پر چھوڑ دو۔''

لیکن ان کی اس حماقت یا نہ سمجھی میں تھوڑی سی معصومیت ضرور تھی۔ وہ یوں کہ آدمی کے سخت اور شدید مصائب اور دکھ گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنے، مستقبل کی فکر کرنے اور حال کی طرف دھیان نہ دینے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور پھر عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کا وہ تہوار ''کارنیوال'' بھی قریب آ رہا تھا۔ اس جشن میں اب پہلے جیسی رونق نہ رہی تھی۔ تاہم جلوس اب بھی پہلے ہی کی طرح نیپلز کی سڑکوں پر سے گزرتا تھا اور اس میں لوگ اسی طرح ناچتے گاتے اور عیش و عشرت اور شراب کے دیوتا ''باخوس'' کا جشن مناتے تھے۔ ''کارنیوال'' میں پہلے کی سی بات نہ تھی لیکن جشن بہر حال جشن ہی ہوتا ہے۔

اس آنے والے تہوار کی یاد دہانی مجھے 21 دسمبر کے دن کروائی گئی اور وہ اس طرح کہ اس صبح میں نے دیکھا کہ میرا خادم خاص نسانزو عجیب نظروں سے میری طرف بار بار دیکھ رہا اور اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہا اور آخر کار مسکرا اٹھا اور پھر اپنے آپ کو روک نہ سکا اور مجھ سے پوچھ بیٹھا کہ آیا میں ''کارنیوال'' میں حصہ لوں گا۔

جواب میں میں نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

ونسانزو ''پہ نم'' میں پڑ گیا اور پھر ہمت کر کے بولا۔

''حضور اجازت دیں گے.....''

''کہ تم اپنے آپ کو بیوقوف بناؤ؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''بے شک۔ اجازت ہے جاؤ۔ کارنیوال میں جتنا جی چاہے اور جب تک جی چاہے ناچو اور اچھلو کودو اور جو جی چاہے کرو۔ اس کا میں وعدہ کرتا ہوں کہ جشن میں تمہاری کے بارے میں تم سے کچھ نہ پوچھوں گا۔''

مارے خوشی اور احسان مندی کے وہ تو بچھ بچھ گیا اور پہلے سے بھی زیادہ تندہی سے میری خدمت کرنے لگا۔

جب وہ ناشتہ لگا رہا تھا تو میں نے پوچھا۔

''ہاں تو کب شروع ہو رہا ہے کارنیوال؟''

''ارے نہیں جانتے حضور!'' اس نے ایک دم حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ''چھبیس تاریخ سے۔''

''ہاں بھئی۔ جانتا ہوں۔'' میں نے بے قراری سے کہا۔ ''لیکن بھول گیا تھا۔ ایسے احمقانہ تہواروں کو یاد رکھنے کی اب میری عمر نہیں رہی۔ لاؤ۔ دیکھیں کیا آیا ہے آج کی ڈاک میں۔''

اس نے ایک چھوٹی کشتی میرے ہاتھ میں پکڑا دی جس میں مختلف سائز اور ساخت کے لفافے تھے۔ اکثر خوب صورت خواتین کے خطوط تھے جنہوں نے مجھے دعوتوں پر مدعو کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ میں شریک ہو کر ''ان کی عزت افزائی کروں۔'' پھر تاجروں کے دعوت نامے تھے۔ جنہوں نے ''میرے مبارک قدموں سے اپنی دوکانوں کو رونق بخشنے کی درخواست کی تھی۔ میں ان خطوط کو ایک طرف ڈالتا بلکہ پھینکتا گیا۔

تب میری نظر ایک ایسے لفافے پر پڑی جو خاص قسم کا اور دوسرے تمام لفافوں سے مختلف تھا۔ چوکور تھا جس کے چاروں کناروں پر گہری کالی لکیر یا بارڈر تھی اور اس پر ڈاک کا ٹھپا نمایاں تھا۔ جس پر شہر کا نام ''روما'' صاف طور سے پڑھا جا سکتا تھا۔

''آخر کار۔ آخر کار۔'' میں نے دل میں کہا۔

اور میں اپنے خادم کی طرف گھوم گیا جو میرے ناشتے کے برتنوں اور کپ اور پرچ کے کپڑے سے رگڑ کر آخری ''ٹچ'' دے رہا تھا۔

''ونسانزو! تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ ذرا سا جھکا اور پلٹ کر چل دیا۔ کمرے کا دروازہ بغیر کسی قسم کی آواز پیدا کئے کھلا اور اسی طرح خاموشی سے بند ہوگیا۔ ونسانزو جا چکا تھا۔

میں نے اس فیصلہ کن اور مقدر پر مہر لگا دینے والے خط کا لفافہ چاک کیا۔ یہ جیدو فیراری کا خط تھا۔ اس کی موت کا پروانہ جس پر خود اس نے دستخط کئے تھے۔ اس نے لکھا تھا۔

''میرے بہترین دوست!

میرے لفافے پر سیاہ بارڈر دیکھ کر آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ میں ایک خوشخبری سنانے جارہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے چچا آخر کار چل بسے اور مجھے اپنی کل دولت کا بلاشرکت غیر مالک بنا گئے۔ اب میں آزاد ہوں اور فوراً نیپلز آنے والا ہوں۔ میرا مطلب ہے چند روز ضروری قانونی کارروائی سے فرصت پانے کے بعد۔

میرا خیال ہے کہ ماہ رواں کی تئیس یا چوبیس تاریخ کو میں یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ بہر حال اپنی دواپسی کی قطعی تاریخ اور اگر ممکن ہوا تو پہنچنے کے ٹھیک ٹھیک وقت کی اطلاع آپ کو بذریعہ تار دے دوں گا۔

لیکن براہ کرام یہ اطلاع ابھی کونتس کو نہ دینا۔ انہیں میں اچنبھا دینا چاہتا ہوں۔ بچار کونتس! مجھے یقین ہے کہ میری غیر موجودگی اسے اداس اداس رکھتی ہوگی اور وہ شدت سے تنہائی محسوس کرتی ہوگی اور میں بغیر اطلاع یکا یک اس کے سامنے پہنچ کر اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے انتہا خوشی کی چمک دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے اس جذبہ کو سمجھ سکتے ہیں نا امیگو؟ یا آپ کے نزدیک یہ بھی میری حماقت ہی ہے۔

بہر حال آپ کو اپنی واپسی کی خبر اگر میں نہ دیتا تو یہ میری بدتمیزی ہوتی۔ چنانچہ آپ سے تو چھپا نہیں رہا البتہ یہ درخواست ضرور کررہا ہوں کہ کونتس کو اس کی خبر نہ کرنا۔

''کس قدر خوش ہوگی مجھے دیکھ کر وہ اور اس برس کا کارنیوال۔ ہم دونوں کے لئے کتنی بے پناہ خوشیاں لے کر آئے گا۔ اس دفعہ کا یہ تہوار ہمارے لئے سچ مچ یادگار ہوگا۔ ہم خوب ناچیں گے، گائیں گے اور لطف اٹھائیں گے۔ سچ کہتا ہوں میرے پیارے دوست کہ پہلے کبھی میں نے اپنے آپ کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس نہیں کیا۔ غالباً اس لئے کہ میری جیبیں بوجھل ہیں۔

میں خوش ہوں کہ اتنی بہت سی دولت مجھے مل گئی اور اس طرح میری حیثیت کونتس کے تقریباً برابر ہوگئی ہے اور ہر چند کہ اس کا ہر خط محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔

''اب تاہم وہ میری طرف زیادہ ہی مائل ہوگی کہ اب میں دولت مند ہوں اور اس کے زیادہ قریب پہنچ گیا ہوں۔

اب رہے آپ میرے عزیز دوست کونتے!

تو آپ کا تمام قرض ایک ایک پائی...... مع سود فوراً ادا کردوں گا اور اس کے بعد، مجھے یقین ہے، آپ کے دل میں میری عزت اور بڑھ جائے گی۔

آپ کا فرمانبردار

جیدو فیراری

ایسا تھا وہ خط جسے میں نے بار بار پڑھا۔ اس خط کے چند جملے میرے ذہن پر یوں نقش ہیں آج تک جیسے انہیں داغ دیا گیا ہو۔

''......اس کا ہر خط محبت اور ہمدردی سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔

''بے وقوف جیدو! وہ بھی اسی دھوکے میں ہے جس میں، میں تھا۔ وہ بھی اسی طرح الو بن رہا ہے جس طرح میں بنا تھا۔

(جاری ہے)

بھٹکتی روح

شہزاد خان-صادق آباد

رات کے گھٹاپ ٹوپ اندھیرے میں دو روحیں اپنے نوکیلے ناخنوں سے ٹپکتے ہوئے خون اپنی زبان سے چاٹتے ہوئے نوجوان کی طرف بڑھیں تو اچانک ایسی آواز گونجی کہ .....

ایک عجیب وغریب خونچکاں بھونچکاں حیرتناک اور تحیر انگیز لرزہ براندام کرتی کہانی

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے دو جگنوؤں کی روشنی کے علاوہ آس پاس کا علاقہ گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا، جھینگروں کے بولنے کے سے کچھ دیر کے لئے آس پاس کے ماحول میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوتا پھر یکدم خاموشی طاری ہو جاتی۔ وہ دونوں جگنو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑے ہوتے جارہے تھے اور پھر حقیقت آشکار ہوئی تو پتہ چلا کہ وہ دونوں جگنو ایک بڑی سی شکاری جیپ کی ہیڈ لائٹس تھے۔ مزید قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک شکاری جیپ تھی جس میں اس وقت دو افراد سوار تھے جن کے نام عمران اور اسد تھے وہ دونوں اپنے زور کے مانے ہوئے شکاری تھے جنہوں نے اپنے ملک کے نامور جنگلوں کے علاوہ افریقہ اور ایمزون کے جنگلات میں بھی بہت سے خون خوار اور موذی جانوروں کو شکار

کیا تھا۔ جوانی میں بہت سا وقت ان دونوں نے تقریباً اکٹھے ہی گزارہ تھا اور اب جب کہ وہ دونوں بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے لیکن اس کے باوجود اپنے شوق کی تکمیل کے لئے کچھ ایڈونچر قسم کے کام کرتے رہتے تھے۔ وہ چونکہ یونیورسٹی کے دور میں ایک ساتھ فارغ التحصیل ہوئے تھے اس لئے اپنے اس شوق کو مزید پروان چڑھانے کے لئے ان دونوں نے شکاریات کے موضوع کو اپنے شوق کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم سے بھی منسلک کرلیا تھا اور اس غرض سے ان دونوں نے آئرلینڈ سے شکاریات میں ماسٹر ڈگری حاصل کرلی تھی۔

شکاریات کے شوق کی وجہ سے وہ دونوں غیر ملکی تعلیمی ادارے میں بھی نمایاں رہے تھے اور سب ان کی قابلیت کی تعریفیں کرچکے تھے۔

آج بھی اپنے اسی شوق کی وجہ سے وہ اس علاقے میں وارد ہوئے تھے انہیں اس علاقے کے بارے میں بہت سے لوگوں سے معلومات ملی تھیں کہ اس علاقے میں کچھ عرصے سے ایک بھٹکتی روح کا راج ہے جو رات کے اندھیرے میں ہر آنے جانے والے مسافر اور مقامی لوگوں کو خوفزدہ کرتی تھی۔

اس سلسلے میں ان دونوں نے کچھ ایسے لوگوں سے بھی معلومات لیں تھیں جو اس روح کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

وہ دونوں اپنی زندگی میں بہت سے خون خوار جانوروں کا شکار کھیل چکے تھے لیکن اس بار انہوں نے ایک روح کو اپنا شکار کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ چونکہ شروع سے ہی بہت نڈر رہے تھے اور بہت سے ایسے نامساعد حالات سے بھی گزر چکے تھے کہ جب ایک انسان سرے سے ہی ہمت ہار بیٹھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس وقت بھی زندہ سلامت تھے اور ان دونوں کی ہمت بھی ابھی تک جوان تھی۔

اس علاقے کو "ولہار" کے نام سے پہچانا جاتا تھا یہاں کے مکین تقریباً اس روح کے خوف کی وجہ سے آس پاس کا علاقہ چھوڑ کر کہیں اور جا بسے تھے ظاہر ہیں ان لوگوں کو اپنی زندگیاں پیاری تھیں اور وہ اس روح کی وجہ سے خود کو کسی پریشانی میں نہیں ڈال سکتے تھے۔

لوگوں کے جانے کی وجہ سے جو تھوڑی بہت رونق اس علاقے میں رہتی تھی وہ بھی یکسر ختم ہوکر رہ گئی اور پھر آہستہ آہستہ لوگوں نے اس راستے کو استعمال کرنا کم کردیا لیکن ابھی بھی کبھی کبھار کوئی مسافر بھولے بھٹکے سے جب اس راستے سے گزرتا تو ایک دو بار تو اسے وہ روح ضرور دکھائی دے جاتی اور وہ بیچارہ خوف سے چیختا چلاتا وہاں سے بھاگ نکلتا اور اس ساری کارروائی میں اس کا ساز و سامان بھی وہیں دھرا رہ جاتا اس طرح بہت سے لوگ اپنے قیمتی سامان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے لیکن کبھی ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی چور اچکا ان لوگوں کے چھوڑے ہوئے سامان کو اٹھانے کے لئے اس طرف جانے کی ہمت کرسکا ہو۔

☆.....☆.....☆

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہوچکا تھا جیپ بڑی تیزی سے اس علاقے کی جانب بڑھتی جارہی تھی جہاں اس روح کی موجودگی کا اظہار کیا گیا تھا جیپ عمران چلا رہا تھا اور اسد ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہاتھ میں کولڈ ڈرنک کا ٹن پیک تھامے پینے میں مصروف تھا سفر سے پہلے انہوں نے راستے سے ایک پیٹرول پمپ سے جیپ کا ٹینک فل کروانے کے ساتھ ساتھ وہیں موجود ایک ٹک شاپ سے ریفریشمنٹ کا کچھ ساز و سامان بھی خرید لیا تھا اور اس وقت اسی سامان سے لطف اندوز ہونے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہورہی تھی۔

ظاہر اس جنگل میں انہیں کونسا کوئی ہوٹل ملنا تھا جہاں سے وہ اپنے پیٹ کی آگ بجھا سکتے تھے۔ سفر کے ساتھ ساتھ وہ دونوں آپس میں مختلف موضوعات پر بات چیت بھی کررہے تھے اور ان دونوں کی گفتگو سے یہ اندازہ ہورہا تھا کہ انہیں وقت کی نزاکت کا قطعی اندازہ نہیں ہے کہ وہ اس وقت کسی پکنک پوائنٹ پر نہیں بلکہ

ایک سنسان علاقے میں ایک غیر مرئی مخلوق کو قابو کرنے کے لئے جارہے ہیں۔

پہلے تو انہیں لوگوں سے سنی سنائی باتوں پر بالکل یقین نہیں آیا تھا لیکن جب بہت سے لوگوں نے حلفاً انہیں یقین دلایا کہ انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے اس روح کو دیکھا ہے تو پھر انہیں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں پر یقین کرنا پڑا لیکن اس ساری حقیقت کو مزید جاننے کے لئے وہ دونوں اس وقت اس علاقے کی جانب تیزی سے بڑھتے جارہے تھے۔ اپنے یقین کو تقویت دینے کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے پکا ارادہ کرلیا تھا کہ اگر ایسی کسی روح کا وہاں کوئی وجود ہوا تو وہ اپنی بھرپور کوششوں اور تجربے سے اس علاقے کو اس روح سے نجات دلا کر ہی رہیں گے۔

موسم میں کسی قدر خنکی ہوگئی تھی اور گرمیوں کی چونکہ ابھی آمد آمد تھی اس لئے ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ جیپ کی کھڑکیوں کے تمام شیشے کھلے ہوئے تھے جن سے ہوا کے جھونکے اندر داخل ہوتے تو ایک خوشگوار احساس ہوتا تھا۔ ایک پکی سڑک سے اتر کر اب جیپ ایک کچے راستے کی جانب بڑھ چکی تھی یہ تقریباً دس فٹ چوڑا ٹیڑھا میڑھا کچا راستہ تھا جس کے دونوں طرف کھیت تھے لیکن وہاں کوئی فصل نہیں تھی غالباً وہاں کے کسان اس روح کی خوف کی وجہ سے اپنی زمینیں بھی چھوڑ کر جاچکے تھے۔

دور بہت دور درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا اور رات کے اندھیرے میں یوں لگ رہا تھا جیسے بہت سے دیو سر جوڑے آپس میں سرگوشیاں کررہے ہوں۔

غیر ہموار راستے کی وجہ سے جیپ ہلکولے لیتی آگے بڑھتی جارہی تھی عمران نے اس کی رفتار کم کردی تھی کیونکہ جیپ کے الٹ جانے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ کہیں کہیں زمین میں گڑھے بھی تھے اس لئے بہت احتیاط سے انہیں ڈرائیونگ کرنی پڑ رہی تھی۔ جیپ میں اس وقت اٹھانے پینے کے سامان کے علاوہ ڈبل بور کی گنیں اور بہت سے کارتوس اور تھری نٹ تھری کی گولیاں بھی کافی مقدار میں موجود تھیں۔ چند ایک سپیشل گنیں بھی انہوں نے اپنے ساتھ رکھ لی تھیں جو وہ پہلے ایمزون کے جنگلات میں لے کر جاچکے تھے۔

ان دونوں کے چہروں پر ذرا برابر بھی کوئی خوف یا پریشانی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ حقیقت میں وہ دونوں بہت بہادر شکاری رہے ہونگے۔ ورنہ جس علاقے میں کوئی انسان دن کی روشنی میں آنا پسند نہیں کرتا تھا وہ دونوں رات کے اس سناٹے میں اس علاقے میں موجود تھے۔

☆.....☆.....☆

جیپ تیزی سے آگے بڑھتی جارہی تھی کہ اچانک بریک لگنے سے الٹتے الٹتے بچی اگر عمران ایک ماہر ڈرائیور نہ ہوتا تو شاید اب تک جیپ کے ساتھ ساتھ ان کی ہڈیاں بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی ہوتیں۔ عمران نے مضبوطی سے جیپ کے اسٹیئرنگ کو تھامتے ہوئے اسے سامنے نظر آنے والے گڑھے سے بچاتے ہوئے ایک سائیڈ پر کھڑا کردیا۔ ہوش سنبھلتے ہی وہ دونوں بڑی حیرت سے سامنے نظر آنے والے منظر کو دیکھ رہے تھے۔

جیپ کی روشنی میں سامنے سفید لبادے میں ملبوس ایک روح کھڑی صاف دکھائی دے رہی تھی اس روح کے ہاتھوں کے نوکیلے ناخنوں سے سرخ سرخ تازہ خون ٹپک رہا تھا جسے وہ اپنی لمبی زبان سے چاٹنے میں مصروف تھی لیکن اس کے چہرے کا رخ جیپ کی طرف ہی تھا۔

رات کے اس سناٹے میں ایک خوفناک اور سنسان راستے پر ایک خوفناک منظر دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ لیکن وہ چونکہ اپنے دور کے ایک ماہر شکاری تھے اس لئے خوفزدہ ہونے کی بجائے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کافی فاصلے پر ہونے کی بناء پر اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ لمحات تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد جیسے انہیں اچانک

ہوش آگیا ہو اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسد نے جلدی سے ایک لوڈڈ گن اٹھا کر نشانہ لیتے ہوئے اس پر گولی داغ دی۔

خاموش فضا ایک دھماکے سے گونج اٹھی اور گولی سیدھی اس عفریت کی جانب بڑھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گولی کا نشانہ بنتی وہ اس کی دھماکے دار آواز کو سنتے ہی جیسے ایک جانب غائب ہوگئی۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اس لئے انہیں سامنے کا منظر بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔اس کے غائب ہوتے ہی وہ دونوں جلدی سے جیپ سے نیچے اترے اور ایک دوسرے کی پیٹھ آپس میں ملا کر آگے بڑھنے لگے ان دونوں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں وہ بڑی احتیاط سے اپنے آگے پیچھے کا خیال کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔اب انہیں لوگوں کی باتوں کا مکمل یقین ہوگیا تھا۔

اس روح کی موجودگی ان کی باتوں کی سچائی کی گواہی بن چکی تھی۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں نے یہ پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ وہ اس علاقے کے لوگوں کو اس عفریت سے نجات ضرور دلائیں گے اور لوگوں کا کھویا ہوا چین اور سکون واپس لوٹائیں گے۔

☆.....☆.....☆

گولی کی دھماکے دار آواز سنتے ہی وہ روح لپک کر ایک جانب کودی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے غائب ہوگئی۔یہ سب کچھ پل بھر میں ہوا اور چند ہی منٹوں میں وہاں اس کا وجود تک نہ تھا۔

وہ دونوں محتاط انداز میں ہاتھوں میں گنیں تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جارہے تھے۔رات کا سوا ایک بج رہا تھا اور ریڈیم ڈائل والی گھڑیوں پر ریڈیم اندھیرے میں چمک رہا تھا۔چونکہ انہیں کئی بار بہت سی ایسی جگہوں پر جانا پڑا جہاں ٹارچ روشن کرنے سے جان کا خطرہ درپیش تھا اس لئے انہوں نے وقت سے باخبر رہنے کے لئے ایسی گھڑیاں خریدی تھیں جو ایسے حالات میں ان کی ضرورت پوری کرسکیں۔

کچھ دیر تک ادھر ادھر دیکھنے اور اس روح کی تلاش میں بھٹکنے کے بعد جب ان کو کوئی ذی روح آس پاس دکھائی نہ دی تو انہوں نے وہیں رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔وہ دونوں چونکہ منجھے ہوئے شکاری تھے اس لئے اپنے ساتھ ضرورت کی ہر چیز رکھتے تھے۔

خیمہ نصب کرنے میں انہیں زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی وہ سینکڑوں مرتبہ ایسے حالات سے گزر چکے تھے اور اب اس طرح کے کام انہیں قطعی مشکل نہیں لگتے تھے۔خیمہ انہوں نے درختوں کے جھنڈ سے ذرا ہٹ کر ایک ایسی صاف ستھری جگہ پر لگایا تھا جہاں سے وہ دونوں طرف یعنی سڑک اور جھنڈ کی طرف نظریں جما سکیں۔خیمہ کے پیچھے والی سائیڈ پر دیکھنے پر دور دور تک چٹیل میدان پھیلا ہوا تھا اس لئے انہوں نے اپنا زیادہ فوکس انہی دونوں سائیڈوں پر ہی رکھا تھا۔

جب وہ یہاں پہنچے تھے اس وقت فضا پر ایک خاموشی طاری تھی لیکن اب ہلکی ہلکی دل کو لبھانے والی ہوا چلنے لگی تھی۔ہوا کی سرسراہٹ سے سامنے موجود درختوں سے عجیب وغریب سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔خیمہ میں بستر وغیرہ ترتیب سے رکھنے کے بعد انہوں نے کولڈ ڈرنک کے ٹن پیک بیگ سے نکالے اور پینے کے ساتھ ساتھ اسی روح کے بھاگ جانے کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ان کی باتوں سے قطعی ان کے کسی خوف کا اظہار نہ ہو رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے کوئی روح کی بجائے کوئی جنگلی جانور دیکھ لیا ہو جو وہ کئی بار دیکھ چکے تھے۔کھانا چونکہ وہ شہر سے کھا کر ہی آئے تھے اس لئے انہیں بھوک نہیں تھی لیکن ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں کی وجہ سے ان دونوں پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ دونوں پیر پسارے خیمہ میں لیٹے خواب خرگوش کے مزے لینے لگے کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند تو کانٹوں پر بھی آجاتی ہے۔

لیکن شاید وہ دونوں اپنے انجام سے بے خبر تھے۔ان دونوں کے وہم وگمان میں نہیں تھا کہ آنے والے حالات ان کے لئے کس قدر مصیبت زدہ ثابت ہوسکتے

ہیں کہ انہیں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے راہ فرار اختیار کرنی پڑے گی۔

رات آہستہ آہستہ نیچے گاڑے اپنا سفر طے کررہی تھی اور خیمہ میں سے ان دونوں کے خراٹوں کی آوازیں مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ ابھی انہیں لیٹے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک درختوں کے جھنڈ سے ایک انتہائی دل ہلا دینے والی چیخ سنائی دی۔

چیخ کی بازگشت اتنی شدید تھی کہ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے یکدم گھبرا کر اڑے اور اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے فضا میں تحلیل ہوگئے۔

چیخ اس قدر خوفناک تھی کہ وہ دونوں بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جلدی سے اپنے ہوش سنبھالتے ہوئے پاس پڑی گنوں کو اٹھا کر خیمہ سے باہر نکل گئے۔ سامنے درختوں میں باقی بچ جانے والے پرندوں نے ایک شور بپا کئے ہوئے تھا۔ انہوں نے بھی یہ دیکھ کر اپنی اپنی گنوں سے ایک ایک گولی جھنڈ کی طرف داغ دی۔ گولی کی اپنی آواز پیدا ہوئی اور جھنڈ میں شور مزید بڑھ گیا۔ پھر یوں یکدم خاموشی چھا گئی جیسے کسی نادیدہ قوت نے سب پرندوں کے گلے اپنے ہاتھ کی مٹھی میں دبوچ لئے ہوں اور وہ سب اپنی کوشش کے باوجود اپنے گلوں سے اپنی آوازیں نہ نکال پا رہے ہوں۔

خاموشی اس قدر طاری ہوگئی تھی کہ جیسے اگر زمین پر کوئی سوئی بھی گرتی تو شاید اس کے گرنے کی آواز بھی وہ دونوں بخوبی سن سکتے تھے۔ کچھ دیر تک اسی حالت میں ٹھہرنے کے بعد ان دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی فیصلہ کیا اور آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔ جھنڈ پر ایک منحوسیت طاری تھی اور سبز درخت رات کے گھمبیر اندھیرے میں سیاہ دکھائی دے رہے تھے اور پھر جس طرح کے حالات پیش آئے تھے اور آرہے تھے ان کی وجہ سے انہیں بہت محتاط ہو کر رہنا پڑ رہا تھا۔

جیسے جیسے وہ جھنڈ کے نزدیک ہوتے جارہے تھے انہیں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ان درختوں کے اندر سے بہت سی سرخ سرخ آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہوں لیکن بغور دیکھنے کے باوجود انہیں ایسا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں چوکنے انداز میں آگے بڑھتے جارہے تھے۔ گنوں کا رخ انہوں نے سامنے کے رخ کر رکھا تھا کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ رونما ہونے کی صورت میں وہ فوری اپنا بچاؤ کر سکیں۔ جھنڈ اور ان کا فاصلہ بالترتیب کم سے کم ہوتا جارہا تھا۔

اور پھر اچانک جیسے ایک بھونچال آگیا ہو اور جیسے کوئی ایٹم بم پھٹ پڑا ہو، ایک زوردار دھماکے کی آواز سے کوئی سفید رنگ کی چیز درختوں کے جھنڈ سے نکل کر سیدھی ان کی جانب تیر کی مانند لپکی۔

وہ دونوں ابھی اس خوفناک آواز کے زیر اثر ہی تھے کہ یہ اس اچانک نئی افتاد کو دیکھ کر ذرا گھبرا گئے اور تیزی سے ایک جانب گرتے گرتے بچے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ یوں اچانک کوئی آفت اس جھنڈ سے نکل کر ان کی جانب لپکے گی۔ لیکن گرتے گرتے وہ دونوں سنبھل گئے اور ہاتھ میں پکڑی گنیں انہوں نے زمین پر نہیں گرنے دی تھیں اس لئے جلدی سے اپنی گنوں کو سیدھا کر کے اس سفید چیز پر گولیاں داغیں لیکن اس عرصے میں وہ عفریت غائب ہو چکی تھی۔

ایک بار پھر وہ انہیں چکمہ دینے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن باوجود کوشش کے وہ دونوں اس عفریت کے وجود کو مکمل طور پر نہیں دیکھ پائے تھے کہ اس کی مادیت کیا ہے؟ لیکن وہ یہ ضرور سمجھ چکے تھے کہ ان کا واسطہ ایک شیطانی روح سے پڑ چکا ہے اب یا تو وہ اسے ختم کر کے اس علاقے کے مکینوں کو اس سے نجات دلائیں یا خود عفریت کا شکار ہو جائیں۔

خیمے میں ایک ایمرجنسی لائٹ انہوں نے پہلے سے ہی روشن کر رکھی تھی جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ اٹھا کر باہر لے آئے اور اس کی روشنی میں کافی دیر تک ادھر ادھر دیکھنے کے باوجود بھی انہیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جس سے اس روح کے

وجود کا اندازہ ہو سکے، تھک ہار کر وہ دونوں دوبارہ خیمے میں گھس گئے۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اس وقت چار افراد سیاہ لباسوں میں ملبوس موجود تھے اور ٹکٹکی باندھے کمرے کے اکلوتے دروازے کو یوں دیکھ رہے تھے کہ جیسے ان کا اس دنیا میں آنے کا واحد مقصد یہی رہا ہو، کمرے میں ایک گھمبیر خاموشی چھائی ہوئی تھی چہرے مہرے سے وہ سب ڈاکو لگ رہے تھے اور کمرہ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری تھا۔ ایک جانب چند بندوقوں کا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا جن کے پاس مختلف قسم کے کارتوس بھی ایک ڈھیر کی صورت میں موجود تھے۔ ظاہر ہے ڈاکوؤں کے پاس اسلحے کی بجائے ٹافیاں تو ہو نہیں سکتی تھیں۔ وہ خاموشی سے یوں بیٹھے دروازے کو تک رہے تھے جیسے وہ سب کے سب چابی والے کھلونے ہوں۔

ابھی انہیں اسی حالت میں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک اس اکلوتے دروازے سے ایک لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا جس کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کا لباس تھا اور اس پر اس نے سیاہ واسکوٹ پہنی ہوئی تھی لیکن چہرے سے وہ انتہائی ظالم اور بدصورت شخص لگ رہا تھا اس کے دائیں گال پر چاقو کا ایک گہرا نشان تھا اور بائیں گال کے درمیان ایک روپے کے سکے کے برابر سیاہ تل تھا جس پر بہت سے بال صاف دکھائی دے رہے تھے انتہائی منحوس اور ناپسندیدہ شخصیت والا انسان تھا یہ ان ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا۔ اس نے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی پوچھا۔ "ہاں بخشو کیا خبر لائے ہو"؟

"سردار اس وقت وہ ہماری بھیجی ہوئی روح کو تلاش کرنے میں ناکام ہونے کے بعد دوبارہ خیمے میں گھس گئے ہیں"

"اس کا مطلب ہے کہ ان دونوں کو ہمارا ڈولبی سسٹم بھی بھگانے میں ناکام رہا"؟ اس خوفناک چہرے والے شخص نے اس کی بات سن کر جواب دیا۔

"جی سردار" بخشو نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔..... "دیکھو ہمیں بہت ہوشیاری سے صرف اور صرف روح والا پتا ہی استعمال کرنا ہوگا ورنہ ہم چاہتے تو انہیں گولیوں سے بھون سکتے تھے لیکن اس سے یہاں کے مکین فوراً سمجھ جاتے کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے اور یہاں پولیس کا سرچ آپریشن بھی شروع ہو سکتا تھا۔ اس لئے روح سے خوفزدہ ہونے کی وجہ لوگ تو کیا یہاں کی پولیس بھی اس طرف کا رخ کرنے سے گھبراتی ہے۔" سردار نے جواب میں پوری تقریر کرتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے ہدایات دیں۔

"جی سردار آپ درست کہہ رہے ہیں ورنہ اب تک تو ہمارا دھندہ چوپٹ ہو چکا ہوتا اور ہم سب حوالات کی ہوا کھا رہے ہوتے"۔ ان سب نے یک زبان ہو کر کہا..... "لیکن یہ دونوں بہت ڈھیٹ قسم کے انسان ہیں جو ہمارے ڈولبی سسٹم سے پیدا کی گئیں خوفناک آوازوں کے باوجود ابھی تک وہیں براجمان ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بار ہمارا واسطہ عام قسم کے انسانوں سے نہیں ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ دونوں بہت بہادر اور ہمت والے لوگ ہیں اس لئے ہمیں انتہائی محتاط ہو کر انہیں یہاں سے چلتا کرنا ہوگا ورنہ یہ ہمارے حق میں بہت برا ثابت ہو سکتا ہے"۔

سردار نے جواباً کہا..... "سردار جس طرح یہ لوگ خیمہ اور دیگر ساز و سامان جو جیپ میں لیکر آئے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ یہ لوگ کافی دنوں تک یہیں ڈیرہ جمانے کا ارادہ رکھتے ہیں.....؟ ایک دائیں طرف بیٹھے ہوئے پتلے دبلے شخص نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اس کا یہ انداز بڑا مضحکہ خیز لگا اس پر یہ کہاوت فٹ بیٹھتی تھی کہ چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔"

تم ٹھیک کہتے ہو رحیموان کے تیور تو یہی بتا رہے ہیں"۔ سردار نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ پھر سردار نے انہیں کچھ ضروری ہدایات دیں جنہیں وہ سب توجہ سے سنتے رہے اور پھر آئندہ کا لائحہ عمل طے

کرنے کے بعد سردار دوبارہ اس اکلوتے دروازے کی جانب بڑھ گیا اور کمرے میں صرف وہی افراد موجود رہ گئے اور سردار کے چلے جانے کے بعد وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور آپس میں باہمی مشورہ کرنے لگے۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ سب بھی اٹھ کر اس کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کا سپیدہ نمودار ہوتے ہی وہ دونوں ضروری حاجات سے فراغت حاصل کرتے ہی ناشتہ کرنے کے بعد رات والے واقعہ پر تبصرہ کرنے لگے لیکن کافی دیر تک مغزماری کرنے کے باوجود بھی انہیں کوئی سر پیر نظر نہ آیا اور تھک ہار کر ان دونوں نے سامنے نظر دکھائی دینے والے درختوں کے جھنڈ کے اندر جا کر جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور پھر اپنی اپنی بندوقوں کو ہاتھوں میں تھامے وہ محتاط انداز میں اس جھنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔ درختوں کی بہتات اور گھنے پن کی وجہ سے سورج کی روشنی شاید زمین تک نہ پہنچتی ہوگی لیکن ابھی چونکہ سورج پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا لیکن آس پاس کا علاقہ صاف دکھائی دے رہا تھا انہوں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا تھا اس لئے اپنی ضروریات سے فارغ ہوتے ہی انہوں نے اس جھنڈ میں داخل ہو کر وہاں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

جیسے جیسے وہ ان درختوں کی جانب بڑھتے جا رہے تھے انہیں درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کا شور بھی واضح سنائی دیتا جا رہا تھا۔ ان کی سوچ کے مطابق جھنڈ میں اندھیرا ہی پھیلا ہوا تھا لیکن راستہ تقریباً واضح ہی تھا۔ وہ دونوں بڑے محتاط انداز میں اندر داخل ہو گئے۔ درختوں پر بیٹھے پرندے شاید ان دونوں کو دیکھ کر چپ ہو گئے تھے اس لئے ایک دم ایک گھمبیر خاموشی چھا گئی تھی چلتے چلتے وہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ کر رک گئے جہاں تقریباً درختوں کی تعداد بہت کم تھی اور اب اس جگہ آسمان سے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی زمین پر پڑ رہی تھی۔ وہ چونکہ اپنے دور کے منجھے ہوئے شکاری رہ چکے تھے اس لئے اپنی تیز نظروں سے اپنے اردگرد کا جائزہ بڑی باریک بینی سے لے رہے تھے ان کی نظریں درختوں پر تھیں۔

اور پھر اچانک انہیں اپنے مطلب کی چیز نظر آ ہی گئی اور ایک جانب درختوں کے اندر انہیں اسپیکرز نصب ہوئے نظر آ گئے۔ عام آدمی کی نظروں سے تو شاید یہ اسپیکر چھپے ہی رہتے لیکن وہ دونوں انہیں تلاش کر لینے میں کامیاب ہو ہی گئے تھے اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سر ہلائے اب ساری بات ان دونوں کی سمجھ میں آ چکی تھی۔

رات کو درختوں کی جانب سے آنے والی بھیانک آوازوں کا راز ان کی سمجھ میں آ چکا تھا اب مزید وقت تلاش بے معنی تھی اور وہ دونوں واپس خیمے کی جانب لوٹنے لگے۔ خیمے میں واپس آ کر ان دونوں نے آپس میں کچھ بات چیت کی اور پھر رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد ان دونوں نے کچھ دیر آرام کرنے کا سوچا اور پھر ایک جانب بچھے بستر پر لیٹ گئے اور کچھ ہی دیر بعد خیمے میں ان کے خراٹے گونجنے لگے۔

☆.....☆.....☆

جانے کب تک وہ دونوں یوں ہی نیند کی وادیوں میں کھوئے رہتے کہ اچانک ایک بھیانک اور خوفناک آواز نے ان دونوں کو بیدار ہونے پر مجبور کر دیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ آواز کی سمت ان درختوں کے جھنڈ کی طرف ہی تھی لیکن اس بار ان دونوں نے کسی خوف کے بغیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں سر ہلائے لیکن باہر خیمے سے نکلنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ آوازیں انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے پیدا کی جا رہی ہیں تاکہ وہ دونوں یہاں سے بھاگ جائیں۔ ان سب وجوہات کی وجہ انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ یہاں ضرور کوئی غیر قانونی سرگرمیاں سرانجام دی جا رہی ہیں اور اس وجہ سے یہاں

کی مکینوں کو یہاں سے دور رہنے کے لئے اس طرح کے واقعات پیدا کیے جارہے ہیں اور اب تو انہیں یہ بھی سمجھ آ گئی تھی کہ وہ بھٹکتی روح کوئی اصلی روح نہیں بلکہ ان جرائم پیشہ افراد کی تخلیق کردہ کوئی فرضی روح ہے جو وہاں کے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ڈرامائی تشکیل دی گئی ہے۔

☆.....☆.....☆

یہ رات کا تقریباً ایک بجے کا وقت ہوگا جب چار افراد سیاہ لباسوں میں ملبوس بڑی خاموشی سے جھنڈ کی جانب بڑھتے جارہے تھے۔ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے دو اسپیکرز بھی تھے اور ایک مائیک بھی ایک تار کے ساتھ لٹک رہا تھا یہ وہی ڈاکو تھے جنہوں نے کل اپنی آماجگاہ میں ان دونوں کی آمد کی اطلاع اپنے سرغنہ کو دی تھی یہ جرائم پیشہ لوگ تھے جو کچھ عرصے سے اس علاقے میں منشیات کی سپلائی کا کام کررہے تھے اپنے مذموم کام کو چھپانے کی غرض سے ان لوگوں نے اس فرضی روح کا سہارا لیا تھا اور اس ڈولبی سسٹم کے تحت یہاں کے مکینوں کو بھگانے میں کامیاب ہوگئے تھے اور لوگوں کو جب انہوں نے فرضی گیٹ اپ کیے ہوئے اپنے ایک ساتھی کو روح کے بھیانک روپ میں پیش کیا تو وہاں کی مقامی پولیس بھی اس طرف کا رخ کرنے سے کتراتی تھی اور ان لوگوں کا دھندہ بہت اچھا چل رہا تھا لیکن پھر اچانک ان دونوں کے آنے سے انہیں اپنا دھندہ چوپٹ ہوتا نظر آیا۔ان میں سے دو ساتھی شہر میں بھیس بدل کر ان دونوں کے متعلق معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے اور انہیں اس بات کی بہت تشویش تھی کہ جو کچھ انہوں نے ان دونوں کے متعلق سنا تھا انہیں اپنا دھندہ چوپٹ ہوتا نظر آرہا تھا لیکن انہوں نے ان دونوں پر بھی اپنا پرانا داؤ آزمانے کی کوشش کرتے ہوئے آج پوری تیاری سے اس جھنڈ میں داخل ہوگئے تھے۔ کچھ دیر اپنی کارروائی میں مصروف رہنے کے بعد انہوں نے وہ سسٹم وہاں نصب کردیا چونکہ وہاں پہلے سے ہی وائرنگ کا انتظام تھا صرف یہ لوگ اپنے ساتھ مائیک اور اسپیکرز ہی لیکر آئے تھے اس لئے تھوڑی ہی دیر میں وہ اس سسٹم کو بحال کرچکے تھے اور پھر ایک بٹن دباتے ہی جیسے اسپیکرز میں جان پڑگئی اور خوفناک آوازوں کا ایک طوفان برپا ہوگیا اس کے ساتھ ساتھ ایک ڈاکو مائیک کے ذریعے اپنے منہ سے کچھ عجیب وغریب آوازیں بھی نکالتا جارہا تھا جیسے کوئی بھیانک شخص انتہائی تکلیف میں کراہ رہا ہو۔یہ سسٹم چونکہ ان کا اپنا بنایا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود اسپیکرز میں سے نکلنے والی آوازیں انہیں بھی خوفزدہ کردے رہی تھیں۔کچھ دیر تک وقفے وقفے سے یہ آوازیں سنانے کے بعد انہوں نے دوبارہ اسپیکرز اور مائیک واپس اٹھایا اور واپس ایک طرف تنگ سے راستے کی جانب بڑھتے چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

صبح کا اجالا پھیلتے ہی وہ دونوں خیمے سے نکلے اور ضروریات سے فراغت حاصل کرتے ہی ہاتھ منہ دھوکر ٹن پیک سے ناشتہ کا سامان نکالا اور سکون سے ناشتہ کرنے لگے۔ جیپ میں انہوں نے اپنے ساتھ ایک بڑی سی پلاسٹک کی بوتل میں بہت سا پانی رکھا ہوا تھا جو وہ اپنے ساتھ لانا نہیں بھولے تھے۔اور اب اسی پانی کی وجہ سے انہیں بہت سہولت ہوگئی تھی۔ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے واپسی کی ٹھانی اور خیمہ اکھاڑ کر دوبارہ جیپ کے اندر موجود ایک خفیہ خانے میں ترتیب سے رکھا اور اپنا باقی سامان اٹھا کر اسے بھی جیپ میں رکھ دیا۔اور اس بار ڈرائیونگ سیٹ پر اسد تھا اس نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے آگے بڑھادیا۔جیپ دوبارہ کچے پکے راستے پر دوڑنے لگی۔اس ساری کاروائی میں سورج نمودار ہوچکا تھا اور ہر طرف چمکیلی دھوپ پھیل چکی تھی۔انہوں نے جلد از جلد شہر پہنچ کر پولیس کو اطلاع دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور یہی سوچ کر وہ تیزی سے شہر کی جانب بڑھتے جارہے تھے۔

تقریباً آدھا گھنٹہ تک مسلسل سفر کرنے کے بعد ... جیپ شہر میں داخل ہوگئی اور سیدھی ایک پولیس ... کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ وہ دونوں تیزی سے ... کر پولیس اسٹیشن میں داخل ہوگئے اور کچھ ہی دیر ... دوبارہ باہر نکلے تو ان کے ساتھ پولیس کی ... نفری اور تھانے کا ایس ایچ او بھی اپنی پتلون کستا ... ایا۔ انسپکٹر اور دیگر پولیس کے افراد ایک ... وبائل میں سوار ہوچکے تھے اور پھر ان کی ... آگے بڑھتے ہی وہ دونوں بھی تیزی سے جیپ ... وار ہوکر ان کے پیچھے آگے بڑھے۔ دونوں ... ں تیزی سے شہر سے باہر جانے والے راستے کی ... بھاگتی چلی جارہی تھیں اور تقریباً پونے گھنٹے کے ... جھنڈ کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پولیس کے افراد ... پوزیشن سنبھالتے ہوئے بندوقیں تان رکھی تھیں وہ ... پوکنا تھے۔

☆......☆......☆

ایک بڑے سے ہال میں اس وقت تقریباً ... افراد ایک دائرے کی صورت میں ٹکٹکی باندھے ... نظر آنے والے دروازے کو یوں دیکھنے میں محو ... جیسے انہیں رکھا ہی گیا ہو اسی کام کے لئے۔ ان ... نے سیاہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھے اور سروں ... پٹیاں باندھی ہوئی تھیں۔ ان سب میں سے کچھ ... چہروں پر پرانے زخموں کے نشان صاف ... دے رہے تھے جن کی وجہ سے ان کے چہرے ... بھیانک منظر پیش کررہے تھے یہ سب وہی جرائم پیشہ ... تھے جنہوں نے یہ سب ڈرامہ رچایا ہوا تھا۔ وہ ... بڑی بے چینی سے کسی کے آنے کا انتظار کررہے ... اور پھر انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور اس ... سے ایک لمبا تڑنگا شخص اچھل کر باہر نکلا یہ ان ... سرغنہ تھا۔ اس کے آتے ہی ان سب کے سانس یوں ... سے نکلے جیسے کسی غبارے سے اچانک ہوا نکلتی ... وہ سیدھا ان کی طرف بڑھا اور اس کے درمیان ... پہنچتے ہی اس نے ان سے تمام کارروائی سنی ان کی رپورٹ کے مطابق مقامی پولیس ان دونوں شکاری افراد کے ساتھ اس وقت ان درختوں کے جھنڈ کے نزدیک پہنچ چکے تھے ان کا راز ان پر آشکار ہوچکا تھا اسی لئے اس نے ہنگامی میٹنگ بلاکر آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لئے مشورے کے لئے انہیں بلایا تھا۔ ان کے پاس اسلحہ وافر مقدار میں موجود تھا لیکن جس طرح پولیس بھی پوری تیاری سے یہاں پہنچی تھی اس سے لگتا تھا کہ اس بار شاید قسمت ان کا ساتھ نہ دے سکے۔ لیکن انہوں نے بھی آخری سانس تک مقابلے کا فیصلہ کیا اور پھر اس سرغنہ نے انہیں تمام کام سمجھا کر دوبارہ دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆......☆......☆

پولیس کے آدھے افراد دائیں طرف اور آدھے بائیں طرف بڑے چوکنے انداز میں آگے بڑھنے لگے ان کی نظریں زمین کے ساتھ ساتھ درختوں کے اوپر کی جانب بھی تھیں چونکہ انہیں ان دونوں نے یہاں موجود بہت سی چیزوں کے متعلق پہلے سے ہی آگاہی دے دی تھی اس لئے وہ محتاط ہوگئے تھے۔ بڑے غور سے دیکھنے پر انہیں درختوں میں چھپی الیکٹرک تاروں کی موجودگی کا پتہ چل گیا اور اس طرح انہیں ان دونوں کی صداقت پر بھی یقین ہوگیا۔

ابھی وہ چند گزوں کا فاصلہ ہی طے کرپائے تھے کہ اچانک کہیں سے گولیاں چلنے کی آوازیں گونجیں اور اگر وہ سب اچھل کر ایک جانب کود کر اپنی جان نہ بچاتے تو وہ گولیوں کی بوچھاڑ کا شکار بن چکے ہوتے۔ گولیوں نے سامنے نظر آنے والے چند درختوں کو بھون کر رکھ دیا تھا۔ یہ دیکھ کر ان پولیس کے جوانوں نے بھی جوابی فائر داغ دیئے اور پھر دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔

گولیوں کی آوازوں سے آس پاس کا علاقہ گونج رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دور دور تک کوئی انسان یا جانور دکھائی نہیں دے رہا تھا غالباً لوگ اس علاقے سے انتہائی خوفزدہ تھے اس لئے کسی کو بھی اس

طرف آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ پولیس کے افراد کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی ان کے ساتھ مقابلہ کررہے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے درختوں پر بیٹھے پرندے اڑاڑ کر آسمان کی جانب پرواز کرگئے تھے۔ پولیس کے جوان گولیوں کی بوچھاڑوں کیساتھ آگے بڑھتے چلے جارہے تھے وہ گولیوں کی سمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے لیکن پھر یکدم خاموشی چھاگئی۔

دوسری جانب سے فائرنگ کا سلسلہ روک دیا گیا تھا غالباً ایسے حالات کا اندازہ لگانے کے لئے کیا گیا ہو جواباً پولیس کے افراد بھی چھپ کر جھاڑیوں کی اوٹ سے آس پاس کے منظر پر نظریں جمائے آئندہ پیش آنے والے حالات کا جائزہ لینے لگے۔

لیکن کافی دیر تک خاموشی رہنے پر انہیں کوفت ہونے لگی اس پر انسپکٹر نے انہیں دوبارہ پیش قدمی کی اجازت دی اور وہ دوبارہ چوکنے انداز میں آگے بڑھنے لگے جھنڈ باہر سے بہت چھوٹا لگ رہا تھا لیکن جیسے جیسے وہ اس کے اندر بڑھتے گئے انہیں اندازہ ہوا کہ یہ درختوں کا پھیلا ہوا ایک وسیع سلسلہ تھا اور ظاہر ایسے حالات میں ڈاکوؤں کو یہاں اپنی آماجگاہ بنانے کے لئے وافر جگہیں میسر تھیں وہ سب بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھتے جارہے تھے کہ اچانک ایک جانب سے کچھ گولیاں چلیں اور ادھر پولیس کے دو افراد تڑپ کر نیچے زمین پر ڈھیر ہوگئے غالباً وہ دوسری طرف سے کی گئی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔

یہ دیکھ کر بچ جانے والے دیگر پولیس والوں نے اندھا دھند اس جانب گولیوں کا رخ کردیا جس طرف سے انہیں گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اور اس بار ان کا نشانہ خطا نہیں گیا اور جواب میں انہیں ایک چیخ سنائی دی شاید کوئی ڈاکو ان کی طرف سے کی گئی فائرنگ کا شکار بن چکا تھا۔

چیخ کی آواز سنتے ہی وہ سب تیزی سے اس جانب بڑھے جہاں ایک ڈاکو زمین پر زخمی حالت میں موجود تھا اس کے ساتھی شاید پولیس والوں کو آتا دیکھ کر رفو چکر ہوگئے تھے اور گھبراہٹ میں اپنے زخمی ساتھی کو بھی وہیں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کرچکے تھے۔

پولیس کے افراد نے زمین پر پڑے زخمی ڈاکو کو گرفتار کرلیا تھوڑی دیر میں انسپکٹر اور وہ دونوں شکاری بھی وہیں پہنچ چکے تھے جنہیں اطلاع دیکر وہیں بلالیا گیا تھا۔ زخمی ڈاکو کے بتلانے پر انہوں نے ان کے ٹھکانے کا رخ کیا اور بڑے محتاط انداز سے وہاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف خاموشی تھی اس کے ساتھی شاید اندر کہیں چھپ گئے تھے۔

انسپکٹر نے اپنے ساتھ لائے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرتے ہوئے انہیں باہر نکل کر خود کو پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی اور دوسری صورت میں ان کی آماجگاہ کو بم سے اڑانے کی دھمکی دی۔ ساتھ یہ بھی بتادیا کہ انہیں چاروں طرف سے پولیس کی بھاری نفری نے گھیر لیا ہے اور ان کے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس دھمکی کے نتیجے میں ڈاکوؤں نے بھی خود کو کسی اور مشکل میں ڈالنے کی بجائے اپنی گرفتاری پیش کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور کچھ ہی دیر میں ڈاکو ایک ٹولی کی صورت میں وہاں سے نکل کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرچکے تھے۔ پولیس نے وہاں موجود تمام اسلحہ، نقدی اور منشیات کی بہت بڑی کھیپ اپنے قبضے میں لیکر ان سب کو گرفتار کرکے واپس شہر کی جانب پیش قدمی کی۔

کچھ ہی دیر میں شہر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی اور پولیس والوں کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگنے لگے۔

پولیس نے اپنی ضروری کارروائی کے بعد تمام ڈاکوؤں کو لاک اپ میں بند کردیا اور ان دونوں شکاریوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے وہاں کے مکینوں کو پھر سے اپنی زمینیں آباد کرنے کا موقعہ مل گیا تھا۔

چیل

محمد رضوان قیوم۔ راولپنڈی

نوجوان اپنے دوست کو گھر لے گیا اور کمرے میں بٹھایا، اور سامنے بیٹھے بیٹے کی حالت دیگرگوں تھی بھوک مفلسی نے اسے نڈھال کردیا تھا اس کے پورے چہرے پر خون میں لت پت پٹی بندھی تھی۔

اس کہانی کے لئے صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ یہ حقیقت پر مبنی خوفناک کہانی ہے

اس کہانی کے راوی حاجی شفقت اللہ ہیں۔ موصوف تقریباً 90 برس کے قریب ہیں۔ لیکن حیرت انگیز طور پر ان کی صحت قوت سماعت، بصارت اور یادداشت بہت جاندار ہے۔ ان سے میری ملاقات ایک شادی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ دوران ملاقات انہوں نے اپنی زندگی کے دوران بیتے ہوئے ایک پراسرار واقعہ کو یوں بیان کیا کہ 1946ء میں موجود بھارت کے شہر پٹیالہ میں محکمہ میونسپل کمیٹی میں بحیثیت چپڑاسی کی نوکری کیا کرتا تھا۔ یوں تو ہمارے محکمے میں کئی سیکشن تھے۔ لیکن میری ڈیوٹی لیبر ڈویلپمنٹ کے انچارج سینئر سپرنٹنڈنٹ امیتابھ شکلا کے ساتھ تھی۔

امیتابھ شکلا ایک اچھا، رحم دل اور ملائم طبع کا حامل شخص تھا۔ یہ جذباتی قسم سخت مزاج، بے رحم اور کیسی ماتحت اہلکار کو نقصان دینے والا آفیسر نہ تھا۔ اس کی خوش

اخلاقی۔نرم طبیعت پورے ڈپارٹمنٹ میں مشہور تھی۔

یہ کبھی کبھار مجھ سمیت میرے جیسے کئی غریب ملازمین کی اپنی جیب سے نقدی کے صورت میں مالی معاونت بھی کر دیتا تھا۔اس کی دوسری بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ یہ ملنسار ہونے کے ساتھ اپنا زیادہ کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتا تھا۔

مثلاً خود چائے، پانی پینا۔اپنے آفس کا پنکھا چلانا، آفس میز صاف کر لینا۔الغرض وہ مجھے کم ہی اپنے کمرے میں بلاتا۔

میں سارا دن اس کے آفس کے کمرے کے باہر بیٹھا رہتا اور دوسرے ملازم چپڑاسیوں، ڈائریکٹروں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں مارتا رہتا تھا۔

میونسپل دفتر میں ہمارے شعبہ کا کام پٹیالہ شہر کی پکی سڑکوں کو بنانے کے لئے سرکاری طور پر لیبر کو فراہم کرنا ہوتا تھا۔نیز ڈویلپمنٹ کی کارکردگی کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی تھی۔

ہفتہ میں دو روز سائیڈ وزٹ اور تین دن میٹنگ اور ایک دن رپورٹ پر مختص کیا جاتا تھا۔

حسب ضرورت اس شیڈول میں وقتاً فوقتاً تبدیلی کر دی جاتی تھی۔ورک سائیڈ کی تمام رپورٹس کامران نامی جونیئر کلرک کے پاس جمع ہوتی تھی وہ ایک فائل میں تمام رپورٹیں جمع کر کے ایتا بھ شکلا کی میز پر روزانہ کی بنیاد پر دیتا تھا۔

کامران کی دائیں آنکھ کسی پرانے زخم کی وجہ سے بند تھی اس لئے یہ دفتر میں کامی کانا کے نام سے مشہور تھا۔یہ بیچارا بڑے حوصلہ والا تھا اور جب بھی مجھ سے بات کرتا تو مسکرا تا رہتا اپنی آنکھ کے متعلق بتاتا کہ میری آنکھ کے اندر ٹانکے لگے ہوئے تھے۔وہ ہم لوگوں کو بتاتا کہ بچپن میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

وہ بہت محنتی اور اپنی پوری ایمانداری سے ڈیوٹی دینے والا شخص تھا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کے باوجود بھی آدھا، پون گھنٹہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر آنے والے کل کے لئے اپنا کام ہلکا کرتا تھا۔

دوسری جانب ایتا بھ شکلا صاحب کو بھی سائیڈ رپورٹس کی۔مختلف فائلیں دیکھنے میں کافی وقت لگتا تھا۔وہ بھی اپنی سیٹ سے پورا کام نمٹا کر تقریباً 4 بجے اٹھتے تھے۔(جبکہ ڈھائی بجے چھٹی ہوتی تھی) صاحب ہم دونوں کو اپنے کمرے میں بلا لیتے میں وہاں آخری ٹائم اپنے ہاتھوں سے چائے بناتا وہ اپنے کے دوران ہم سے ہر موضوع پر کھل کر بے تکانہ باتیں کرتے اور ایک آدھ دن چھوڑ کر وہ ہم دونوں کو دو تین روپے خرچہ بھی دے دیتے۔ہمارے درمیان فطری طور پر ایک قسم کی دوستی اور انسیت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔بلکہ کسی تہوار، یا سنڈے کے موقع پر آنے والی چھٹیوں میں ہم کبھی کبھار سینما میں فلم یا تھیٹر میں نوٹنکی دیکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دفتر میں چند روز سے کامران اپنی ڈیوٹی پر نہ پہنچا۔اس کی جانب سے نہ تو آفس میں کوئی درخواست آئی اور نہ ہی اس کی کوئی خبر حالانکہ وہ کبھی بھی غیر ضروری طور پر چھٹی نہ کرتا تھا، وہ تو اپنی ڈیوٹی کا بہت پابند شخص تھا۔ایتا بھ شکلا نے مجھ سے کہا کہ تم اس کے گھر جا کر اس کی دفتر میں غیر حاضری کی اصل وجہ معلوم کرو اور اس سے آنے کا کہو کہ اگر کوئی خاص مجبوری ہے تو وہ مجھے چھٹی کی درخواست بھیج دے میں اسے منظور کر لوں گا۔"

میں جب کامران کے محلے میں پہنچا تو وہاں اس کے چھوٹے سے گھر میں تالہ پڑا ہوا تھا۔اس کے ایک پڑوسی بچے نے کہا کہ چند روز پہلے اس کے بڑے بیٹے کے منہ پر ایک خونخوار چیل نے حملہ کر دیا تھا۔جس سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے وہ اسے ہسپتال لے کر گیا ہے۔"

"یہ محلے میں کانوں کا گھر مشہور ہے۔"

اس دوران ایک اور بزرگ پڑوسی وہاں آ گیا۔اس نے کہا۔"جب تلک وہ اپنے گھر نہیں آ جاتا تم اس کے چچا کے گھر میں جا کر اس کا انتظار کر لو۔"

"جی اس کے چچا کا گھر کونسا ہے؟" تو اس نے جواباً کہا۔

''اوپر نگاہ ڈالتے جاؤ اس محلّہ کے نکڑ والے گھر میں جہاں چھت پر تمہیں ایک سیمنٹ سے بنا چیل کا بڑا مجسمہ ہے اور اس کے اوپر لاتعداد چیلیں منڈلاتی ہوئی نظر آئیں گی۔ وہی ستار خان اس کے چچا کا گھر ہے۔''

میں بہرحال خراماں خراماں اوپر کو دیکھتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا گیا تو محلے کے نکڑ پر واقعی لاتعداد چیلیں منڈلا رہی تھیں۔

میں نے مکان پر ستار خان کے نام کی تختی دیکھی تو سمجھ گیا یہی میری مطلوبہ منزل ہے۔ میری نگاہوں نے وہاں ایک منظر یہ بھی دیکھا کہ اس مکان کی چھت پر ایک بڑی سی چیل کا دیوہیکل سیمنٹ کا مجسمہ بنا ہوا تھا۔

''یاالٰہی یہ کیا پراسرار ماجرہ ہے۔'' ابھی میں یہ بات اپنے دل میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس مکان کی دوسری منزل سے ایک بڈھا چلایا جس کے نقش و شباہت کامران سے ملتے جلتے تھے۔

''کون ہو تم''

''جی میں کامران کے دفتر کا ساتھی ہوں۔''

''وہ تو اپنے بیٹے کو لے کر ہسپتال گیا ہوا ہے؟ تم ایسا کرو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاؤ۔''

''جی اچھا۔'' میں نے کہا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دوسری منزل پر آ گیا۔ جہاں وہ بابا میرا منتظر تھا۔

''ارے معاف کرنا کامران تو اپنے بیٹے کو لے کر ہسپتال گیا ہوا ہے وہ آتا ہی ہوگا۔''

''جی جی معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔

اس بڈھے نے مجھ سے اخلاقاً پوچھا۔

''لسی یا شربت لوگے۔''

''جی کچھ نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں کچھ تو لو۔ باہر بہت گرمی ہے۔''

''بیٹے ذرا باہر دیکھو سورج آگ برسا رہا ہے۔''

تو میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہاں ایک اور دل دہلانے والے منظر نے مجھے ڈرا کر رکھ دیا۔ اس کمرے کی کھڑکی کے باہر ایک چھجا پر ایک چیل بیٹھی ہوئی کھڑکی کی طرف نظریں جمائے دیکھ رہی تھی۔

''جی یہ چیل،'' میں نے بڑبڑاتے ہوئے اس سے سوال کیا تو وہ چپ رہا۔

میں نے پھر اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

''اصغر بیٹا مہمان کے لئے لسی لاؤ اور اس چیل کے لئے گوشت کے ٹکڑے بھی لے آنا۔''

''جی ابا ابھی لایا۔'' بیٹے نے جواب دیا۔

وہ بڈھا بت بنا مجھے خاموشی سے گھورتا رہا۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ بہت شاندار قیمتی ڈیکوریشن سے لبریز تھا۔ قیمتی صوفے، اعلیٰ پردے۔ چوبی منقش الماریاں دولت، امارت کی چغلی کھا رہی تھیں۔ الغرض وہاں کی ہر چیز نئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے بیٹے نے لسی لاکر میرے سامنے رکھ دی۔ اور ایک پلیٹ میں چھوٹے چھوٹے گوشت کے ٹکڑے لایا تھا۔ بڈھا اپنی جگہ سے اٹھا، اور مچان پر بیٹھی چیل کے آگے گوشت کے ٹکڑے ڈال دیئے۔

چیل دیکھنے میں بڑی معصوم ہے۔ لیکن بعض دفعہ تو وحشی بن کر حملہ بھی کر دیتی ہے۔

میں نے خود ہی بات کا سکوت توڑا تاکہ میں کوئی نہ کوئی موضوع چھیڑ کر اپنی بوریت کو دور کروں۔

جواباً بڈھا بولا۔ ''نہیں بیٹا تم غلط ہو دراصل ہر جانور یہ چیل کیا۔ سب معصوم ہی ہوتے ہیں، ہر سانپ زہریلا، شیر خونخوار نہیں ہوتا صرف انسان کا رویہ اور سلوک کسی بھی جانور کو اس کا دوست یا دشمن بنا دیتا ہے۔ یہ چیل تو میری محسن ہے۔ مجھے اچھا مستقبل دینے والی بے ضرر پرندہ ہے۔ یہ میری بیوی بچوں سے زیادہ ہمدرد وفادار ہے۔'' پھر بڈھے نے چیں، چیں کر کے چیل کو پچکارہ تو وہ چیل اپنا گوشت چھوڑ کر بڈھے کے قریب آ گئی۔

اس منظر کو دیکھ کر میں چونک کر ڈر گیا۔

''ارے بیٹا ڈرتے کیوں ہو'' تھوڑی دیر بعد

وہ چیل بڈھے کے پاس سے اپنی جگہ پر چلی گئی۔

وہ بڈھا اپنے کمرے میں مجھے یہ کہہ کر چلا گیا کہ جب کامران اپنے گھر لوٹے گا تو میں آپ کو خبر کروادوں گا۔ آپ اتنی دیر تک میرے دوست کو دیکھو اور اگر چاہو تو اس کے قریب جا کر اس سے باتیں بھی کر سکتے ہو۔

میری پہلے ہی سٹی گم تھی میں نے ہوں ہاں کر دیا۔

بڈھے کے جانے کے بعد میرے دل میں کئی سوالات نے سر اٹھایا۔ پہلا یہ کہ کامران کی ایک آنکھ کانی ہے وہ تو یقیناً کسی چیل کے حملہ کا نتیجہ لگتا ہے۔ دوسرے اب اس کے بڑے بیٹے کے چہرے پر کسی چیل نے حملہ کیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ اس کے چچا ستار خان کے گھر میں یہ پراسرار چیل۔ اس کے مکان پر چیل کوؤں کا جمگھٹا اور اس کے مکان کی چھت پر سیمنٹ کا بنا چیل کا مجسمہ یا الٰہی یہ ماجرہ کیا ہے۔

میں اس سوچ کے گرداب میں پھنسا ہوا تھا کہ بڈھے کی آمد اور اس کی گرجدار آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''بیٹا کامران اپنے زخمی بیٹے کے ساتھ اپنے گھر آ گیا ہے۔'' میں نے چیل کی جانب دیکھا وہ مجھے دیکھ کر اپنی مخصوص آواز میں چیں چیں کرنے لگی۔

میرے خوف کے گراف میں اضافہ ہونے لگا'' ارے یہ آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔'' تو میں نے جواب دیا۔

''محترم اسے میرے پاس نہ بلوائیں۔'' میں نے اپنے اندر کے خوف کا اظہار کرتے ہوئے جب یہ جملہ منہ سے نکالا تو بڈھے نے مسکرا کر کہا۔

''ارے بیٹا آپ دیکھنا یہ کتنے محبت بھرے انداز سے آپ سے ملتی ہے۔'' اس سے پہلے کہ میں اسے مزید منع کرتا۔ بڈھے نے ہلکی سیٹی ماری تو سامنے مچان پر بیٹھی ہوئی چیل جھٹ سے میرے کندھے پر اڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا وزن تقریباً چار کلو ہوگا وہ بہت فربہ موٹی تھی۔ میں بالکل گوتم بدھ کی مانند خوف سے ساکت کھڑا رہا۔ چیل نے بڑے لاڈ سے میرے گالوں پر اپنی چونچ رگڑی۔

''اسے اتاریں۔'' میری گھگھی بندھ گئی۔

''ارے تم تو کبوتر کا دل رکھتے ہو۔ لگتا ہے کہ تم تو بہت بزدل ہو۔''

''بزرگو! آپ جو مرضی کہہ لیں۔ لیکن مجھے اب یہاں سے جانا ہے۔''

اس نے کہا۔

''میرا تو دل کرتا تھا کہ تم یہاں کچھ دیر رہتے۔''

پھر وہ خود ہی بولا۔

''اچھا تم ذرا دو منٹ کے لیے میرے ساتھ چھت پر آؤ۔ میں تمہیں ذرا چیل کا لعاب دے دوں۔''

''اچھا کیوں بزرگو؟''

'' ارے تمہارے لئے نہیں۔ یہ لعاب تم کامران کو دینا یہ لعاب نہیں بلکہ ایک مرہم ہے جو اسے کے زخمی بچے کے زخموں میں بہت موثر کردار ادا کرے گا۔''

''جی آپ لا دیں۔''

''نہیں بیٹا تم اوپر آؤ۔ تم نے ڈنڈے سے یہ دوائی جمع کرنی ہے میرے کندھوں میں درد ہو رہا ہے۔''

میں اس پراسرار ماحول سے فرار اور جلد سے جلد آزاد ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اس بابے کو میں ٹکا سا جواب بھی نہیں دینا چاہتا تھا۔

بہرحال میں اپنے دل پر جبر کر کے اس کے ساتھ اس کے مکان کی چھت پر گیا۔ وہاں عین اس کی چھت کے اوپر سینکڑوں کوے، چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ آسمان پر اڑتے پرندے بابے کی شکل دیکھتے ہی بڑی دلیری سے اس کے قریب آ گئے۔

''بیٹا ڈرنا نہیں تم ڈنڈے سے ان کے منہ سے نکلے لعاب کو جمع کرو۔''

میں نے ڈنڈا پکڑا اور بابے کے کہنے کے مطابق چیلوں کے منہ سے نکلتے لعاب کو ایک اخبار میں

جمع کرتا رہا۔ یہ بڑا غلیظ کریہہ کام تھا۔

''جی یہ چیل کا لعاب کس کام آئے گا۔''

''بابے نے بتلایا کہ چیل کے حملے سے پیدا ہونے والے زخم کا علاج میں اس کا لعاب مرہم کا کام کرتا ہے۔''

دوسری جانب اس کی چھت پر سیمنٹ کے بنے بڑے سے چیل کے مجسمے کو دیکھ کر اس گھر کی پراسراریت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔

میں نے چیل کا لعاب لیا اور سیدھا کامران کے گھر آیا۔ ویسے میرا دل یہ کہہ رہا تھا کہ میں اس کے گھر نہیں جاؤں لیکن یہ میری غلط بلانگ ثابت ہوتی۔ میں اپنے گھر کے راستہ کے رخ والی گلی میں مڑ رہا تھا کہ پیچھے سے کامران کی آواز آئی۔

''ارے شفقت تو کہاں۔''

میں نے اسے حیرت سے دیکھا اور جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ بھئی تیرے ہی گھر آنا تھا تو میں نے سوچا کہ تیرے زخمی بچے کے لیے کچھ سوغات خرید لوں اور ہاں یہ اخبار میں تیرے چچا نے تیرے زخمی بچے کے زخم کے لئے چیل کا لعاب دیا ہے۔ میں تیرے آنے کا وہاں انتظار کر رہا تھا۔''

میرے زخمی بیٹے کے لئے کچھ نہ خریدو ویسے بھی کسی چیز کو کھا نہیں سکتا۔ اسے ہم لوگ صرف دودھ دلیہ بہت مشکل دے رہے ہیں۔

پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ جو کہ صرف ایک کمرہ پر مشتمل تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ غربت، مفلسی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے زخمی بچے کو اپنے پاس بلایا۔ اس کے تقریباً پورے چہرے پر خون سے بھری سفید پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں اور کمرے کے اندر سے کسی کے کھانسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

''اندر کون ہے؟''

تو وہ مایوسی سے بولا۔ ''یہ میری ٹی بی زدہ بیوی ہے۔''

وہ مجھے کافی پریشان لگ رہا تھا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے کرتے کہیں گہری سوچ میں جا کر ڈوب جاتا تھا۔ خیر میں نے اس سے کہا۔

''کامران تو میرا پکا دوست ہے۔ تو یہ بتا کہ یہ تیری نہ گفتہ حالت کیوں ہے۔ تیرے چچا تو بہت امیر و خوشحال نظر آ رہے ہیں۔ اور تو اس حالت میں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔'' شفقت ہم اس تذلیل، پریشان کن حالات میں ایک چیل کی وجہ سے پہنچے ہیں۔ کاش میری ماں ضدی، لالچی، بداخلاق، اکڑوں نہ ہوتی۔''

میں نے اسے بتلایا کہ! ''تو اور تیرا بیٹا ایک آنکھ سے اندھے ہو اور دوسرے تمہارے چچا کے گھر پر بنا ہوا چیل کا مجسمہ اور چھت کے اوپر منڈلاتی چیل کوے اور پھر ان کے گھر پلی ہوئی چیل یہ سب کیا ماجرہ ہے۔ سچی بات ہے میرا تو دماغ چکرا گیا ہے۔ یہ کیا کہانی ہے؟''

اس نے مجھے مایوس کن لہجے میں کہا۔'' اب تو نے بہت کچھ اس بارے میں دیکھ اور سن لیا ہے۔ تجھ سے اب کچھ چھپانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ چل میں تجھے ان پراسرار چیلوں کی حقیقت بتاتا ہوں۔''

اور پھر اس نے اس کہانی کا آغاز یوں کیا!

''تم جو ابھی میرے چچا کا شاندار نیا مکان دیکھ کر آئے ہو۔ یہ کبھی بوسیدہ، مکان ہوا کرتا تھا۔ اس پرانے مکان میں میرے ابا اور چچا کے خاندان والے مشترکہ طور پر رہتے تھے۔ اوپری منزل پر چچا کی فیملی اور نچلی منزل پر ہماری فیملی رہتی تھی۔ یہ مکان دراصل ہمارے دادا مرحوم نے کسی ہندو سے خریدا تھا۔ یہ اس وقت بھی بہت پرانا تھا۔ دادا کا خیال تھا کہ دونوں بھائی اتفاق اور محبت سے رہیں گے۔ اس وجہ سے انہوں نے اس کو اپنی زندگی میں تقسیم نہ کیا۔

ہمارے گھر میں دادا کے مرنے کے بعد روز روایتی طور پر مشترکہ مکان ہونے کی وجہ سے چچا اور ہم میں باہمی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ جن کا کوئی خاص سبب نہ

ہوتا تھا۔ کبھی پانی کے زیادہ استعمال، کبھی دھوپ سیکنے مرمت کے خرچہ پر لڑائیاں شروع ہوجاتی تھیں۔

اماں اور چچی کے درمیان جو عذر محبت وہ رفتہ رفتہ ابا اور چچا کے گریبانوں، گال، گلوچ تک پہنچ جاتا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ اماں بہت ضدی تیز زبان اور تلخ لہجہ والی تھیں۔ وہ فلک شگاف شور شرابہ ڈالتیں اور بعض دفعہ ناحق چچی، چچا کے پیچھے پڑ جاتیں، وہ اپنی غلطی نہ مانتیں اور آخری حد تک اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لئے اپنے موقف پر اڑی رہتیں پھر اماں نے ابا کو بھڑکایا کہ اس مکان کو فروخت کرکے اپنے بھائی سے اپنا حصہ مانگو۔''

چچا کہتے تھے کہ ہمیں یہ بڑوں کی نشانی سمجھتے ہوئے اسے اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ لیکن اماں کی ضد تھی کہ یہ مٹی کا ڈھیر اور لڑکھڑاتا ہوا ملبہ ہے۔ یہ کسی وقت بھی ہمارے سروں پر آ کر گر سکتا ہے۔''

مکان واقعی بہت پرانا اور عدم توجہی کی وجہ سے جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی ایسی بھی اتنی بری حالت نہ تھی کہ اسے فروخت کر دیا جائے۔

اور چچا کا یہ خیال تھا کہ اگر دونوں بھائی اس پر مل کر کچھ رقم لگائیں تو اس کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ اور ایسا ہو بھی سکتا تھا۔

لیکن اماں بھلا اپنے آگے کسی کی سننے والی نہ تھیں۔ انہوں نے گھر میں رولہ عذاب ڈالا ہوا تھا کہ اس مکان کو ہر حال میں فروخت کر دیا جائے۔

''ہم کہاں جائیں گے۔'' ابا جب اماں سے یہ سوال کرتے تو وہ کہتیں کہ میں تم سب کو لے کر اپنے والدین کے مکان میں چلی جاؤں گی وہاں پر آدھا حصہ ہے۔ (نانا کا مکان ہمارے محلہ میں ہی تھا۔)

بالآخر اماں کے اکسانے پر ابا نے بھی چچا پر زور دیا کہ وہ اس مکان کو فروخت کر دیں۔

پھر چچا نے یہ مکان فروخت کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مکان کی خستگی کی وجہ سے اس میں کسی نے دلچسپی نہ لی۔ اور جب لگی تو اس کی قیمت بہت کم لگی۔ بالآخر چچا نے چچی کا زیور فروخت کر کے کچھ قرض لے کر اپنے پاس موجود رقم جوڑ کر ابا کو اس مکان کی قیمت ادا کر دی جو ان کا حصہ بنتا تھا انہوں نے اصل حق سے کچھ زیادہ ہی روپے دیئے۔ تاکہ اماں مزید کھپ نہ ڈالیں۔

اماں نے حسب عادت چچا سے لڑائی کی اور ان سے مرنا جینا ختم کرنے کا کہہ دیا۔

پھر ہم لوگ قریب کے محلہ میں نانا کے گھر کی اوپری حصہ میں آ گئے۔ نیچے ہمارے ماموں رہتے تھے۔ وہ بہت شریف، نمازی اور کم گو انسان تھے۔ یہاں بھی بدقسمتی سے اماں کی اڑیل طبیعت اور بداخلاقی کی وجہ سے ہمارے ماموں سے نہ بنی۔ یہاں بھی ممانی، ماموں سے روز روز کے حیلے بہانے۔ چھوٹی، چھوٹی بات پر لڑائیاں ہوتی تھیں اکثر زیادہ تر اماں ہی غلط ہوتی تھیں۔ ہم لوگ نانا کے مکان کے اوپری حصہ میں رہتے تھے۔ تو اماں کسی کو چھت پر آنے نہیں دیتی تھیں۔ حالانکہ چھت پر کپڑے ڈالنے، دھوپ سیکنے، بیٹھنے کا حق تو ماموں کے خاندان کا برابر کا تھا۔ لیکن اماں کہاں کسی کی اپنے آگے چلنے یا بولنے دیتی تھیں۔

چھت کے ایک کونے میں چھجے پر ایک چیل نے اپنے ایک بچے کو جنم دیا ہوا تھا۔ اس کا گھونسلہ ایک طرف تھا۔ اماں کو وہ بھی برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے اسے ہٹانے کی بہت کوشش کیں۔ لیکن وہ ذرا اونچا تھا اور اماں کا ہاتھ وہاں تک نہ پہنچتا تھا لہٰذا انہوں نے مجھے اور بھائی سے کہا کہ اس چیل کے گھونسلے کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔''

اور جب ممانی نے یہ بات سنی تو انہوں نے اماں سے کہا کہ اس بے زبان پرندے کے ساتھ ظلم ہے۔ اور اس کا بچہ چھوٹا ہے اور یہ اپنے بچے کو لے کر کہاں جائے گی۔'' تو اماں نے ممانی سے شدید لڑائی کی۔

''تو کون ہوتی ہے میرے معاملات میں دخل

دینے والی۔'' غالباً اماں نے ممانی کو دھکا دے دیا۔ اس کے بعد ماموں بھی لڑائی میں کود گئے۔ ابا بھی درمیان میں آئے۔ خیر پھر لڑائی رک گئی۔ تو اماں نے مجھے اور بھائی سے کہا کہ اس چیل کے گھونسلہ کو توڑ دو۔ تو بھائی نے غصہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں اماں یہ چیل کا بچہ بہت خوبصورت ہے اور میں گھونسلے کو نہیں توڑوں گا۔''

''گستاخ، نہ مراد ماں کے آگے زبان چلاتے ہیں اور ماں کی بات نہیں مانتا ابا نے کہا۔

پھر بھائی رونے لگا، اس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

میں ہر گز ریہ گناہ اپنے سر نہ لوں گا۔''

''چل کامران تو میرے ساتھ ڈنڈے کی مدد سے اس گھونسلہ کو گرا'' میں دراصل اماں سے ڈر گیا تھا۔ میں نے مچان پر چڑھ کر چیل کے گھونسلے کو نیچے گرا دیا، چیل تو اڑ گئی لیکن اس کا بچہ زمین پر گر گیا۔ وہ بہت کمزور تھا۔ اماں نے میرے ہاتھ سے ڈنڈا لے کر اسے مارنا شروع کر دیا تو چیل چیں، چیں کرنے لگی۔ وہ ممتا کی ماری پھڑک رہی تھی اور چیل کا بے چارہ بچہ اپنی جان بچانے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

اور اماں کا ڈنڈا اس پر برس رہا تھا۔ کہ میں نے دیکھا کہ اس چیل کے بچے کی آنکھ سے لہو بہ رہا تھا۔ بالآخر چیل نے غضبناک حالت میں غوطہ اماں کے منہ پر لگایا اور جھٹ سے ان کے منہ پر اپنے نوکیلے پنجے مارے اور اپنے بچے کو اپنی چونچ میں دبا کر اڑ گئی۔ لیکن اس دوران اس کا بچہ زمین پر گر گیا۔

ادھر اماں کا چہرہ بھی لولہان ہو گیا تھا۔

''ہائے میں مر گئی، چیل اللہ تیرا بیڑہ غرق کرے۔ مجھے نظر نہیں آ رہا'' اماں کی فلک شگاف چیخیں گونجنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے محلے کے لوگ جمع ہو گئے اماں کو ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے بتلایا کہ اماں کی دائیں آنکھ ضائع ہو گئی ہے۔ کیونکہ چیل کے کانٹے دار پنجے ان کی آنکھ کا ڈیلا تباہ کر دیا تھا۔

چچا، چچی اماں کو دیکھنے ہسپتال آئے اور انہوں نے اماں سے ہمدردی کی اور بولے۔ ''آپ نے ناحق بے زبان کو ستایا، اللہ خیر کرے آپ کا زخم ٹھیک ہو جائے۔'' لیکن اس حالت میں بھی اماں چلاتی کوستی رہیں۔

چچا اور چچی روز ہمارے گھر اماں کی طبیعت پوچھتے، تیمار داری اور دوائی لے کر آتے، ہمارے تعلقات پھر سے چچا کی فیملی سے ٹھیک ہونے لگے۔

دوسری جانب چچا ایک ہمدرد اور بچوں سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ گلی کے ایک کونے میں پڑے زخمی چیل کے بچے کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ انہوں نے اس چیل کے بچے اور اس کی ماں کی بہت خدمت کیں انہوں نے جانوروں کے ڈاکٹر سے بچے کا علاج کروایا۔ اچھی خوراک دی تو چند روز میں چیل کا بچہ صحت مند اور فربہ ہو گیا۔ لیکن اس کی دائیں آنکھ ضائع ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

چچا نے اس چیل کے لئے ایک مخصوص جگہ بنا دی تھی۔

کامران نے بتلایا کہ ایک دن میں اپنی گلی سے گزر رہا تھا کہ اچانک چیلوں کے ایک غول نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے میرے چہرے پر لگاتار کئی حملے کیئے تو میں اپنی جان بچاتا ہوئے بھاگا کہ میرا پاؤں ایک گڑھے میں جا کر پھنس گیا۔

اب میں بے بس تھا کہ اس دوران چیلوں نے میرے منہ سر پر اتنے شدید برق رفتاری سے حملے کیئے اور انہوں نے میرا منہ زخموں سے بھر دیا چیل کے ایک پنجہ نے میری دائیں آنکھ کا ڈیلا باہر نکال دیا۔

لوگوں نے چچا سے کہا کہ وہ اپنے گھر سے چیل اور اس کے بچے کو نکال دیں۔ کیونکہ چیلوں نے کامران سے اپنا انتقام لیا ہے۔ چچا نے ان کی کوئی بات نہ مانی۔

ادھر ہمارے اوپر ایک نئی آفت یہ آئی کہ ہم تانا کے جس گھر میں رہتے تھے وہ مکان ایک سرکاری قانون

کے تحت ایسی اسکیم میں آ گیا جہاں سے گورنمنٹ کو سڑک نکالنی تھی لہٰذا اس لائن کے تمام مکانات توڑ دیئے گئے اس کا معاوضہ نہ ہونے کے برابر ہماری فیملی کو ملا، اس طرح ہم لوگ برباد ہوگئے۔

ماموں مدراس چلے گئے۔

چچا تو ہمیں پھر سے اپنے گھر بحیثیت کرایہ دار لے جانے کو تیار تھے لیکن چچی نے انہیں منع کیا۔

اس کے بعد ہم اس شہر میں ایک بہت گندی بدبو دار آبادی والے علاقے کی جھونپڑی میں چلے گئے۔

پھر کچھ عرصہ بعد ہم لوگوں نے سنا کہ چچا نے اپنا پرانا ٹوٹا پھوٹا مکان نئے سرے سے تڑوا کر بنیادوں سے اٹھا کر 3 منزلہ بہت شاندار بنالیا ہے۔ دولت کہاں سے آ گئی، فطری طور پر ابا اور اماں نے بہت حسد کیا۔

ایک دن ابا سے اماں نے کہا کہ اس راز کو معلوم کرو کہ چچا کے پاس چھپڑ پھاڑ کر دولت کہاں سے آ گئی۔

میں اور ابا دل سے چچا کے نئے مکان کی مبارکباد دینے جب ان کے گھر گئے تو واقعی وہاں نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ پورے محلے میں چچا کا 3 منزلہ شاندار مکان لش پش چمک رہا تھا۔

ابا نے چچا کو مرے ہوئے دل سے مبارکباد دی اور پھر انہوں نے چچا سے پوچھا کہ تمہارے پاس اتنا کثیر سرمایہ کہاں سے آیا۔ کیا پہلے کچھ بچایا ہوا تھا۔''

چچا نے بتلایا کہ یہ راز کی بات ہے میرے پاس تو کھانے کو ایک دھیلہ بھی نہ بچا تھا۔ اور جو روپیہ جمع کیا ہوا تھا وہ تو تمہیں دے دیا تھا۔

دراصل یہ جو سامنے بیٹھی ہوئی چیل اور اس کا بچہ ہے۔ اس چیل نے تو میری زندگی ہی بدل دی ہے۔ مجھ فقیر کو بادشاہ بنا دیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' ابا نے کہا تو چچا نے بتلایا کہ میں نے بڑوں سے سنا تھا کہ کوئی چل اپنے نوزائیدہ، بچے کو جب تلک، کوئی سونا یا اس سے بنی ہوئی کوئی چیز نہ دکھلائے تو اس وقت تک وہ بچہ اپنی آنکھیں نہیں کھولتا اور میرے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔

ایک دن میں چیل اور اس کے بچے کو گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دے رہا تھا تو اچانک میری نظر گھونسلہ میں پڑی وہاں ایک پرانا غالباً مغل دور کا قیمتی ہار پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر جب نواب جیولرز کے مالک کو دکھلایا تو اس نے کہا کہ۔'' اس سونے کے ہار میں 8 قیمتی ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔'' یہ ہار نہ جانے کہاں سے چیل لائی ہوگی۔ بہرحال نواب جیولرز نے مجھے اس ہار کی اچھی خاصی قیمت دی۔ پھر چچا نے کہا کہ یہ چیل میری اور میں اس کا احسان مند ہوں۔ اس نے تو مجھے قیمتی ہار دے کر اپنا احسان اتار دیا لیکن میں اس کی کچھ خدمت کر کے ہر روز اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس کے بعد جب یہ خبر اماں کے کان میں پڑی تو ان کی طبیعت مزید خراب ہوئی اور وہ اپنے پچھتاوے کا غم لے کر بیمار ہوگئیں۔

کامران نے روتے ہوئے مزید بتلایا کہ۔'' اماں کے بعد ابا بھی کچھ عرصہ بعد اللہ کو پیارے ہوگئے۔ بھائی ایک ایکسیڈنٹ کی نظر ہوگیا۔ چچا نے بہت عرصہ بعد مجھ پر ترس کھا کر اپنے محلہ میں ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان مجھے کرایے پر دلوا دیا ہے۔ اس کا کرایہ بھی وہی دیتے ہیں۔

لیکن ہمارے خاندان سے کئی انتقام لینے کے باوجود بھی چیل کا غصہ ختم نہیں ہوا ہے۔ وہ اکثر ہمارا پیچھا کرتی ہے۔ تین چار روز قبل اس نے بڑے بیٹے کے چہرے پر حملہ کر کے اس کی دائیں آنکھ ضائع کر دی ہے۔ دوسری جانب میری بیوی ٹی بی کے عارضہ میں قریب المرگ ہے۔''

بقول راوی میں جب اجازت لے کر اس کے گھر سے باہر نکلا تو واقعی ایک چیل اس کے سامنے والے چھجے پر خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی۔

موت ایک سایہ

نثار فاطمہ۔ بہلول پور

اچانک لڑکی کی روح کمرے میں نمودار ہوئی تو کمرے میں بیٹھے لوگ اچھل پڑے، ان پر لرزہ طاری ہوگیا ان کی آنکھیں پتھرا گئیں اور پھر اچانک .....

دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر ایک ماورائی مخلوق کی لرزہ براندام کرتی.....شاہکار.....کہانی

کیا محبت کرنا گناہ ہے، کیوں، کس نے کہا۔ کس نے لکھا، کس نے بولا۔ کیوں ہمارے معاشرے میں دو محبت کرنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور انہیں اچھا نہیں سمجھا جاتا، کوئی بھی دو چاہنے والوں کو ملانے کے حق میں نہیں ہوتا، لوگ اسے اپنی عزت اور انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں ہر دور میں ایسا ہی تو ہوتا آیا ہے، ہر دور میں محبت کرنے والوں کے دشمن موجود رہے ہیں۔

ہیر رانجھا کی محبت کی لازوال داستان سے لے کر مرزا صاحبہ کی محبت تک کے قصے تاریخی محبتوں کی کہانیوں کے نام سے بے شمار کتابوں میں ملتے ہیں۔

محبت پاکیزگی کا نام ہے۔ لیکن لوگوں نے محبت کو گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔

آج کے دور میں محبت کو ایک الگ ہی نام ملا

ہے کچھ جو دل سے چاہ بیٹھتے ہیں انہیں لوگ ملنے نہیں دیتے اور کچھ ایسے جو غلط راستے پر محبت کا نام لے کر چل پڑتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو شادی کرنے کے بعد بھی کہتے ہیں کہ اپنی محبت کو بھول نہیں پائے اور اپنی یادوں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں اور اس میں نام آتا ہے کہ گھر والوں نے ایک ہونے نہیں دیا۔

بات یہ بھی ٹھیک ہے بہت سے گھر والوں کی وجہ بھی ان کے بچے دوہری زندگی جیتے ہیں، اپنی زندگی عزت اور پورے خاندان کو تباہ کر دیتے ہیں۔

عزت بچانے کے چکر میں خونی داستان بن جاتے ہیں، جو ہر گلی، محلے، کوچے میں زبان زد عام ہوتی ہے۔

میں آج قارئین کو محبت کی ایک ایسی ہی کہانی سنانے جا رہی ہوں جس میں ایک ساتھ بہت سی زندگیاں تباہ ہوئیں۔ وہ بھی صرف عزت کے نام پر آج کے دور میں یہ سب دیکھ کر یہ تو اندازہ لگا ہی سکتے ہیں کہ محبت صرف ایک سایہ بن گئی ہے۔ جسے ہم دیکھ تو سکتے ہیں لیکن چھو نہیں سکتے۔

نندنی اپنے دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی جو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھارت کے ایک گاؤں یمنا نگر میں رہتی تھی بھائی اس سے دونوں بڑے تھے اور اپنے گھر بار والے تھے دونوں بھائی اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتے تھے راج نندنی اپنے والدین ہی نہیں اپنے بھائیوں کی بھی لاڈلی تھی وہ جو بولتی اس کی ہر خواہش اس کے کہنے پر پوری ہوتی۔

نندنی نے میٹرک پاس کیا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لے کالج جانے کی ضد کی جو اس کے گھر والوں نے پوری کر دی۔ جیسے اس کی ہر ضد پوری ہوتی تھی۔

کالج جانے کے لئے انہیں شہر جانا پڑتا تھا نندنی کے ساتھ اس کی ایک دوست لاج ونتی بھی کالج جاتی تھی، وہ دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں اور بچپن سے ایک ساتھ پڑھتی آ رہی تھیں۔ اب کالج کی تعلیم بھی وہ دونوں ایک ساتھ پوری کرنا چاہتی تھیں۔

کالج کی زندگی ان کے گاؤں کی زندگی سے بالکل الگ تھی بہت جلد وہ اپنی نئی زندگی میں ڈھل گئیں۔

دن گزرتے گئے اور وہ دونوں اپنی پڑھائی میں خوب محنت کر رہی تھیں اور ایک دن جب لاج ونتی اور نندنی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھی تھیں تو نندنی کی نظر اپنے سامنے والے میز پر بیٹھے ہوئے انیل پر پڑی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

نندنی کو پہلی ہی نظر میں اس سے پیار ہو گیا اور انیل کی آنکھوں میں تو اس کے لئے محبت کا دریا بہہ رہا تھا۔

کچھ دیر وہ وہاں پر بیٹھی رہیں پھر اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی گئیں۔

انیل تھرڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا، نندنی کی کلاس میں بھی صرف انیل کے بارے میں سوچتی رہی، لاج ونتی نے نندنی کی کیفیت بھانپ لی پھر اس نے نندنی سے کہا کہ وہ ان دونوں کو چھٹے میں ملوائے گی، جسے سن کر نندنی بہت خوش ہو گئی۔

لاج ونتی چھٹی کے بعد ان دونوں کو کالج کی بلڈنگ کی بیک سائیڈ پر ملوایا تو انہوں نے دل کی بات بیان کرنے میں دونوں نے ذرا بھی دیر نہ لگائی اور پھر یہ محبت پروان چڑھنے لگی۔

روز ملنا جلنا ہونے لگا پیار و محبت کے وعدے قسمیں اٹھائی جانے لگیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن ہفتوں میں بیتے، مہینوں میں اور سالوں میں بدلنے لگے۔

انیل کا کالج ختم ہو گیا اور وہ یونیورسٹی میں چلا گیا، اب وہ دونوں کالج کے بعد باہر ملتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ دونوں کی پڑھائی بھی ختم ہو گئی انیل کو ایک جاب مل گئی۔ دونوں کی محبت برقرار رہی اور پھر ایک دن نندنی کی ماں نے اس سے کہا کہ۔ ”گاؤں کے سیٹھ کے بیٹے کا رشتہ اس کے لئے آیا

ہے لڑکا اچھی نوکری کرتا ہے تو نندنی نے اپنی ماں سے کچھ نہ کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن بازار جانے کے بہانے نندنی نے انیل سے ملنے کا پروگرام بنایا، وہ انیل سے ملنے گئی اور اسے اپنی ماں کی ساری بات بتائی۔

اس کی بات سن کر انیل چپ ہو گیا پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ''نندنی تم تو جانتی ہو کہ میری مالی حالت اچھی نہیں ہے، میرے ماں، باپ نے لوگوں کے گھر کام کر کے مجھے پڑھایا ہے اور ابھی میری نوکری لگے کچھ مہینے ہی گزرے ہیں میں اپنے باپ کو تھوڑا سکھ دینا چاہتا ہوں ان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور پھر شادی کے لئے تمہارے گھر والے میری حالت جب دیکھیں گے تو کبھی رشتہ نہیں کریں گے۔ میری غربت آڑے آجائے گی۔ کہاں سیٹھ اور کہاں ایک ادنیٰ سا غریب۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو انیل میں کیا سمجھوں ان سب باتوں کے لئے ایک کوشش تو ہم کر سکتے ہیں کیا پتہ گھر والے مان جائیں۔''

''اور اگر نہ مانیں تو؟''

''ساری زندگی کے لئے ہمیں جدا کر دیں گے۔ کیا یہ منظور ہے۔''

''تو چلو ہم بھاگ چلتے ہیں یہاں سے کہیں دور جہاں ہمارے سیوا کوئی نہ ہو'' نندنی بولی۔ ایسا نہیں کر سکتا نندنی اپنے ماں باپ کو چھوڑ نہیں سکتا اور میں تمہیں بھی ساری زندگی چھوڑنا نہیں چاہتا میں اپنی زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ تمہارے گھر والے ہمیں ایک نہیں ہونے دیں گے کیونکہ تمہارے گھر والے ہم کو نیچ ذات والے کہتے ہیں جو ان کے گھروں میں کام کرتے ہیں، تم وہاں شادی کر لو جہاں تمہارے گھر والے کہتے ہیں ہم دونوں ہمیشہ ملتے رہیں گے تمہاری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی اور تمہاری محبت بھی صرف تمہاری ہوگی میرا یقین کرو میں تمہارے سوا کسی اور کا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

انیل نے نندنی کو سمجھایا تو وہ سمجھ گئی جو انیل نے اسے سمجھایا جا رہا تھا۔

لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ اس کا یہ فیصلہ اسے کس تباہی کی طرف لے کر جا رہا ہے۔

☆.....☆.....☆

نندنی کا رشتہ ہو گیا پرکاش سے اور کچھ دنوں بعد شادی بھی ہو گئی شادی کر کے نندنی ایک عالیشان محل میں آ گئی جہاں ضروریات زندگی کی ہر ایک شے تھی بننے سنورنے کا سارا سامان جو نندنی کو پسند تھا گہنے ساڑھیاں ہر ایک چیز جن کے بارے میں وہ بس سوچتی تھی اسے مل چکا تھا۔

لیکن اس کے باوجود بھی نندنی ہر لمحے انیل اور اس کی قربت کو محسوس کرتی تھی جبکہ پرکاش اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔

شادی کے دو ماہ بعد پرکاش دوسرے ملک چلا گیا اس کے جانے کے بعد نندنی زیادہ تر وقت اپنے والدین کے ساتھ گزارنے لگی۔

اس نے سسرالیوں پر ظاہر کیا تھا کہ شوہر کے بنا اس کا دل سسرال میں نہیں لگتا۔ اس کے سسرال والے کچھ نہ بولے۔ اور اس طرح نندنی اور انیل آپس میں ملنے جلنے کا سلسلہ شروع کر لیا۔ رات کو چھپ چھپا کے نندنی اپنے گھر کے باہر والے کمرے میں انیل کے ساتھ راتیں گزارنے لگی۔ یہ سوچ کر کہ اس بات کا کسی کو کبھی پتہ نہیں چلے گا اور یہ یقین اسے اس لئے تھا کیونکہ وہ رات کو پینے والی چائے خود بناتی اور اس میں نیند کی گولیاں ڈال دیتی جس سے سب گھر والے سویرا ہونے تک سوئے رہتے۔

لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ سو دن چور کے اور ایک دن شاہ کا بھی ہوتا ہے۔

ایسا ہی نندنی کے ساتھ بھی ہوا۔

ایک رات جب وہ اور انیل اپنی محبت کو پروان چڑھا رہے تھے۔ کہ اچانک اس رات اس کے چاچا کی طبیعت خراب ہو گئی اس کا چاچا زاد چھت کی سیڑھیوں سے ان کے گھر میں داخل ہوا تو اسے باہر

والے کمرے میں کسی کی باتوں کی ہلکی ہلکی آواز آئی، وہ کمرے کے قریب آیا تو دیکھا کہ نندنی کسی لڑکے سے باتیں کررہی ہے۔

شوہر اس کا ملک سے باہر تھا تو اس لئے اس کے چاچا زاد دکرم کو یہ جاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ نندنی کسی اور شخص کے ساتھ ہے۔

اس نے دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔

اس کے زور زور سے دروازہ پیٹنے کی وجہ سے گھر کے دوسرے لوگ بھی جاگ گئے تو نندنی نے جھٹ انیل کو باہر کے دورازے سے بھگا دیا پھر اس کے بھائی اور کزن دروازہ توڑ کر اندر آئے تو نندنی ڈری سہمی بیٹھی تھی۔

نندنی کے بھائیوں نے اس لڑکے کا اس سے پوچھا لیکن نندنی نے کچھ بھی نہ بتایا تو اس کے بھائیوں اور کزن نے بری طرح اسے پیٹا اور پھر کمرے میں باندھ دیا۔

دوسرے دن سارا دن نہ کچھ کھانے اور نہ کچھ پینے کو دیا۔ نندنی کے چاچا اور کزن نندنی کے باپ بھائی کے سامنے عزت کا رونا رونے لگے اور غصے کو ایسی ہوا دی کے ان کی باتوں میں آکر نندنی کے باپ بھائیوں نے نندنی کو زہر دے کر اس دنیا سے رخصت کردیا۔

نندنی اپنی غلطی اور محبت کرنے کی اتنی بڑی قیمت چکا چکی تھی۔

محبت جو کسی بھی چیز کو سوچنے سمجھنے نہیں دیتی اس لئے نندنی نے جان نچھاور کردی۔

نندنی کو مارنے کے بعد اس کے گھر والوں کا جیسے سکھ چین ہی چھن گیا۔ نندنی کے باپ بھائی چاچا کزن کو ہر جگہ نندنی نظر آنے لگی۔ سفید ساڑی میں روتی ہوئی جو اپنی جان کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اور پھر دوسرے پل میں سرخ انگارہ ہوتی آنکھوں سے یہ پوچھتی کہ ''محبت کرنا کوئی گناہ ہے، جو مجھے مار دیا اور شادی بغیر پوچھے کردی اور عزت کی دہائی دیتے ہوئے میری جان لے لی۔

تم سب کو بھی ایسے ہی اپنی جان دینی پڑے گی ..... ہاہا..... ہا''

جن لوگوں نے نندنی کو مارا تھا ان کی زندگی اذیت ناک ہوگئی تھی نہ رات کو چین اور نہ دن کو آرام ان کو جب بھی نندنی نظر آتی تو وہ سب اس کے آگے رونے گڑگڑانے لگتے اور معافی مانگتے لیکن نندنی اپنے فیصلے پر اٹل تھی۔ وہ ہر حال میں ان سے اپنی موت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔

اور پھر ایک رات ان کی موت کی آخری رات ثابت ہوئی، وہ پانچوں ایک کمرے میں جمع تھے، کہ اچانک نندنی کی روح ظاہر ہوئی، پھر کیا تھا نندنی پر نظر پڑتے ہی وہ چیخ و پکار کرنے لگے، لیکن ان کی چیخ و پکار بے کار ثابت ہوئی نندنی نے ان کو اذیت ناک طریقے سے ہلاک کردیا۔

صبح اٹھتے ہی نندنی کے گھر واویلا مچ گیا ایک ساتھ پانچ لوگ جنہوں نے اپنی جان خود لی وہ نندنی کے بھائی، باپ، کزن اور چاچا تھے ان سب نے ان پانچوں کی موت خودکشی لگتی تھی، ہر شخص اپنی اپنی جگہ اچنبھے سے کہتے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پانچوں نے خودکشی کرلی۔

لیکن لوگ حقیقت سے دور تھے انہیں کیا پتہ تھا کہ نندنی نے انہیں اس حال کو پہنچادیا تھا۔ کسی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو مار دے لیکن ایسا کرنے والے بھی اذیت ناک حالات سے دوچار ہوجاتے ہیں۔

زندگی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے لیکن جو لوگ زندگی کی قدر نہیں کرتے ان کی دردناک موت ہوتی ہے۔ لیکن سب کو اپنے اپنے انجام کے متعلق بھی سوچنا چاہئے۔ ہر کسی کو ایسا کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے کہ اللہ ایک ہے وہی سزا اور وہی جزا دینے والا ہے۔

اکثر بندے اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اور خود کو عزت اور انا کے لئے ہلکان کر بیٹھتے ہیں اور پھر جو غلطی کرتے ہیں وہ پھر ایسی دردناک سزا پاتے ہیں جیسی نندنی کے گھر والوں نے پائی۔

آسیبی بلی

ایس امتیاز احمد۔کراچی

عورت کی آواز سنائی دی، خدا کے واسطے مجھے اس جگہ سے فوراً باہر لے چلو میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی دھڑکن بند ہوجائے گی اور میں ……

خوف وہراس کے گرداب میں بل کھاتی عجیب وغریب دل پر ہیبت طاری کرتی کہانی

یہ ناقابل فراموش اور عبرتناک حادثہ نورمبرگ کے پرانے قلعہ میں پیش آیا تھا، میں جس زمانے کا ذکر کررہا ہوں، اس زمانے میں نورمبرگ کا یہ پرانا قلعہ سیاحوں کے لیے کچھ زیادہ کشش نہ رکھتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جرمنی کے اس دورافتادہ اور بہت پرانے شہر تک پہنچنے کی سہولتیں کچھ زیادہ نہ تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو دور دراز کا سفر طے کر کے اور سینکڑوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد نورمبرگ پہنچتے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازیوں نے نورمبرگ کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا، اس لیے اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور جب سیر وسیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو پتہ چلا کہ نورمبرگ میں بارہویں صدی عیسوی کی عمارتوں کے آثار موجود ہیں، تو وہ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔

ان دنوں میری شادی ہوئے دو ہی ہفتے گزرے تھے اور ہم میاں بیوی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے ایک روز فرینکفرٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اترے، تو ہماری ملاقات ہوجسپین سے ہوئی وہ خوبصورت نوجوان نہایت باتونی اور مسخرے پن کی حد تک ہنس مکھ امریکی سیاح تھا جس نے جلد ہی ہم سے گہری دوستی کرلی۔ وہ منہ ٹیڑھا کرکے جب تیزی سے انگریزی بولتا، تو میری بیوی کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوجاتا، ہوجسپین کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ اپنی بہادری اور سیاحت کے ایسے ایسے عجیب قصے بیان کرتا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگرچہ مجھے بعد میں احساس ہوگیا کہ وہ جھوٹ بولنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تاہم ایسے ساتھی کی موجودگی ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور وہ تفریح کا بہت عمدہ ذریعہ بن گیا۔

نورمبرگ کا قلعہ دیکھنے کی تجویز بھی اس نے پیش کی تھی اور میری بیوی امیلیا کو ایسی عمارتیں دیکھنے کا از حد شوق تھا فوراً آماہ ہوگئی۔ نورمبرگ دریائے پیگنیز کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک حصہ پرانا شہر کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ نیا شہر۔ پرانا شہر تمام تر قرونِ وسطیٰ کے رومن فن تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے یہاں شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے جس میں چار بڑے دروازے 128 سیڑھیاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ زیادہ تر پہاڑیوں کے اوپر آباد ہے جو شمال سے مغرب کی جانب پھیلتی چلی گئی ہیں اور اسی مقام پر سرخ پتھروں کا بنا ہوا وہ عظیم الشان قلعہ واقع ہے جس کے ایک کمرے میں یہ عبرتناک حادثہ پیش آیا تھا جو میں آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

نورمبرگ کا قدیم قصبہ اس قلعہ سے نیچے آباد ہے۔ چونکہ یہ قلعہ سب سے اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے اس لیے اس کی فصیل سے شہر کا نظارہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ قلعہ کی شمالی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت گہری کھائی ہے جو صدیوں سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسی ہے۔

رومن بادشاہوں کے عہد حکومت میں یہ کھائی جسے دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے یقیناً پانی سے بھری رہتی ہوگی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے آدمی گر کر ہلاک ہوئے ہوں گے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ اکثر مجرموں کو جب اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا، تو اس کے بعد لاشوں کو کھائی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کی گہرائیوں میں گوشت خور مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں پرورش کی گئی تھیں، یہ لاشیں ان مچھلیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔

اس خشک کھائی نے زمین کا بہت سا حصہ گھیر رکھا تھا۔ اس لیے نورمبرگ کے گورنر نے اسے استعمال کرنے کا عجیب طریقہ اختیار کیا۔ اس نے یہاں درختوں اور پودوں کی بہت سی قسمیں لگوادی تھیں اور کہیں کہیں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے قلعہ کی فصیل کے ساتھ ان کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ فصیل سے اس کی گہرائی اندازاً پچاس ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس سے پرانے شہر کے مکانات دکھائی دیتے ہیں جن کی سرخ سرخ ڈھلوان چھتیں تیز دھوپ میں خوب چمکتی ہیں۔ دائیں جانب قلعہ کی فصیل کے ساتھ ہی وہ چھوٹی بڑی برجیاں اور گنبد دور تک پھیلے ہوئے تھے جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے اور انہی کے درمیان ایک بڑے سے گنبد کے نیچے قلعہ کا سب سے اہم کمرہ بنا ہوا تھا جسے خاص طور پر دیکھنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔

یہ وہ کمرہ تھا جو سینکڑوں آدمیوں کی جانیں لے چکا تھا۔ اسی کمرے میں وہ عجیب و غریب مشینیں رکھی ہوتی تھی جن کی مدد سے انسان صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم، اذیت اور عذاب کے طریقے آزماتا چلا آیا ہے۔ یہاں بادشاہ مجرموں کو ایسی ہولناک سزائیں دیتے تھے کہ آج بھی انہیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے پورے قلعے کی سیر کرلیں اور پھر اس ہیبت ناک کمرے کو سب سے آخر میں دیکھیں تاکہ ہماری طبیعتیں یہ ناخوش گوار اثر کم سے کم

قبول کریں۔ اسی دوران میں ہم تینوں ذرا آرام کے لئے فصیل کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جھک کر کھائی میں لگے ہوئے پھولوں کے تختوں اور درختوں کو دیکھنے لگے۔ تیز اور روشن دھوپ میں یہ نظارہ آنکھوں کے لئے بڑا فرحت انگیز اور خوش گوار تھا۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے بڑے بڑے خوشنما قالینوں کی صورت میں ہمارے سامنے جھومنے لگتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت کے بنائے ہوئے ان حسین قالینوں میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ قلعے کی سیر کرتے ہوئے ہم واقعی تھک گئے تھے اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے، مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی جگہ ہوتی بھی تو اس کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھتے بھی کہاں؟ دفعتہً میری بیوی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور ہم نے جھک کر ادھر دیکھا تو ایک دلچسپ تماشا نظر آیا۔

سیاہ رنگ کی ایک بڑی بلی جس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی، فصیل کے عین نیچے دھوپ میں آرام سے لیٹی تھی اور اس کا بچہ جس کا رنگ بھی سیاہ تھا، قریب ہی کھیل رہا تھا۔ بلی اپنی لمبی دم ہلاتی اور بچہ اس کی طرف جھپٹتا، کبھی وہ دم پر پنجہ مارتا اور کبھی اسے اپنے منہ میں دبالیتا اور پھر زور لگا کر اپنی ماں کو گھسیٹنا چاہتا۔ بلی اپنے پاؤں کو جنبش دے کر بچے کو آہستہ سے پرے دھکیل دیتی اور دم زور زور سے ہلانے لگتی۔ اس پر بچہ اور جوش میں آکر اچھلنے کودنے لگتا۔ غالباً اسے اس کھیل میں بڑا مزہ آرہا تھا۔

چند منٹ تک ہم تینوں نہایت دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر یکا یک امریکی نوجوان نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر اٹھایا اور ہنس کر بولا۔

''ذرا دیکھنا میں آپ لوگوں کو ایک اور دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں میں یہ پتھر ان کے قریب پھینکتا ہوں۔ وہ دونوں حیران ہوں گے کہ پتھر کہاں سے آن گرا۔''

''ارے یہ کیا غضب کرتے ہو'' میری بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ وہ ڈر جائیں گے کیوں ان کا مزا کرکرا کرنے کی فکر میں ہو۔''

''مادام، آپ قطعاً نہ گھبرایئے..... یہ کھیل اور دلچسپ بن جائے گا۔''

''اچھا بھئی تمہاری مرضی..... مگر خدا کے لئے ذرا احتیاط سے پتھر پھینکنا، کہیں تم اس پیارے سے ننھے بچے کو زخمی نہ کردو۔''

''اجی آپ خواہ مخواہ ڈرتی ہیں کیا میں بچہ ہوں جو ایسی بے احتیاطی کروں گا۔'' امریکی نوجوان نے گردن ہلا کر کہا۔

''مادام، میں تو ایسا رحم دل آدمی ہوں کہ میں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔''

''لیکن شیر اور چیتے ہلاک کرتا رہا ہوں۔'' میں نے لقمہ دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر پتھر نیچے پھینک دیا۔

آہ..... وہ منحوس لمحہ جب اس امریکی نے پتھر نیچے پھینکا جو کہ مجھے ساری زندگی یاد رہے گا، کیونکہ ہوا کے زور سے وہ وزنی پتھر تیزی سے نیچے گیا اور بلی کے معصوم بچے کے سر پر جا لگا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے بلی کے بچے کا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا۔ چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد وہیں ٹھنڈا ہوگیا۔

اب ہم تینوں آنکھیں پھاڑے بلی کے بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو چند ثانیے پیشتر زندگی اور حسن کا بہترین تصویر تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس غیر متوقع حادثے نے میرے جسم کو بھی سرد کردیا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بے کار ہوگئیں۔ یہی حال میری بیوی اور امریکی نوجوان کا تھا، بلکہ میری بیوی کا تو خوف کے مارے چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔

پتھر گرتے ہی سیاہ بلی نے نظر اٹھا کر ہماری جانب دیکھا۔

خدا کی پناہ..... اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں یک دم انگاروں کی مانند سرخ ہوگئیں اور اس کا جبڑا بھیانک انداز میں کھل گیا..... اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں چہرے پر جمادیں۔

میرے بدن میں دہشت سے تھرتھری چھوٹ گئی اور میری بیوی تو تقریباً غش کھا کر میرے اوپر ہی آن پڑی۔ سیاہ بلی نے پلٹ کر اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا جو جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سر پر سے سرخ سرخ خون کی نکلتی ہوئی پتلی سی دھار نے اس کا سارا جسم لت پت کر دیا تھا۔

بلی کے حلق سے ایک درد ناک چیخ نکلی، وہ اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت محبت سے اپنے مرے ہوئے بچے کا جسم چاٹنے لگی۔ اس کا جبڑا اپنے بچے کے تازہ خون میں بھر گیا اور جب اس نے منہ کھولا، تو اس کے لمبے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھ کر میرا کلیجہ بھی حلق میں آ گیا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن بھی پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اس وقت وہ جوش اور انتقام کا ایسا نمونہ بن گئی تھی کہ بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

چند لمحے تک وہ نہایت غضب آلود اور نفرت انگیز نظروں سے امریکی کو تکتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوڑتی ہوئی آئی اور قلعہ کی پتھریلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے حلق سے اب غراہٹوں اور چیخوں کی دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

بلی کا یہ غیظ و غضب اور نفرت کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ امریکی نوجوان کی بوٹیاں اڑا دے گی۔ اس خوفناک شکل اور غرانے، چیخنے اور سفید دانت دکھانے کا انداز اتنا ڈراؤنا تھا کہ میری بیوی اسے برداشت نہ کر سکی۔ اسے ہوش میں لانا ابھی میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔

بلی بار بار دوڑتی ہوئی آتی اور قلعہ کی سنگین اور غیر ہموار دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی، مگر ہر مرتبہ پیٹھ کے بل نیچے گر جاتی، تاہم اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو کر نیچے گری، تو اپنے مرے ہوئے بچے پر جا پڑی اور بلی کا سارا جسم خون میں لت پت ہو گیا۔

امریکی وہیں کھڑا بلی کی ان حرکات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لئے یہ بھی ایک پرلطف تماشا تھا میں جلدی سے اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا فاصلے پر ایک جگہ سائے میں لے گیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد امیلیا ہوش میں آ گئی، لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔

امیلیا کو وہیں چھوڑ کر جب میں دوبارہ دیوار کے قریب گیا تو چسپن نے کہا۔

''میں نے دنیا میں ایک سے ایک خوفناک درندے دیکھے ہیں، مگر جس وحشی پن کا مظاہرہ سیاہ بلی کر رہی ہے، یہ میرا پہلا مشاہدہ ہے۔'' اس کا غصہ ہر لمحے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح کا ایک اور قصہ بیان کرنے لگا جسے میں نے ڈھنگ سے نہیں سنا، کیونکہ میں بلی کی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ بلی نے پندرہ یا بیس مرتبہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور ایک بار تو وہ کافی اوپر آ گئی تھی کہ پیر پھسل جانے کے باعث دھڑام سے نیچے گری۔ یقیناً اسے سخت چوٹ لگی تھی، لیکن بلی نے اس چوٹ کی کوئی پروا نہ کی اور نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ دوڑتی ہوئی آئی اور دیوار پر چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر امریکی کہنے لگا۔

''اس جانور کی ہمت پر آفرین ہے..... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار پر چڑھ کر ہی دم لے گی، مگر افسوس کہ وہ یہاں کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا تو وہ اس حادثے کو بھول جائے گی..... افسوس..... صد افسوس..... مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ پتھر اس کے بچے کو لگ جائے گا..... یہ حادثہ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے، ورنہ میری نیت اسے ہلاک کرنے کی نہ تھی خیر..... اب جو ہونا تھا ہو گیا..... اس اس بچے میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی۔''

اتنا کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی بلی نے بھی دیوار پر چڑھنے کی کوشش ترک کر دی اور وہیں بیٹھ کر اپنی غضب ناک نظروں سے اوپر دیکھنے لگی۔

پھر وہ مجھے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا،

''کرنل، مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے نے آپ کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ آہ..... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی بیوی نے تو اس کا بہت ہی زیادہ ناگوار اثر قبول کیا ہے۔ مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ اس جگہ جہاں میری بیوی آرام سے لیٹی تھی۔

''مادام..... کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی..... یقین کیجیے اس میں میری کوئی خطا نہ تھی، بلی کے بچے کی قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا تھا..... اب جو ہونا تھا ہو گیا..... اسے فراموش کر دیجیے اور آیئے قلعہ کی باقی چیزیں دیکھ کر ہم جلد از جلد اس منحوس مقام سے رخصت ہوں۔''

ہم تینوں ادھر سے گزرتے ہوئے جب فصیل کے قریب آئے تو غیر ارادی طور پر ہم نے نیچے جھانکا، سیاہ بلی اسی طرح بیٹھی اوپر دیکھ رہی تھی۔ جونہی امریکی کا چہرہ اسے نظر آیا، اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی۔ اس کے دونوں پنجے اس انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے جیسے وہ امریکی کا منہ نوچ لینا چاہتی ہے، مگر وہ حسب معمول پھر نیچے جا پڑی۔ ساٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھنا بلاشبہ بلی کے لیے ایک ناممکن بات تھی۔ امریکی نے اب خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلی کو مخاطب کیا۔

''پیاری بلی..... مجھے معاف کر دو..... میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا..... میں تو دراصل تمہارا کھیل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا..... اب یہ اتفاق تھا کہ پتھر تمہارے بچے کو جا لگا اور وہ مر گیا۔ بخدا اس میں میرا ذرہ برابر بھی قصور نہیں..... اب تم دیوار پر چڑھنے کی کوشش چھوڑ کر بچے کے کفن دفن کا بندوبست کرو جاؤ شاباش۔''

امیلیا ایک بار پھر بلی کو دیکھ کر ڈر کے مارے کانپ گئی اور اس نے نوجوان سے کہا۔

''ہوچسپین، تم اسے مذاق نہ سمجھو۔ بلی کا ارادہ فاسد ہے وہ اگر یہاں ہوتی تو تمہیں ضرور مار ڈالتی..... مجھے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دے رہی ہیں۔'' وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا۔

''مادام..... آپ مجھے شیر دل ہوچسپین کو..... اس حقیر بلی سے ڈراتی ہیں جس نے نہ جانے کتنے درندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ وہ بلی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ میں اب چاہوں تو نیچے جا کر آپ کے سامنے اس کا گلا گھونٹ دوں۔''

بلی نے جب ہوچسپین کا قہقہہ سنا، تو اس میں دفعتہً ایک عجیب تغیر رونما ہوا۔ اس کا سارا جوش و خروش اور غضب ناک لہجہ ختم ہو گیا اور وہ پرسکون دکھائی دینے لگی۔ اس نے پھر ہوچسپین کی طرف ایک بار دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس طرف گئی جہاں س کا بچہ مرا پڑا تھا اور پھر زبان نکال کر بچے کا جسم چاٹنے لگی۔

''واقعی بلی تمہیں دیکھ کر اب ڈر گئی ہے۔ دراصل اس نے تمہاری آواز سن کر اندازہ کر لیا ہو گا کہ یہ شخص تو بہت بڑی بلا ہے۔ اس نے ٹمٹنا آسان کام نہیں۔'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ امیلیا بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑی اور ہم تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔

تھوڑی دور جانے کے بعد جب ہم نے نیچے جھانکا تو، تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سیاہ بلی بھی اسی جانب چلی جا رہی تھی جدھر ہم جا رہے تھی۔ اس نے منہ میں اپنے مردہ بچے کو دبا رکھا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد جب ہم نے دیکھا تو مردہ بچہ اس کے منہ میں نہ تھا۔

بلی نے شاید اسے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ اسے پراسرار انداز میں تعاقب کرتے دیکھ کر امیلیا پر پھر خوف طاری ہونے لگا اور اس نے امریکی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی، مگر وہ بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا۔

''مادام، آپ کو اس بلی سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آتی ہے۔ تو آنے دیجیے بھلا وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اور فرض کیجیے اگر اس کا ارادہ مجھے نقصان پہنچانے کا ہے تو میں ابھی آپ کے سامنے اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی

کمر سے بندھا ہوا پستول نکالنا چاہا۔

''زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نہ کہ ایک بلی کو مارنے کے جرم میں چند منٹ کے لئے پولیس مجھے پکڑ لے گی، وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے سے تو رہے۔''

امیلیا نے اسے پستول نکالنے سے روکا، ورنہ وہ ضرور بلی پر گولی چلا دیتا۔

ہوچسپین نے ایک بار پھر نیچے جھانکا، تو بلی اسے دیکھ کر غرائی اور پھر جلدی سے ایک پتھر کی آڑ میں ہوگئی۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچسپین کے مہلک ارادے کا پتہ چل گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچسپین نے فخریہ انداز میں امیلیا کی جانب دیکھا اور کہا۔

''دیکھا مادام آپ نے؟ یہ شریر بلی اب مجھ سے ڈرنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے لوٹ کر اپنے مردہ بچے کی حفاظت کرنی چاہیے، کہیں دوسری بلیاں اسے ہڑپ نہ کرلیں جاؤ خالہ بلی، یہاں سے ٹل جاؤ، ورنہ میرا پستول خواہ مخواہ چل جائے گا۔

امیلیا نے جلدی سے ہوچسپین کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر آگے لے گئی لیکن جاتے جاتے بھی امریکی نوجوان نے نیچے جھانک کر بلی سے چند مزاحیہ فقرے کہہ ہی دیے۔

''اچھا الوداع..... خالہ بلی..... میں تم سے معذرت کر چکا ہوں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا، مگر تم ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ بہرحال تم اب اس حادثے کو فوراً ہی فراموش کردو۔''

جلد ہی قلعہ کی اندرونی دلچسپیوں اور عجائبات کو دیکھنے میں ہم اس قدر محو ہوگئے کہ تھوڑی دیر پہلے جس ناخوشگوار حادثے نے ہمیں مکدر کر دیا تھا، اس کی یاد بھی باقی نہ رہی۔

پھرتے پھراتے آخر کار ہم قلعہ کی سب سے زیادہ مشہور اور ہیبت ناک جگہ پر پہنچ ہی گئے جہاں نو سو سال پیشتر مجرموں اور جاسوسوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

اس وسیع و عریض کمرے کے عمر رسیدہ چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصا خوش نظر آتا تھا، کیونکہ چوکیدار کی بالائی آمدنی کا ذریعہ سیاحوں کی دی ہوئی بخشش ہی ہوتی ہے، اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہماری جانب توجہ دے رہا تھا۔ وہ عرصہ دراز سے اس کمرے کا چوکیدار تھا اور یہاں رکھی ہوئی ہر شے کے متعلق اس کی معلومات حیران کن تھیں۔

جب ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے، تو ماحول کی تاریکی اور اس میں رکھی ہوئی عجیب اور پراسرار مشینوں اور ہتھیاروں نے ہمارے اعصاب پر برا اثر ڈالا۔ یہ گنبد نما کمرہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اوپر کے حصے میں جانے کے لئے چند سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہم نے پہلے نچلے کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس کی دیواریں بہت چوڑی اور موٹی تھیں اور کمرے میں اوپر کی جانب کوئی روشندان نہ ہونے کے باعث روشنی اور ہوا آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور جا بجا مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تان رکھے تھے جنہیں صاف کرنے کا خیال شاید منتظمین کو بھی نہ آیا۔

ہم نے جب غور سے ان دیواروں کا معائنہ کیا، تو ان پر بڑے بڑے۔ یا دہ دھبے صدیوں پرانے تھے اور یہ خون ان لوگوں کا ہے جن کو کسی جرم یا جاسوسی کے شک میں پکڑ کر اذیتیں دی جاتی تھیں چند ہی لمحے بعد ہمیں احساس ہونے لگا کہ اس بھیانک کمرے کی دیواریں زندہ ہو رہی ہیں اور ان کے اندر سے ہمیں ان بدنصیب لوگوں کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

امیلیا کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے ماحول سے ڈر رہی ہے، لیکن میری خاطر وہ بظاہر بڑی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے آدمیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی داستانیں ان خونی دیواروں میں پوشیدہ تھیں۔

ہم بہت جلد گھبرا کر اس وحشت ناک جگہ سے

نکل آئے۔ چوکیدار اب ہمیں اوپر کی سیڑھیوں کے ذریعے دوسرے کمرے میں لے جارہا تھا۔

جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، دہشت کی ایک نئی لہر ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ امیلیا نے میرا بازو سختی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور خود یہ حال تھا کہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کمرے کا ماحول نچلے کمرے کے ماحول سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک تھا۔ اس کی ہر شے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہی تھی اور ہم نے ان اذیت دینے والی مشینوں اور دیواروں پر لگے ہوئے سینکڑوں قسم کے ہتھیاروں کے قہقہوں کی آوازیں بھی سنیں۔

بوڑھے چوکیدار نے فوراً محسوس کرلیا کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے ایک موم بتی جلائی جس کی مدھم کانپتی ہوئی روشنی وسیع و عریض کمرے میں پھیل گئی۔ اب ہم آسانی سے یہاں رکھی ہوئی چیزوں کو پہچان سکتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی تلواریں، کلہاڑے، نیزے اور خنجر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر تلواریں اور کلہاڑیاں اتنی بڑی اور وزنی تھیں کہ جنہیں اٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ غالباً ان گرانڈیل حبشی جلادوں کے استعمال میں آتی تھیں جنہیں خاص طور پر مجرموں کی گردن مارنے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔ ان ہتھیاروں کے قریب ہی پرانی سیاہ لکڑی کے بہت بڑے بڑے کندے بھی پڑے دکھائی دیے جن پر جا بجا کسی روغن کے دھبے جمے ہوئے تھے۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ لکڑی کے یہ وہ کندے ہیں جن پر مجرموں کو لٹا کر ان کی گردن کاٹی جاتی تھی۔ ہم نے جھک کر ان کندوں پر تلواروں کے گہرے نشان بھی دیکھے۔ کمرے کے ایک حصے میں وہ تمام چھوٹی بڑی مشینیں یکجا رکھی تھیں جو مجرموں اور جاسوسوں کو اذیت پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہوتی تھی۔ یہاں ہم نے ایک کرسی دیکھی جس کی نشست پر لوہے کی لمبی لمبی اور نہایت تیز نوکیلی سلاخیں لگی تھیں۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ یہ موت کی کرسی ہے، اس پر مجرم کو بٹھا دیا جاتا تھا اور یہ سلاخیں اس کے گوشت میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ ایسا مجرم کئی کئی دن جان کنی کی حالت میں مبتلا رہنے کے بعد مرتا تھا۔

اس کرسی کے علاوہ متعدد قسم کے شکنجے بھی موجود تھے جن میں انسانی جسم کو کس طرح جکڑا جا سکتا ہے کہ ذرا بھی جنبش نہ کر سکے۔ لوہے کی چھوٹی بڑی پیٹیاں لوہے کے جوتے، سر اور گردن کو جکڑنے والے شکنجے اور آہنی خول جو بھیجے کو کھوپڑی سے باہر نکال سکتے تھے۔ کمرے میں گھومتے ہوئے ہم ایک بڑی آہنی مشین کے قریب پہنچے جس کی عجیب و غریب ساخت نے امریکی نوجوان کو بہت متاثر کیا، جو ایک عورت کے مجسمے سے مشابہ تھی اور اس میں زنگ لگا ہوا تھا۔ اس کے عین وسط میں کچھ اوپر اٹھا ایک بڑا سا آہنی کڑا تھا۔ جس میں موٹا سا رسا بندھا تھا۔ اس رسے کا دوسرا سرا ایک ستون سے بندھا ہوا تھا۔ چوکیدار نے بتایا کہ اس مشین کو ''آئرن ورجن'' کہتے ہیں اور مجرم کو ہلاک کرنے کے لئے اس مشین سے زیادہ بہتر کوئی مشین نہیں۔ آپ اسے غور سے دیکھیے، یہ برسوں تک خون میں نہا چکی ہے۔ اور اب بھی اس کے ایک حصے پر خون کی جمی ہوئی تہہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔

چوکیدار نے ستون سے بندھا ہوا موٹا رسا کھولا اور قوت سے اسے کھینچنے لگا۔ اب ہم نے حیرت سے اس مشین کی اوپر بنا ہوا ایک چھوٹا سا دروازہ گڑگڑاہٹ سی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگا۔ یہ آہنی دروازہ بہت بھاری تھا۔ کیونکہ اسے کھینچتے ہوئے بوڑھا چوکیدار جلد ہی ہانپنے لگا، تاہم اس نے دروازہ پوری طرح اوپر اٹھا دیا جس پر بہت سی نوکدار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہمیں مشین کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ آہنی دروازہ اٹھنے کے بعد مشین کے اندر اتنی جگہ تھی جس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا، اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مشین کس کام آتی تھی۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس مشین کے اندر خالی جگہ میں لٹا دیا جاتا تھا اور لوہے کے اس سلاخ دار دروازے کو آہستہ آہستہ نیچے گرایا جاتا۔ بدنصیب قیدی جب ان خوش آشام سلاخوں کو اپنی آنکھوں اور جسم کی طرف بڑھتے دیکھتا، تو موت کے لرزہ خیز خوف سے جرم کا اقبال کر لیتا اور سارے راز اگل دیتا،

لیکن بعض ایسے جرم بھی تھے جو اس حالت میں بھی زبان نہ کھولتے، تو رسے کو فوراً چھوڑ دیا جاتا اور یہ آہنی دروازہ پوری قوت سے نیچے گر جاتا اور سلاخیں قیدی کے تمام جسم میں پیوست ہو جاتیں اور وہ آناً فاناً موت سے ہمکنار ہو جاتا۔

امیلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔

''خدا کے واسطے مجھے اس منحوس جگہ سے فوراً لے چلو۔ میں یہاں اب ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔''

میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ ''ہم تو صرف یہاں کے عجائبات دیکھنے آئے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ وہ کیا خیال کرے گا۔'' میں اسے سمجھا بجھا کر جب واپس کمرے میں لایا، تو امریکی نوجوان اس مشین کے پاس کھڑا اس کا بغور معائنہ کر رہا تھا، مجھے آتے دیکھ کر بولا۔

''آپ کی بیوی بہت کمزور دل کی خاتون ہیں۔ بلاشبہ انہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کی غیر حاضری میں اس مشین کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں چوکیدار سے معلوم کی ہیں۔ میں نے اپنے ملک کے ریڈ انڈین باشندوں کے متعلق بڑی بڑی داستانیں سنی تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو عجیب عجیب سزائیں دیتے تھے، مگر یہ مشین بے مثال ہے۔ خدا کی پناہ..... مجھے تو اس کی تصور ہی سے اذیت ہوتی ہے۔ لیکن میں اپنا تجربہ مکمل کر کے ہی واپس جاؤں گا۔''

''کیا کہتے ہو کیسا تجربہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

''یہی معمولی سا تجربہ..... میں خود کو ایک منٹ کے لیے اس مشین کے اندر لیٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوہے کا یہ سلاخ دار دروازہ کس طرح آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے۔''

''نہیں، نہیں۔'' امیلیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ خدا کے واسطے چسپین ایسا نہ کرنا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

''آپ جو چاہیں سمجھیں۔ مگر میں یہ تجربہ کر کے رہوں گا۔'' ہو چسپین نے اصرار کیا۔

''اگر آپ ڈرتی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چہل قدمی کیجئے میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں، نہ جانے اب تک کیسے کیسے واقعات مجھ پر بیت چکے ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ مونٹانا کے جنگل سے میں گزر رہا تھا کہ دشمنو نے مجھے مار ڈالنے کے لیے جنگل میں آگ لگا دی۔ میں رات بھر ایک مرے ہوئے گھوڑے کے اندر چھپا رہا، تب جان بچی۔ اسی طرح نیو میکسیکو میں مجھے سونے کی ایک کان میں جو حادثہ پیش آیا، وہ بڑا خوفناک تھا۔ دو روز تک میں ایک غار میں قید رہا جس کے دروازے پر ایک بڑا پتھر آن گرا تھا۔ غور کیجئے جب ایسے ایسے عظیم حادثوں سے میں بچ گیا تو اس دو منٹ کے تجربے سے کیا قیامت برپا ہو جائے گی۔''

میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہٹ کا پکا ہے اور یہ کام ضرور کر گزرے گا تو کہا۔

''اچھا..... اچھا..... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو..... ہم اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہوئی ہے۔''

امریکی نے مسخرے پن سے مجھے سیلوٹ کیا اور کہنے لگا۔

''جو حکم جناب کا..... بس ابھی فارغ ہوا جاتا ہوں.....''

پھر وہ چوکیدار سے مخاطب ہوا جو امریکی نوجوان کے اس خطرناک تجربے میں مدد دینے پر راضی نہ ہوتا تھا۔

''بڑے میاں تم بھی ڈر گئے؟ یہ لو اپنی جیب گرم کرو۔'' ہوچسپین نے سونے کا ایک سکہ بوڑھے کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔

''اب لپک کے ایک رسی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس مشین میں مجھے لٹا دو تاکہ میں اس تجربے کا وہی مزا پا سکوں جو پرانے زمانے کے مجرموں کو ملتا تھا۔''

بوڑھے چوکیدار کو پہلی مرتبہ اس معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

''جناب، آپ یہ حرکت نہ کریں..... اس میں جان کا خطرہ ہے۔ فرض کیجئے اگر رسا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو.....؟''

امریکی نے جوش میں آ کر کہا۔ ''بڑے میاں تمہیں زیادہ دیر تک رسا پکڑنا نہیں پڑے گا، بس ایک یا دو منٹ کا کام ہے۔ اس کے بعد میرا دوست مجھے مشین سے باہر نکال لے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اس تجربے کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ کہو تو تحریر لکھ دے دوں؟''

''اچھا صاحب جس طرح آپ کہتے ہیں کرتا ہوں، مگر براہ کرم باہر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا ورنہ میری ملازمت جاتی رہے گی، روزی کا معاملہ ہے صاحب۔''

''اجی تم پروانہ کرو..... ذرا جلدی سے رسی تلاش کرو۔''

چوکیدار باہر گیا اور پتلی رسی کے دو لمبے لمبے ٹکڑے لے کر آیا اور پہلے اس نے ہوچسپین کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے اور پیر باندھنے والا تھا کہ ہوچسپین نے کہا۔

''بڑے میاں، ذرا ٹھہرو، تمہاری دعا سے میں کافی صحت مند ہوں۔ تم مجھے اٹھا کر اس مشین کے اندر لٹا نہیں سکو گے، اس لیے میں خود اس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بعد ازاں تم میرے پیر بھی باندھ دینا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور مشین کے اندر داخل ہو کر اس اطمینان سے لیٹ گیا جیسے کسی آرام دہ بستر پر سونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ چوکیدار نے جلدی سے اس کی دونوں ٹانگیں باندھ دیں۔

ہوچسپین اب موت کی اس مشین میں بالکل بے بس پڑا تھا، لیکن خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے پر ظاہر نہ ہوئی، بلکہ وہ بچوں کی طرح اس کارنامے پر خوش ہو رہا تھا۔

''واہ واہ..... کیا شاندار جگہ ہے..... بھئی میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس مشین کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں بڑی آرام دہ چیز ہے..... اچھا بڑے میاں، اب تم اس آہنی دروازے کو ذرا ڈھیل سے آہستہ آہستہ نیچے اتارو، میں دیکھوں تو سہی کہ جب یہ سلاخیں میری جانب بڑھیں گی، تو کیا مزا آتا ہے۔''

''اوہ..... خدا رحم کرے..... ہوچسپین، کیا تم اس بے ہودہ مذاق سے باز نہیں آ سکتے؟ میری بیوی چلا اٹھی بس کافی ہے..... تمہارا تجربہ مکمل ہو گیا..... اب باہر آ جاؤ.....''

ہوچسپین نے قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہنے لگا۔ ''کرنل صاحب مہربانی کر کے اپنی ڈرپوک بیگم کو ذرا باہر گھمانے لے جایئے..... غضب خدا کا میں آٹھ ہزار میل کا سفر طے کر کے محض اس مشین کی خاطر آیا ہوں اور اب اس کے اصل تجربے سے محروم ہی چلا جاؤں؟ ہرگز نہیں ہو سکتا..... آپ پانچ دس منٹ ان کو سیر کرائیے اتنی میں یہ تجربہ پورا ہو چکے گا۔ پھر ہم اسے یاد کر کے خوب ہنسیں گے۔''

امیلیا کی حالت اگرچہ ابتر ہو رہی تھی، مگر وہ کمرے سے باہر جانے پر تیار نہ تھی۔ وہ خاموشی سے میرا بازو پکڑے ہوچسپین کی طرف تکتی رہی۔ بوڑھا چوکیدار آہستہ آہستہ، ایک ایک انچ کر کے رسا چھوڑنے لگا اور آہنی دروازہ مشین کی طرف جھکتا گیا۔

ہوچسپین کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا، اس کی آنکھیں لمبی نوک دار سلاخوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یکا یک وہ کہنے لگا۔

''کرنل، سچ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اتنا لطف میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھایا۔ بخدا تم بھی اس تجربے کو آزما کر دیکھو۔ ارے بڑے میاں، ذرا آہستہ۔ تم تو ایک دم رسا چھوڑ دینے پر تلے ہوئے ہو؟''

بوڑھے چوکیدار نے رسا پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ منٹ کے قلیل عرصے میں آہنی دروازہ صرف تین انچ کے قریب جھک سکا تھا۔

دفعتاً میں نے اپنے بازو پر ایک تھرتھراہٹ سی محسوس کی۔ امیلیا کی انگلیوں کی گرفت نرم پڑ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کی مانند زرد ہو رہا تھا اور ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مشین کی جانب گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا، تو دہشت سے میری رگوں کا خون جم گیا۔

خدا کی پناہ۔

وہی منحوس کالی بلی کمرے کے دروازے میں کھڑی مشین کی جانب دیکھ کر غرا رہی تھی۔ اس کی زرد آنکھیں مشعل کی مانند روشن تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا اور اپنی معمولی جسامت سے دوگنی نظر آتی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا خون آلود جبڑا کھول کر آگے بڑھی۔

ہوچسپین نے بھی اس کی آواز سن لی تھی وہ وہیں سے چلایا۔

''کرنل ذرا اس شریر کو دھتکار کر نکال دو۔''

لیکن آہ..... اس سے پیشتر کہ میں آگے بڑھتا بلی نے اپنی لمبی دم کو گردش دی اور بجلی کی مانند اچھل کر بوڑھے چوکیدار پر حملہ کیا۔ بلی کا دایاں پنجہ چوکیدار کی آنکھ پر پڑا اور آنکھ باہر آ گئی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلی، وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور موٹا رسا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

میں نے رسے کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ میری انگلیوں نے اسے چھولیا، مگر اگلے ہی لمحے رسا کڑے میں سے گزر چکا تھا۔

بدنصیب ہوچسپین کے چہرے کی آخری جھلک میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا موت کے خوف سے اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں تارہ بن گئی تھیں۔

آہنی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ ہوچسپین کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اسی لمحے میری بیوی غش کھا کر دھڑام سے فرش پر گر گئی۔

میں نے امیلیا کو وہاں سے اٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں لے جا کر ایک بنچ پر ڈال دیا۔ اس وقت میرے ہوش وحواس بھی گم تھے۔

امریکی نوجوان کی بھیانک موت کا تصور خود میرے لیے جان لیوا تھا۔

جب میں کمرے میں گیا، تو بوڑھا چوکیدار تکلیف کی شدت سے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے میں نے رسا پکڑ کر پوری قوت سے مشین کا آہنی دروازہ اٹھایا۔ ہوچسپین کا حال دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ لوہے کی سلاخیں اس کی کھوپڑی، سینے اور پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔

دروازہ اوپر اٹھتے ہی ہوچسپین کا مردہ اور مسخ شدہ جسم پرشور آواز کے ساتھ کمرے کے فرش پر گرا اور وہ منحوس سیاہ بلی جو ابھی تک موجود تھی، اس کی جانب لپکی اور ہوچسپین کے جسم سے نکلے ہوئے خون کو بڑی رغبت سے چاٹنے لگی۔ اور میں نے جھپٹ کر وہاں رکھی ہوئی بہت سی تلواروں میں سے ایک تلوار اٹھائی اور بلی کے دو ٹکڑے کر دیے۔

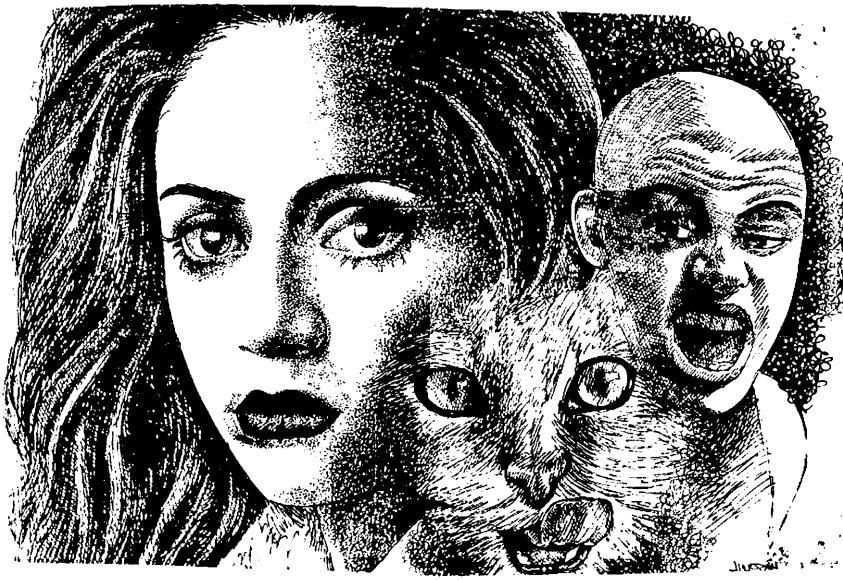

خونخوار بلیاں

مرزا صہیب اکرام-لاہور

کمرے میں لاتعداد بلیاں کسی انسانی جسم کو جو تڑپ رہا تھا نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں اور اس دوران جو چھینا جھپٹی کی وجہ سے جو تصادم ہو رہا تھا اس سے دماغ پھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی دہشت ناک خوفناک کہانی

وقت ایسے بھاگتا ہے کہ انسان کو گمان گزرتا ہے جیسے اس کے اعمال کہیں بہت پیچھے رہ گئے ہیں، لیکن کرم کبھی پیچھے نہیں رہتے، بلکہ وہ ایسے سامنے آجاتے ہیں جیسے کبھی دور ہوہی نا ہوں۔ انسان جب سب بھلا کر یا بھول کر راہوں کو ہی بدل چکا ہوتا ہے تب اچانک اس کے سامنے اس کا ماضی ایسے سامنے آجاتا ہے جیسے وہ مدت سے اسی کھوج میں ہو۔

فیصل کو تو کب کا بھول چکا تھا کہ اس نے بچپن میں کس کس طرح بچوں کو بھوت، جن، چڑیل اور روحوں کے قصوں سے ڈرایا کرتا تھا۔ اس کو ہمیشہ دوسروں کو خوف زدہ پریشان کر کے سکون ملتا تھا، اس کی یہ عادت آج تک تھی۔

اس دن اس کو گاؤں جانا پڑا یا قسمت اس کو لے گئی یہ کوئی نہیں جانتا۔ حادثات کب ہوتے ہیں کون

جانتا۔ وہ پہنچا تو اسے کیا معلوم تھا کہ آج اس کو حویلی میں رہنا بھی اکیلے ہی ہے۔ اس کی عمر اب چوبیس سال تھی۔ ڈر نام کی چیز تو اس کے لاشعور میں بھی کہیں نہیں تھی۔

ملازم کھانا دے کر کب کا جا رہا تھا۔ گاؤں کی رات ٹھنڈی طویل اور ہمیشہ پرسکون ہوا کرتی ہے۔ اس نے وقت گزاری کے لئے ٹیلی ویژن چلایا۔ اسے اپنے بچپن نے ایام یاد آ رہے تھے کہ کیسے کیسے شرارت کی جاتی تھی۔ فلم شروع ہو چکی تھی اور فلم بھی ڈر خوف اور دہشت سے بھری، فلم کی کہانی تین دوستوں کی کہانی تھی جو ویران رات میں ایک کھنڈر میں رات بسر کرتے ہوئے چند نامعلوم بلاؤں کا شکار بن جاتے ہیں۔ ان تین میں سے ایک دوست بار بار اس بات کا اظہار بھی کرتا ہے کہ اس جگہ پر کچھ منحوسیت ہے اس لئے جگہ چھوڑ دیں پر اس کی سنی نہیں جاتی، اور وہ ایک ایک کر کے موت کے منہ میں جاتے ہیں۔

فیصل کو اپنے بچپن کا واقعہ یاد آ گیا جب اسی حویلی میں ایک کزن کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے بچا تھا۔ اس کی کمزور طبیعت کا بہانہ بنا کر اس کو ایسا ڈرایا گیا تھا کہ وہ تاعمر اس صدمہ سے ابھر نہیں پایا تھا۔

فیصل فلم کے آخری لمحات سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اچانک بجلی بند ہو گئی، اس نے غصے میں ریموٹ پھینکا۔

اب وہ اندھیرے کے پار دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ فلم کے منظر اس کی آنکھوں میں گھوم رہے تھے۔ جب اچانک اس نے شور سنا جیسے سینکڑوں بلیاں صحن میں لڑ پڑی ہوں، آوازیں اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں، اس نے ٹارچ اٹھائی اور صحن کی جانب چل پڑا۔ وہ تھوڑا حیران تھا کہ آخر اتنی بلیاں آئی کہاں سے۔

صحن کی جانب کھلتے دروازے سے وہ صحن میں داخل ہوا تو وہاں تو نا بلی تھی نا آواز، ایسا لامتناہی سناٹا تھا جیسے یہ جگہ صدیوں سے کسی قبرستان کا حصہ ہو، وہ ابھی شش و پنج میں مبتلا حالات پر غور کر رہا تھا جب اس کو اپنے پیچھے سے ہزاروں بلیوں کو غراہٹیں سنائی دیں، وہ جلدی سے مڑا مگر آواز کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہ تھا، آوازیں کمروں سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے موٹا ڈنڈا ہاتھ میں تھاما اور کمرے کی جانب چل پڑا، آوازوں کے تعاقب میں وہ چلتا چلتا آخری کمرے تک جا پہنچا، جاتے ہی فیصل نے کمال ہمت کا مظاہرہ کیا اور دروازے کو ٹھوکر مار کر کھولا اور جلدی سے اندر داخل ہو کر ڈنڈا گھما دیا اسے لگا جیسے اس کا ڈنڈا بہت ساری چیزوں سے ٹکرایا ہو، کمرے میں ایسا شور گونجا جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو، فیصل نے جلدی سے ٹارچ جلائی، جیسے ہی اس نے روشنی کا دھارا کمرے کے وسط میں مارا اس کی چیخیں نکل گئیں۔

کمرے میں لاتعداد بلیاں کسی انسانی جسم کو جو تڑپ رہا تھا کو نوچ نوچ کر کھا رہی تھیں اور اس کو کھانے کے دوران چھینا جھپٹی کی وجہ سے جو تصادم ہو رہا تھا اس سے شور برپا ہو رہا تھا۔

اچانک تمام بلیوں نے پلٹ کر خون خوار نظروں سے فیصل کی جانب دیکھا ان کے منہ سے گوشت کے لوتھڑے اور خون کی بوندیں گر رہی تھیں۔ فیصل کے ہاتھ سے ٹارچ کب گری اور وہ کب بھاگا اس کو معلوم نا ہوا، اس کے اپنے پیچھے بہت شور سنائی دیا لیکن پھر آہستہ آہستہ مکمل خاموشی چھا گئی، اس کے ذہن سے لمبے بالوں والی کالی بلی اور اس کی چمک دار آنکھیں محو نہیں ہو رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں سینکڑوں بلیوں میں وہ ایک چہرہ اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا، اس کو بلی کا خون سے بھیگا چہرہ اور غراہٹ اپنی ہڈیوں میں دھنستی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے پاس اب روشنی کا انتظام بھی نہیں تھا اور وہ انجانے خوف سے کانپ رہا تھا اس نے سوچا اس کو فوری اپنے کمرے کا رخ کر کے خود کو بند کر لینا چاہیے کہیں بلیاں اس کے پیچھے ہی نا آ جائیں۔

اس نے بھاگ کر اپنے کمرے میں پناہ لی جو حویلی کے اوپری حصہ میں تھا۔ سیڑھیاں چڑھنا اس کے

لئے آج بھی بچوں کا کھیل تھا وہ یہاں پلا بڑھا تھا اس کو حویلی کا چپہ چپہ ازبر تھا۔

کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے جب نیچے جھانکا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔ حویلی کے وسطی کمرہ میں جس میں تمام کمروں کے دروازے اور اوپری راستہ بھی تھا وہاں پر خون ریز تصادم جاری تھا۔ بلیاں ایک دوسرے کو نوچ رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سب ایک دوسرے کو پھاڑ کھانا چاہتی ہوں۔ اس وحشت ناک منظر کی تاب نالاتے ہوئے فیصل بھاگ کر کمرے میں چلا گیا اور خود کو بند کرلیا۔ باہر سے بلند ہوتی کریہہ آوازیں کمرے کے سکوت میں خلل ڈال رہی تھیں۔ وہ ان سب کو بھلا دینا چاہتا تھا پر اس کے بس میں اب تھا کیا۔ جب ایک دم دروازہ ایسے پیٹا جانے لگا جیسے ننھے ننھے جسم دور سے آ کر اس سے ٹکرا رہے ہوں۔ فیصل کے انگ انگ سے پسینے چھوٹ رہے تھے موسم کی سردی کا اثر تو کب سے زائل ہو چکا تھا۔

باہر بڑھتا ہوا شور آہستہ ہونے لگا پھر یوں محسوس ہوا جیسے ایک سوئی بھی زمین بھی گرے تو وہ پہاڑ گرنے جتنی آواز پیدا کرے گی۔ فیصل کی سانسوں کی آواز اور دل کی بلند دھک دھک سے کمرے کے خاموش اور پر سکون ماحول میں عجیب سا ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔

وہ جا کر سیدھا بیڈ پر گرا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا اس کی ہمت حوصلہ اور سوچنے سمجھنے کی طاقت آہستہ آہستہ کمزور پڑ رہی تھی۔

وہ بس سانس لے رہا تھا اس کی عقل ماؤف ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو گھسیٹ کر بیڈ پر کیا اور بے جان ہو کر لیٹ گیا۔ اس کی حالت جب درست ہوئی اس نے حالات پر غور کرنا شروع کیا مگر اس کو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فیصل کو اپنے علاوہ کمرے میں کسی کی موجودگی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔

اس نے لیٹے لیٹے سائیڈ لی اچانک لائٹ آ گئی اور اس کے بعد اس نے جو منظر دیکھا اس کی جان نکل گئی سامنے ایک ادھڑی ہوئی بلی پڑی تھی جس کو جگہ جگہ سے نوچا گیا تھا۔ یہ وہی کالی بلی تھی جس کی آنکھوں میں اس نے اپنے لئے شدید نفرت دیکھی تھی لیکن اب بلی کی جسامت اس کے قد سے بھی بڑی تھی۔

اس کے برابر لیٹا ہوا اس کی جانب سائیڈ بدل رہا تھا۔ جب یہ منحوس منظر اس کو دیکھنا پڑا۔

اچانک بلی کے حلق سے غوں غوں جیسی آوازیں نکلنے لگی۔ اس سے قبل فیصل کوئی فیصلہ کر پاتا بلی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جیسے فیصل نے آ کر اس کے آرام میں خلل ڈالا ہو۔

فیصل نے بچی کھچی ہمت کو یکجا کیا اور اُٹھ کر بھاگنا چاہا، اسے ٹھوکر لگی اور زمین پر گرا۔ اس نے اپنے سر سے شائیں کی آواز سنی۔ جب اٹھا تو دروازے میں

حکمت عملی

''میری بیوی بہت ہی غصے والی اور جھگڑالو ہے۔ اس کے سامنے میری ایک نہیں چلتی۔'' عرفان نے اپنی بیوی کا دُکھڑا اپنے ہم زلف کو سناتے ہوئے کہا۔

''میری بیوی بھی بہت غصے والی تھی لیکن اب نہیں۔'' ہم زلف نے جواب دیا۔

عرفان نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''بھئی ایک روز جب وہ غصے سے اُبل رہی تھی، تو میں نے کہہ دیا، یہ سب بڑھاپے کی علامت ہے، کیونکہ بوڑھے لوگ چڑچڑے ہو جاتے ہیں، اب میری بیوی کو کبھی غصہ نہیں آتا۔'' ہم زلف نے وضاحت کی۔

(ارمان ملک۔ ٹنڈو آدم)

خون آلود خنجر دیکھا۔

اس نے دروازہ کھولا اور بس بھاگ نکلا۔ نکلتے وقت اس کو یاد آیا کہ نیچے تو آدم خور بلیاں ہوں گی۔ پر قسمت مہربان تھی نیچے سے سب غائب تھا۔

گھبراتا گھبراتا فیصل نیچے آیا۔ اس کے اندر سے اب ہر قسم کے جذبات ختم ہو چکے تھے بس وہ یہاں سے بچ نکلنا چاہتا تھا۔ بجلی آنے کی صورت میں وہ ہر چیز صاف دیکھ سکتا تھا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ اس کو حویلی چھوڑ دینی چاہیے لیکن باہر کیا حالات ہوں وہ نہیں جانتا تھا۔ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ اچانک اوپری منزل پر شور بلند ہوا جیسے بہت سے افراد لڑ پڑے ہوں۔ چیزیں گرنے اور ٹوٹنے کی آوازیں دھڑا دھڑ آ رہی تھیں۔ اس نے اوپر سے مختلف سامان نیچے گرتے دیکھا۔ وہ جلدی سے ایک پلر کے پیچھے چھپ گیا اور اوپر کی جانب دیکھنے لگا۔ اس کو کسی وزنی چیز کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہا ہو۔ اس نے جھانک کر دیکھنا چاہا پر اس کی ہمت جواب دے گئی، اس نے پلر کو مضبوطی سے تھام لیا لیکن یہ عارضی ثابت ہوا جب اس نے محسوس کیا کہ پلر جگہ چھوڑ رہا ہے وہ جلدی سے چند قدم پیچھے ہٹا لیکن اس وقت قدموں کی چاپ اس کو بالکل پاس محسوس ہو رہی تھی، وہ کچھ دیکھ پاتا اس سے قبل پلر ٹوٹ کر آگے جا گرا اس کے بعد ہال بھیانک چیخوں سے گونجنے لگا۔ ایسے جیسے وہ چیز اس وزنی پلر کے نیچے آ گئی ہو۔

اس کے بعد دھڑا دھڑ تمام پلر ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ وہ سرپٹ بھاگا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ اس گرتی عمارت سے نکل جائے لیکن اس کا مقدر کہ تمام ملبہ اس پر آن گرا۔ اس کے بعد گلوں میں روشنی نہ رہی۔

اس کے آخری احساسات یہی تھے کہ میں بس ختم ہو گیا ہوں۔

کسی کے جھنجھوڑنے پر فیصل کی آنکھ کھلی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ مم مم میں مر گیا۔ وہ بلی وہ چھت وہ سب ختم ہو گیا۔ وہ اونچی اونچی چیخ رہا تھا۔

صاحب جی آپ ٹھیک ہیں۔ آپ یہ فرش پر کیوں سو رہے ہو اور حویلی کے دروازے بھی رات بند کرنا بھول گئے آپ۔ فیصل نے ہوش سنبھال کر جائزہ لیا وہ بڑے کمرے میں دروازے کے پاس زمین پر لیٹا ہوا تھا اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سب کچھ دیکھا سب سلامت تھا۔

ملازم نے سہارا دے کر اس کو صوفہ پر بیٹھایا۔ اور خود ناشتہ بنانے چلا گیا۔

فیصل کے ذہن میں سوال ہی سوال تھے پر جواب کون دیتا۔ ناشتے کے دوران بھی وہ چپ رہا۔ ملازم نے اچانک آ کر کہا۔ ''صاحب جی آپ رات حویلی کے دروازے بند کرنا بھول گئے۔ اندر بلیوں نے گند مچایا ہوا ہے ہر طرف بال ہی بال بکھرے ہوئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے بلیاں ایک دوسرے کو ادھیڑ رہی تھیں۔ صاحب آپ کی آنکھ نہیں کھلی جب بلیوں نے اتنا گند مچایا رات کو۔''

فیصل خاموش رہا۔ اس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ بس واپسی کا سوچ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم نے آ کر جب اس کی خاموشی کا سحر توڑا۔

صاحب جی، بڑے صاحب کا فون آیا ہے ابھی وہ کہہ رہے ہیں آپ کو آج بھی گاؤں میں رکنا ہے وہ کل آ رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر ملازم چلا گیا۔

فیصل پھٹی پھٹی نظروں سے اوپری منزل کی جانب دیکھ رہا تھا۔

جب اچانک اس کو دو گھورتی آنکھیں نظر آئیں۔ وہ یہ آنکھیں فوری پہچان گیا یہ رات والی منحوس بلی کی مسکراتی ہولناک آنکھیں تھیں جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ رات کو پھر ملاقات ہوگی۔

اندھیری رات کا مسافر

ضرغام محمود۔ کراچی

رات میں نوجوان نے جھونپڑی کے پاس پہنچ کر آواز لگائی تو کچھ دیر بعد ایک بوڑھا نکلا اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی جس کی روشنی میں بوڑھا عجیب الخلقت نظر آرہا تھا کہ پھر.....

اچھی اور بہترین کہانی، مرکزی خیال رشین ناول ''ریٹرن آف دی سولجر'' سے ماخوذ

بس اونچے نیچے راستوں پر رواں دواں تھی بس میں بیٹھی سواریاں کچی سڑک کی وجہ سے بار بار اچھلتیں اور پھر سیٹ پر گرتی تھیں سفر انتہائی مشکل تھا کچی سڑک پر جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑے ہوئے تھے جن پر سے گزرتے ہوئے بس بری طرح اچھل رہی تھی اور پھر شام بھی ڈھلنے والی تھی سورج کی سنہری کرنیں مغرب کی سمت سے جنگل کو روشن کر رہی تھیں سنہری کرنوں میں سارا جنگل سنہری نظر آرہا تھا کچی سڑک کی حالت بہت خراب تھی مگر بس ڈرائیور مشاق آدمی تھا لہٰذا وہ بنا کسی دقت کے بس کو مناسب رفتار سے دوڑا رہا تھا اتنے تکلیف دہ سفر کے باوجود وہ نوجوان آرام سے اپنی سیٹ پر بیٹھا سو رہا تھا اس کا بریف کیس اس کی گود میں دھرا تھا جسے اس نے نہایت مضبوطی سے تھام رکھا تھا وہ پچیس چھبیس سال کا نوجوان لڑکا تھا جس

نے نیلے رنگ کی پتلون اور سرخ چیکدار قمیص پہن رکھی تھی وہ شائد بہت زیادہ تھکا ہوا تھا اسی لئے بس کے جھٹکوں سے بھی اس کی نیند خراب نہیں ہو رہی تھی وہ اتنے آرام سے سو رہا تھا جیسے اپنے بیڈروم کے آرام دہ بیڈ پر سو رہا ہو۔ بس ایک جگہ رکی تو کنڈیکٹر نے اس سوتے شخص کا کندھا ہلایا۔

''اٹھو بھائی تمہارا اسٹاپ آگیا'' کنڈیکٹر کے ہلانے پر اس نوجوان نے اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر بس سے باہر کی جانب دیکھا اور پھر اپنی سیٹ سے اٹھا اور بس سے نیچے اتر گیا۔ اس کے بس سے اترتے ہی بس کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

''چلو استاد'' کنڈیکٹر بس کے دروازے پر ہاتھ مارتا ہوا بولا تو بس ڈرائیور نے بس آگے بڑھا دی بس کے جانے کے بعد اس جوان نے اپنا بریف کیس مضبوطی سے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا اور پھر جنگل میں بنی ایک کچی پگڈنڈی پر چل دیا پگڈنڈی پر وہ جس طرح چل رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ راستہ اس نوجوان کے لئے انجان نہیں ہے۔ وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

سورج نے شرما کر مغرب کی سیاہ چادر میں اپنا منہ چھپا لیا تھا اور چاند نے سورج کے منہ چھپاتے ہی اپنا جلوہ زمین پر بکھیر دیا تھا چاند کی مدہم روشنی میں جنگل اور زیادہ خطرناک لگ رہا تھا سناٹا چھایا ہوا تھا کبھی کبھی کسی جھینگر کے ٹرانے کی آواز اس سناٹے کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی یا پھر کسی درندے کی خوفناک دھاڑ جنگل کی پراسراریت میں مزید اضافہ کر دیتی وہ نوجوان اپنی پوری قوت صرف کر کے انتہائی تیزی کے ساتھ اپنا سفر مکمل کرنا چاہتا تھا شائد اسے بھی اندازہ تھا کہ اس جنگل میں وہ رات نہیں گزار سکتا۔ اسی وقت اس نوجوان کی نظر سامنے کی جانب اٹھی تو اسے کچھ دور روشنی جھلملاتی نظر آئی اس نوجوان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے قدم مزید تیز ہو گئے وہ تیز قدموں کے ساتھ روشنی کے منبع کی جانب بڑھا وہ روشنی ایک جھونپڑی میں جلتے ہوئے دیئے سے پھوٹ رہی تھی۔

''کوئی ہے؟'' اس نوجوان نے جھونپڑی کے پاس پہنچ کر آواز لگائی تو کچھ دیر بعد جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور ایک مدقوق سا بوڑھا باہر نکلا اس کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی جس کی روشنی میں اس نے کچھ دور کھڑے جوان کو دیکھا۔

''کون ہے؟''

''بابا۔۔۔شہر سے آیا ہوں'' نوجوان بولا۔

''آگے آؤ'' بوڑھے نے لالٹین کی روشنی تیز کرنے کے لئے بتی اونچی کی تو وہ نوجوان بوڑھے کے بات سن کر جھونپڑی کے اطراف لگی بانسوں کی باڑ کو پھلانگ کر اس بوڑھے کے قریب پہنچا۔

''کون ہو تم ۔۔۔اور کہاں جا رہے ہو؟'' بوڑھے نے لالٹین اس نوجوان کے چہرے کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا اسی وقت جھونپڑی کا دروازہ پھر کھلا اور ایک بوڑھیا دروازے میں آکر کھڑی ہو گئی وہ بھی اس نوجوان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی جو کچھ فاصلے پر کھڑا اپنی داڑھی میں انگلی ڈال کر کھجا رہا تھا۔

''میں اگلے گاؤں جا رہا ہوں۔۔مگر راستے میں رات ہو گئی ہے۔۔۔اگر۔۔۔ایک رات میں آپ کی جھونپڑی میں بسر کر لوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا'' وہ نوجوان جملے کو بار بار توڑتے ہوئے بولا۔

''ایک رات۔۔۔میری جھونپڑی میں'' بوڑھا بڑبڑایا۔

''میں۔۔۔۔میں آپ کو معاوضہ بھی دے سکتا ہوں'' وہ نوجوان بوڑھے کو مخمصے میں پا کر بولا۔

''نہیں۔۔نہیں ہم تمہیں اپنی جھونپڑی میں نہیں ٹھہرا سکتے۔۔۔ہمارے گھر جوان لڑکی ہے'' بڑھیا جوان کی بات سن کر بول اٹھی۔

''یہ اس کمرے میں رات بسر کر لے گا جہاں روئی رکھی ہے'' بوڑھا معاوضہ کا سن کر راضی ہوتا محسوس ہوا۔

''جی بس مجھے ایک کھاٹ (چارپائی) مل

جائے تو میں رات گزار لونگا اور صبح ہوتے ہی چلا جاؤنگا'' نوجوان بوڑھے کی بات سن کر بول اٹھا۔

''جیسی تمہاری مرضی'' بوڑھیا بھی راضی ہوتے ہوئے بولی۔

''آؤ۔۔بیٹا اندر آجاؤ'' بوڑھا اس نوجوان سے بولا تو وہ نوجوان اپنا بریف کیس اٹھا کر جھونپڑی میں داخل ہوگیا۔

جھونپڑی کے اندر بھی خستہ حالی چیخ چیخ کر مفلسی کا اعلان کررہی تھی ایک جانب ایک چارپائی رکھی تھی جس پر چند پرانی اور خستہ حال بستر رکھے ہوئے تھے ایک جانب پانی کا پرانا مٹکا رکھا تھا جس کے اوپر رکھے گلاس پر جا بجا ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔وہ جوان جھونپڑی کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''بیٹھو بیٹا یہاں بیٹھ جاؤ'' بوڑھا ایک خستہ حال سا مونڈھا جھونپڑے کے وسط میں رکھتے ہوئے بولا مونڈھے کے تار جگہ جگہ سے نکلے ہوئے تھے نوجوان احتیاط کے ساتھ اس مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''بیٹا تم ہو کون اور اگلے گاؤں کیوں جارہے ہو'' بوڑھیا نے اس نوجوان کے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''پانی۔۔ایک گلاس پانی ملے گا'' نوجوان نے بوڑھیا کی بات کا جواب دینے کے بجائے پانی مانگا۔

''رجو۔۔رجو ایک گلاس پانی لا'' بوڑھیا نے آواز لگائی تو نوجوان نے دیکھا جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھی گٹھری میں حرکت ہوئی اور وہ گٹھری کھڑی ہوگئی۔جس چیز کو وہ نوجوان گٹھری سمجھ رہا تھا وہ ایک جوان لڑکی تھی جو اپنا سر اپنی ٹانگوں کے درمیان چھپائے بیٹھی تھی۔رجو نے مٹکے سے پانی نکالا اور اس نوجوان کو دیا۔

''یہ میری بیٹی رضیہ ہے ہم لوگ اسے رجو کہتے ہیں'' بوڑھے نے تعارف کرایا تو نوجوان نے سر ہلاتے ہوئے پانی کا گلاس رجو سے لے لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی پی کر گلاس رجو کو واپس کردیا۔

''تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا'' بوڑھے نے نوجوان سے کہا۔

''میں اخبارات میں کہانیاں لکھتا ہوں مانوس اجنبی کے نام سے۔۔اور اگلے گاؤں ایک کہانی کی تلاش ہی میں جارہا ہوں'' نوجوان بولا۔

''مانوس اجنبی یہ کیسا نام ہے؟'' بوڑھا نوجوان کا نام سن کر بول اٹھا۔

''یہ قلمی نام ہے۔۔یعنی لکھنے کے لئے رکھا گیا نام'' اس نوجوان نے اپنے نام کی وضاحت کی۔

''تو تمہارا اصلی نام کیا ہے''؟

''چھوڑیں اصلی نام کو۔۔۔سب لوگ مجھے اجنبی کے نام سے پکارتے ہیں آپ بھی اسی نام سے پکار لیجئے'' نوجوان بولا تو بوڑھا اور بڑھیا سر ہلانے لگے رجو غور سے شہری جوان کو دیکھ رہی تھی۔

''اماں۔۔۔رات کے لئے کیا پکاؤں'' اتنی دیر سے خاموش کھڑی رجو نے اپنی ماں سے پوچھا۔

''ساگ رکھا ہے وہی پکا لو'' بڑھیا بولی پھر نوجوان کی جانب متوجہ ہوئی ''بیٹا ساگ کھا لیتے ہو نا؟''

''میں سب کچھ کھا لیتا ہوں۔۔لیکن اگر گوشت پک جائے تو اچھا ہوگا'' نوجوان بولا۔

''گوشت تو گھر میں نہیں ہے۔۔۔اور۔۔۔'' بوڑھا کہتے کہتے رک گیا۔

''آپ بازار سے گوشت لے آئیے۔۔۔پیسے میں دیتا ہوں'' نوجوان اپنا بریف کیس زمین سے اٹھا کر گود میں رکھتا ہوا بولا۔

''نہیں۔۔نہیں بیٹا۔۔۔'' بوڑھے نے کچھ کہنا چاہا مگر نوجوان نے اس کی بات کاٹ دی۔

''آپ کے اور میرے پیسے الگ تھوڑی ہیں'' نوجوان بوڑھے کی بات کاٹتا ہوا بولا پھر اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔۔۔تو بوڑھے بڑھیا اور رجو کی سانسیں ان کے اپنے حلق میں کھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگیں کیونکہ بریف کیس نوٹوں سے مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔

''یہ لیجئے'' نوجوان نے بریف کیس میں رکھی نوٹوں کی گڈیوں میں سے ایک گڈی میں سے ایک نوٹ

نکالا اور بوڑھے کو دیا۔

''بیٹا اتنے سارے پیسے لیکر تم پھر رہے ہو'' بوڑھا نوجوان سے نوٹ لیکر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا ہوا بولا۔

''میرے پاس بہت پیسہ ہے۔۔آپ فکر نہ کریں۔۔بس جلدی سے جا کر گوشت لے آیئے ایسا نہ ہو گاؤں کا بازار بند ہو جائے'' نوجوان بولا تو بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''مجھے کمرہ دکھا دیجئے میں تھوڑا آرام کرونگا'' نوجوان اپنی جگہ سے کھڑا ہوتا ہوا بولا تو بوڑھا اسے لیکر برابر بنے ایک کمرے میں لے آیا۔

کمرہ آدھے سے زیادہ روئی سے بھرا ہوا تھا ایک جانب ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔

''بیٹا بس یہی جگہ ہے ہمارے پاس'' بوڑھا لجلجا کر بولا۔

''کوئی بات نہیں بابا۔۔میں یہاں آرام کر لونگا'' نوجوان اپنا بریف کیس چارپائی کے نیچے رکھتا ہوا بولا پھر وہ خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''اچھا بیٹا کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے لینا'' بوڑھا اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گیا اور نوجوان آرام کی غرض سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

بوڑھا جھونپڑی سے باہر نکلا اور گاؤں کی سمت چل دیا جہاں سے اسے گوشت اور دیگر لوازمات لینے تھے گاؤں کا بازار بند ہی ہونے والا تھا اس نے جلدی جلدی سامان خریدا اور واپس اپنی جھونپڑی میں پہنچا جب وہ اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی جھونپڑی کے سامنے زمیندار کا آدمی لال بخش کھڑا ہے۔

''اوہ۔۔ بڑی عیاشی ہو رہی ہے۔۔گوشت موشت کھایا جا رہا ہے۔۔اور زمیندار کا قرض چکانے کے لئے تیرے پاس پیسے نہیں ہیں'' لال بخش اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بولا۔

''یہ۔۔یہ تو۔۔۔یہ تو۔۔'' بوڑھا لال بخش کو اپنے سامنے دیکھ کر گڑبڑا گیا۔

''اس مرتبہ سود کی رقم کیوں نہیں پہنچائی'' لال بخش دیگر باتوں کو نظر انداز کر کے کرخت لہجے میں بولا لال بخش کی آواز سن کر جھونپڑی میں سے بوڑھیا بھی نکل آئی۔

''وہ۔۔۔وہ دے دونگا۔۔۔بس کچھ دن کی بات ہے'' بوڑھے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ وہ اپنا مدعا بیان کر سکے۔

''کچھ دن نہیں۔۔۔آج اور ابھی۔۔۔ابھی مجھے رقم چاہیے'' لال بخش نے ایک بار پھر اپنے لمبی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''دے دونگا۔۔سود بھی اور۔۔اور اصل رقم بھی۔۔۔بس کچھ دن کی مہلت چاہئے'' بوڑھا لال بخش کے قدموں میں جھک گیا اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں بوڑھے کی بے بسی دیکھ کر بوڑھیا کے آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

''دیکھ۔۔رحیمے۔۔۔میں تیرے بھلے کے لئے ایک مشورہ دے رہا ہوں۔۔غور سے سن لے'' لال بخش نے اچانک پینترا بدل لیا۔

''کیا''

''اپنے زمیندار صاحب کا دل رجو پر آ گیا ہے۔۔۔وہ یاہ کرنا چاہتے ہیں وہ۔۔تو اگر راضی ہو جا تو۔۔۔۔سود کے ساتھ اصل بھی معاف ہو جائے گا'' لال بخش کی آنکھوں میں عیاری چمکنے لگی۔

''لال بخش۔۔'' بوڑھا اچانک سیدھا کھڑا ہو گیا ''زمیندار کی لڑکی بھی رجو سے بڑی ہے۔۔زمیندار سے کہنا شرم کرے'' بوڑھے کی آواز اچانک کرخت ہو گئی۔

''ہمارا مذہب ہمیں اجازت دیتا ہے۔۔کہ کسی بھی عمر کی لڑکی سے شادی کر سکتے ہیں'' لال بخش کے لہجے میں عیاری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

''مذہب کو درمیان میں مت لاؤ۔۔۔لال بخش۔۔اتنا مجھے بھی معلوم ہے لڑکی کی رضامندی بھی اسلام ضروری قرار دیتا ہے''۔

''سوچ لو۔۔۔اگر اس شادی پر راضی نہیں ہو تو۔۔۔پھر کل اصل رقم اور سود کے ساتھ ساٹھ ہزار روپے تیار رکھنا ورنہ۔۔۔'' لال بخش مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا چلا گیا۔لال بخش کے جانے کے بعد بوڑھا اور بڑھیا جھونپڑی میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ رجو جھونپڑی کے دروازے سے کان لگائے کھڑی ہے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''رجو۔۔'' بوڑھے کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔

''اماں۔۔اماں۔۔۔تم۔۔تم مجھے زہر دیدو۔۔مگر۔۔ میں اس بوڑھے گدھ سے شادی نہیں کروں گی'' رجو روتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔۔۔نہیں میری بیٹی ایسا نہ بول'' بوڑھا بے چین ہوگیا۔

''ابا۔۔ابا تو اپنے ہاتھوں سے میرا گلا دبادے'' رجو نے بوڑھے کے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ کر کہا تو بوڑھے کو ایک جھٹکا لگا اور پیچھے ہٹ گیا۔

''تو۔۔تو ایسا کیوں بول رہی ہے بیٹی۔۔'' بڑھیا اپنا پھٹا ہوا دوپٹہ منہ میں ڈال کر رونے لگی تاکہ اس کی رونے کی آواز بلند نہ ہو سکے۔

''ایسا نہ کہو ں تو۔۔۔پھر کیا کہوں۔۔وہ بوڑھا۔۔کھوسٹ۔۔۔گدھ مجھ سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔۔اس۔۔ سے شادی کرنے سے بہتر ہے میں۔۔۔میں خود مر جاؤں'' رجو اتنا کہہ کر پلٹی اور فرش پر رکھی چھری اٹھا کر اپنے گلے پر رکھ لی مگر اس سے پہلے کہ وہ چھری اپنے گلے پر پھیرتی بوڑھے نے جلدی سے رجو کے ہاتھ سے چھری چھین لی۔

''بیٹی ایسا کیوں کہہ رہی۔۔ہم۔۔کبھی تیری شادی اس بوڑھے زمیندار سے نہیں کرینگے'' بوڑھا بولا اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

''تو۔۔تو پھر اس کا قرضہ کیسے واپس کرو گے'' رجو بولی۔

''کر دینگے۔۔کر دینگے اس کا قرضہ بھی واپس کر دینگے'' بوڑھا بولا۔

ڈراپ سین

ٹھک، ٹھک، سینڈلوں کی آواز اُبھری، اور نرس کمرے میں داخل ہوئی۔

''کیا صورتحال ہے نرس۔'' ایک شخص نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں ایک سے دو ہو چکے ہیں۔'' نرس دھیمے لہجے میں بولی۔

''کیا کہا، دو ہو گئے، اب تو، اب تو۔''

''اوئے، آگے مت بول لفظوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔'' ایک تیسری آواز اُبھری۔ تھوڑی دیر بعد نرس پھر کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔

''بری خبر ہے مزید دو اور ہو چکے ہیں۔''

''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔'' تیسرا شخص بولا۔

''اللہ بڑا کارساز ہے فکر نہ کرو۔'' نرس بولی۔

مزید کچھ دیر بعد۔ نرس پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

''اب سناؤ معاملہ ختم ہوا کہ نہیں؟'' بے تابی سے پوچھا گیا۔

''معلوم نہیں، لیکن ایک اور ہو گیا۔'' نرس بولی۔

''''اوہ میرے خدا ایک نہیں دو نہیں پورے پانچ۔''

''ہاں ایسا تو سوچا بھی نہ تھا کہ پانچ ہو جائیں گے۔ کیا کیا جائے۔ وہ کم بخت۔ ''ہالینڈ'' کا ''بوویلنڈر'' پیلنٹی کا رنر ہی ایسے لگا رہے کہ دھڑا دھڑ گول ہو رہے ہیں۔''

(بلال احمد۔کراچی)

''کہاں سے۔۔۔اور کیسے؟'' رجو بولی اس سوال کا بوڑھے کے پاس کوئی جواب نہ تھا اس نے اپنا سر جھکا لیا اپنے باپ کا جھکا ہوا سر دیکھ کر رجو رونے لگی۔

''رجو۔۔رجو نہ رو۔۔۔میں نے سوچ لیا ہے زمیندار کا قرضہ کیسے چکانا ہے'' بوڑھے نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھا اس کی آنکھیں کسی خاص سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے چمکنے لگی تھیں۔

''کیسے۔۔۔۔اتارو گے اس زمیندار کا قرضہ'' بوڑھیا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔

''اس شہری نوجوان کے پاس بہت پیسہ ہے۔۔۔اگر'' بوڑھا کہتے کہتے رک گیا۔

''وہ شہری آدمی ہمیں کیوں اتنی بڑی رقم دے گا؟'' بڑھیا نے پوچھا۔

''اگر ہم اس کی رقم چرالیں تو'' بوڑھا ہلکی آواز میں بولا تو بڑھیا اور رجو چونک گئیں۔

''کیوں وہ شہری شور نہیں کرے گا کہ اس کی رقم کہاں گئی'' بڑھیا تنک کر بولی۔

''اگر وہ رہے گا تو شور کرے گا نا'' بوڑھے کی آواز کپکپانے لگی۔

''کیا مطلب''؟

''اگر رات کو وہ شہری جوان مر جائے تو۔۔۔'' رجو بوڑھے کی بات سمجھتے ہوئے بولی۔

''ہائے۔۔میرے اللہ''

''ہاں رجو کی ماں۔۔۔اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے'' بوڑھا بڑھیا سے بولا۔

''لیکن؟''

''لیکن شکن کچھ نہیں۔۔۔ہمیں اپنی قسمت خود لکھنی ہے'' رجو نے اپنی ماں سے کہا پھر اپنے باپ کی جانب متوجہ ہوئی'' آپ صحیح کہہ رہے ہے اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔۔شائد خدا نے اس شہری کو ہمارے گھر اسی لئے بھیجا ہے'' رجو پوری طرح باپ کی حمایتی بن گئی تھی۔

''ٹھیک ہے میں گوشت لے آیا ہوں تم لوگ لذیذ سا کھانا بنادو پھر رات کو۔۔۔۔۔'' بوڑھے نے آہستہ آواز میں کہا اور جھونپڑی سے باہر کی جانب چل دیا۔

''چل اماں تو بھی مصالحے نکال اور کھانا پکانے کی تیاری کر۔۔'' رجو نے اپنی ماں کا کندھا ہلا کر کہا تو بڑھیا بھی چپ چاپ جھونپڑی میں اس کونے کی جانب بڑھ گئی جہاں کھانا پکانے کا سامان رکھا تھا۔

''یہ۔۔۔یہ ہم لوگ غلط تو نہیں کر رہے ہیں نا؟'' بڑھیا نے مصالحہ بھونتے ہوئے رجو سے کہا۔

''اماں۔۔زیادہ مت سوچو۔۔۔اور کھانا پکاؤ'' رجو تنک کر بولی۔

''تم۔۔باپ بیٹی نے سوچا کیا ہے کیسے مارو گے اسے۔۔۔وہ طاقت میں ہم سب سے بھاری ہے'' بڑھیا مسلسل شک میں مبتلا تھی۔

''بات تو تمہاری سچ ہے۔۔۔سوچا تو یہ تھا کہ رات کو اس کے گلے پر دراتی پھیر دیں گے۔۔لیکن اگر اس کی آنکھ کھل گئی تو۔۔'' رجو سوچنے لگی۔

''مم۔۔۔میرے ذہن میں ایک بات ہے۔۔کہو'' بڑھیا جھجک کر بولی۔

''ہاں۔۔۔کہو''۔

''گلا کاٹنے میں تو خون بھی نکلے گا اور ہماری جھونپڑی بھی خراب ہوگی''۔

''ہاں ایسا تو ہوگا''۔

''تو کیوں نہ ایسی ترکیب سوچی جائے جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' بڑھیا بولی۔

''پہیلیاں مت بجھاؤ۔۔صاف صاف بتاؤ'' رجو بولی۔

''ہم اسے اس طرح قتل کریں کے وہ مر بھی جائے اور خون بھی نہ نکلے'' بڑھیا بولی۔

''کیسے''۔

''ہم اس کے کھانے میں زہر ملادیں تو۔۔۔'' بڑھیا نے اپنے ذہن میں آئی ترکیب بتائی

۔۔۔تو رجو اچھل پڑی۔

''واہ اماں۔۔۔تمہارا دماغ تو خوب چل رہا ہے۔۔یہ ترکیب زیادہ اچھی رہے گی'' رجو نے کہا۔

''بس میں مصالحہ بھون رہی ہوں۔۔۔ تیرا باپ باہر گیا ہوا ہے تو جلدی سے جا اور جنگل سے دھتورے کا پھول لے آیا۔۔۔ دھتورے کا پھول بہت زہریلا ہوتا ہے آدمی فوراً ہی مرجاتا ہے۔۔۔جا تو جلدی سے جنگل سے دھتورے کا پھول لے آیا'' بڑھیا نے پورا منصوبہ بتایا تو رجو جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چپل پہن کر درانتی ہاتھ میں اٹھا کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

کچھ دیر بعد رجو جھونپڑی میں واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں دھتورے کے پھول تھے اس نے درانتی سوکھی گھاس کے بنڈل کے پاس رکھی اور پھر دھتورے کے پھول کو دھونے لگی۔

''اماں تین پھول ملے ہیں۔۔۔کافی ہوں گے نا؟''

''دھتورے کے پھول اس کا کیا کرنا ہے'' اسی وقت بوڑھا بھی جھونپڑی میں داخل ہوا دونوں ماں بیٹی کی بات سن کر پوچھنے لگا۔

''ادھر آؤ'' بڑھیا بولی تو بوڑھا بڑھیا کے قریب پہنچ گیا اور بڑھیا کو سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔

''گلا کاٹنے پر خون نکلے گا اور فرش خراب ہو جائے گا۔۔اس لئے سوچا ہے کہ اس کے کھانے میں دھتورے کا پھول ملادیں گے۔۔تمہیں پتا تو ہے نا دھتورے کا پھول کتنا زہریلا ہوتا ہے لہٰذا وہ کھانا کھا کر مرجائے گا اس طرح جھونپڑی بھی خراب نہیں ہوگی اور ہمارا کام بھی بن جائے گا'' بڑھیا دبے لہجے میں منصوبہ بتاتے ہوئے بولی تو بوڑھا سر ہلانے لگا۔

''یہ ترکیب زیادہ اچھی ہے'' بوڑھے نے تعریف کی۔

''اماں کے ذہن میں آئی تھی یہ ترکیب'' رجو مسکرانے لگی۔

''چلو۔۔چلو جلدی سے کھانا پکالو ایسا نہ ہو کہ وہ اجنبی مسافر اٹھ جائے'' بوڑھے نے کہا تو بڑھیا اور رجو فوراً کھانا پکانے میں لگ گئیں۔

''سنئے کھانا پک چکا ہے۔۔۔۔اجنبی کو اٹھا دیجئے'' بڑھیا نے بوڑھے سے کہا جو جھونپڑی کے دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے چلم پی رہا تھا۔

''پک گیا کھانا'' بوڑھے نے آنکھیں کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں''۔

''اور دھتورے کا پھول'' بوڑھے کی آواز خود بخود مدہم ہوگئی۔

''وہ۔۔نیلی والی پلیٹ میں جو سالن نکالو گی وہ مسافر کا ہوگا'' بوڑھیا کی آواز بھی خود بخود مدہم ہوگئی۔

''ٹھیک ہے میں اٹھاتا ہوں اسے'' بوڑھا اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا جیسے ہی بوڑھے نے اس اجنبی مسافر کو اٹھانے کے غرض سے روئی کے گودام کی جانب قدم بڑھا جھونپڑی کے باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سن کر بوڑھے کے اٹھتے ہوئے قدم رک گے رجو جو سالن میں چمچہ چلا رہی تھی اس کا ہاتھ بھی رک گیا وہ تینوں ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''اس وقت۔۔۔اس وقت کون آ گیا؟'' بوڑھا بڑبڑایا مگر اس کے سوال کی کسی کے پاس جواب نہ تھا وہ سب خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔اسی وقت دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

''آرہا ہوں بھائی۔۔آرہا ہوں'' بوڑھے نے کہا اور دروازے کی سمت بڑھا بڑھیا بھی اس کے پیچھے دروازے کی جانب چلی بوڑھے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔۔۔تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کیونکہ باہر ایک پولیس والا وردی پہنے کھڑا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ڈنڈا تھا جس سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔

''سنتری بادشاہ۔۔۔خیریت تو ہے نا؟'' بوڑھے کی آواز لرز گئی۔

''ہاں خیریت ہے۔۔۔کوئی شہری مسافر تو تمہارے گھر نہیں آیا'' پولیس والے نے اپنا ڈنڈا اپنی ران پر ہلکے ہلکے مارتے ہوئے پوچھا۔

''شہری۔۔شہری مسافر۔۔'' بوڑھے کی سانس اس کے اپنے حلق میں پھنس گئی۔

''ہاں شہری مسافر۔۔۔اطلاع ملی ہے کہ ایک مسافر گاؤں کی جانب آیا ہے۔۔یہی معلوم کر رہا ہوں کہ وہ کس گھر میں ٹھہرا ہے'' سپاہی نے وضاحت کی۔

''نہیں یہاں تو کوئی نہیں آیا'' بوڑھے کے جواب دینے سے پہلے ہی بڑھیا بول پڑی۔

''اچھا۔۔۔شاید وہ اگلے گاؤں کی جانب چلا گیا ہے۔۔وہاں جا کر معلوم کرتا ہوں'' سپاہی نے جواب دیا اور واپسی کے لئے پلٹ گیا

''سنتری بادشاہ۔۔خیریت تو ہے نا۔۔۔کیا وہ شہری مسافر کوئی مجرم ہے؟'' بوڑھے نے واپس جاتے سپاہی سے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔بس ایسے ہی معلومات کر رہا ہوں'' سپاہی نے جواب دیا اور تیز قدموں سے واپسی کے لئے چل دیا اور کچھ ہی دیر میں باہر کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

سپاہی کے جانے کے بعد بوڑھا اور بڑھیا جھونپڑی کا دروازہ بند کر کے پلٹے تو دھک سے رہ گئے کیونکہ شہری مسافر ان کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

''کون تھا۔۔۔کس کا پوچھ رہا تھا؟'' اس اجنبی نے ان سے پوچھا۔

''کک۔۔۔کچھ نہیں ایسے ہی گاؤں کا ایک شخص تھا'' بوڑھا ہکلایا۔

''کس کے بارے میں پوچھا تھا؟''

''کسی کے بارے میں نہیں۔۔''

''میں نے سنا وہ کسی کے بارے میں آپ لوگوں سے پوچھ رہا تھا؟''

''کک۔۔۔کسی کے بارے میں نہیں پوچھ رہا تھا۔۔۔تت۔۔تم کیوں فکر کر رہے ہو۔۔آؤ جلدی سے کھانا کھا لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا'' بڑھیا نے جلدی جلدی جملے ادا کئے۔

''اوہ کھانا پک گیا'' نوجوان ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

''ہاں۔۔۔ہاں پک گیا۔۔۔اری رجو۔۔۔چل جلدی سے کھانا نکال'' بڑھیا یہ کہتے ہوئے رجو کی جانب بڑھی جو چولھے کے پاس بیٹھی کھانا نکالنے کی تیاری کر رہی تھی۔

''آؤ بیٹا۔۔آؤ'' بوڑھا نوجوان کو اپنے ساتھ لے کر اس جانب بڑھا جہاں رجو کھانا نکال رہی تھی۔

''لو بیٹا اس پر بیٹھو'' بوڑھے ایک ایک پیڑھی نوجوان کی جانب کھسکائی اور خود دوسری پیڑھی پر بیٹھ گیا نوجوان بھی بوڑھے کی دی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ گیا اور رجو کو دیکھنے لگا۔

''یہ لو بیٹا۔۔۔'' بڑھیا نے نیلے رنگ کی پلیٹ میں سالن نکال کر نوجوان کی جانب بڑھایا۔نوجوان نے بڑھیا کے ہاتھ سے پلیٹ لی اور پھر ہاتھ بڑھا کر بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔

''بابا۔۔۔آپ بڑے ہیں پہلے آپ شروع کریں''۔

''نن۔۔۔نہیں بیٹا۔۔۔یہ سالن آپ کے لئے نکالا ہے۔۔۔آپ لیں'' بوڑھا ایک دم بوکھلا گیا۔

''اماں اور سالن نکال رہی ہے میں وہ لے لیتا ہوں۔۔آپ بزرگ ہیں آپ یہ لے لیجئے'' نوجوان اصرار کرنے لگا تو بوڑھے کے ساتھ بڑھیا بھی گھبرا گئی۔

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔'' بوڑھے سے کوئی الفاظ بن نہیں پڑ رہے تھے وہ بوکھلائی ہوئی نظروں سے بڑھیا اور رجو کی طرف دیکھنے لگا۔

''چلئے آپ دونوں یہ نہ کھائیں۔۔بلکہ مجھے دے دیں'' رجو نے آگے بڑھ کر نوجوان کے ہاتھ سے پلیٹ لے لی اور کچھ فاصلے پر رکھی پیڑھی پر بیٹھ گئی پھر اپنی

ماں کے قریب آئی اور چنگیری میں سے روٹی نکال کر واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئی بوڑھیا رجو کو بوکھلائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو اماں۔۔کھانا دوسب کو'' رجو ماں کو اس طرح اپنی جانب دیکھتا ہوا پا کر بول اٹھی تو بڑھیا نے ہاں کہہ کر دوسری پلیٹوں میں سالن نکالنے لگی۔

نوجوان اور بوڑھے کو کھانا دیتے ہوئے بڑھیا نے رجو کی جانب دیکھا جو نہایت رغبت کے ساتھ روٹی کو سالن میں ڈبو کو مزے لے لے کر کھا رہی تھی بوڑھیا اور بوڑھا رجو کو اس طرح کھانا کھاتے دیکھ کر پریشان ہوگئے۔

''واہ اماں کھانا تو بہت مزیدار بنا ہے'' نوجوان نے کھانا کھاتے کھاتے بوڑھیا سے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔

''کیا بات ہے آپ دونوں کھانا نہیں کھا رہے؟'' نوجوان نے بوڑھے بڑھیا کو ہاتھ روکے دیکھا تو پوچھ بیٹھا۔

''ہم لوگ کم ہی کھاتے ہیں۔۔۔اب بڑھاپے میں زیادہ نہیں کھایا جاتا'' بڑھیا نے عذر پیش کیا تو نوجوان نے سر ہلا دیا تو خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''واہ مزا آگیا اتنے دن بعد مزیدار کھانا ملا ہے'' نوجوان کھانا ختم کرنے کے بعد اٹھتا ہوا بولا۔

''بیٹا چائے وغیرہ کی ضرورت ہو تو بتا دینا'' نوجوان کے کھانا ختم کرنے کے بعد بڑھیا نے پوچھا۔

''نہیں اماں۔۔مجھے ایسی کوئی عادت نہیں ہے۔۔۔بس میں اب آرام کرونگا۔۔۔صبح بہت سے کام ہیں'' نوجوان گلاس سے پانی پینے کے بعد کہنے لگا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔جیسے ہی نوجوان دوسرے کمرے میں گیا بوڑھا اور بڑھیا اپنی جگہ سے اٹھے اور رجو کے پاس آئے جو ابھی بھی مزے سے کھانا کھا رہی تھی۔

''رجو۔۔۔رجو۔۔یہ۔۔یہ تو کیا کر رہی ہے۔۔۔پلیٹ میں تو۔۔۔۔۔'' بڑھیا کہتے کہتے رک گئی۔

''اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں۔۔۔۔زہر والی سالن کی پلیٹ یہ رہی'' رجو نے اپنی پیڑھی کے نیچے سے ایک پلیٹ نکالی جو سالن سے بھری ہوئی تھی۔

''اوہ شکر ہے۔۔ورنہ میں سمجھی۔۔۔'' بڑھیا کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں تو سمجھی میں نے زہر والا سالن کھا لیا'' رجو بولی مگر بڑھیا نے رجو کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''اب کیا کریں۔۔۔یہ زہر والی ترکیب تو فیل ہوگئی'' بوڑھا مظمین ہونے کے بعد بولا۔

''اب ہمیں پہلی والی ترکیب پر عمل کرنا پڑے گا۔۔'' رجو بولی۔

''ہوں''۔

''اس مسافر کے سونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔۔۔پھر درانتی سے۔۔۔۔'' رجو نے گلے پر انگلی پھیرتے ہوئے اشارہ کیا۔

''اس سالن کا کیا کرے'' بڑھیا نے پلیٹ کو ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس سالن کو میں باہر پھینک آتا ہوں۔۔ایسا نہ ہو کہ کہیں غلطی سے ہم میں سے کوئی اسے کھا لے'' بوڑھے نے بڑھیا کے ہاتھ سے سالن کی پلیٹ لی اور جھونپڑی سے باہر کی جانب چل دیا۔

''چلو اماں کھانے کے برتن سمیٹ لیتے ہیں'' رجو نے بوڑھے کے جانے کے بعد بڑھیا سے کہا اور کھانے کے برتن سمیٹنے لگی بڑھیا بھی خاموشی کے ساتھ صفائی میں لگ گئی۔

آدھی رات بیت چکی تھی چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا کبھی کبھی کسی گیدڑ کی آواز اس سناٹے کو چیرتی ہوئی ان کے کانوں سے ٹکراتی وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر آنکھیں بند کیے لیٹے تھے مگر نیند۔۔۔نیندان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔جب رات کا دوسرا پہر بھی گزر گیا تو رجو آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اجنبی کے کمرے کے دروازے کے پاس جا کر رک گئی اور دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکنے لگی اندر اجنبی نوجوان چارپائی پر لیٹا

گہری نیند سو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر رجو واپس آئی اور اس نے بوڑھے اور بڑھیا کو ہلا کر اٹھایا۔

''وہ گہری نیند سو رہا ہے'' رجو بولی تو بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا پھر کھڑا ہوا اور اس نے گھاس کی گٹھری میں پھنسی ہوئی درانتی نکالی اور اس کی دھار پر انگلی پھیر کر دھار چیک کرنے لگا دھار ایک دم تیز تھی۔ بڑھیا بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر وہ تینوں اس اجنبی نوجوان کی چارپائی کے پاس پہنچے وہ دبے قدموں چل رہے تھے پھر بوڑھے نے اشارہ کر کے بڑھیا کو اس نوجوان کے پیر اور رجو کو اس کے ہاتھ پکڑنے کا کہا اور خود اس نے آگے بڑھ کر نوجوان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ان تینوں کے ہاتھ پیر اور منہ پکڑنے کی وجہ سے اس نوجوان کی آنکھ کھل گئی پہلے تو وہ نوجوان حیران ہوا مگر پھر بوڑھے کے دوسرے ہاتھ میں درانتی دیکھ کر نوجوان ساری بات سمجھ گیا وہ زور لگا کر اپنی ٹانگیں اور ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا مگر بڑھیا اور رجو کی گرفت مضبوط تھی وہ نوجوان اس بوڑھے سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بوڑھے کے مضبوط ہاتھ نے اس کا منہ سختی کے ساتھ بند کر رکھا تھا۔

نوجوان مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کی گرفت سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر ناکام رہا اسی وقت بوڑھے کا درانتی والا ہاتھ اوپر اٹھا اور تیزی کے ساتھ نیچے آیا بوڑھے نے نوجوان کے گلے پر درانتی پھیر دی۔

درانتی کے گلے پر پھیرتے ہی نوجوان کے گلے سے خون ابل پڑا اور وہ تڑپنے لگا مگر ان تینوں نے سختی کے ساتھ اسے پکڑ رکھا تھا لہٰذا وہ زیادہ تڑپ بھی نہیں سکا اور فوراً ہی اس نے دم توڑ دیا۔ جب بوڑھے کو یقین ہو گیا کہ نوجوان مر چکا ہے تو اس نے نوجوان کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا دیا رجو اور بڑھیا نے بھی نوجوان کے ہاتھ اور پیر چھوڑ دیئے نوجوان مر چکا تھا۔

نوجوان کے مرتے ہی وہ تینوں اس کی چارپائی کے پاس سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔

''اب اس لاش کا کیا کریں'' بڑھیا بے پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر میں پہلی پو پھٹنے ہی میں اس لاش کو ندی میں پھینک دونگا'' بوڑھا بولا۔

''مگر ندی تک لاش لے کر کیسے جاؤ گے'' بڑھیا نے پھر سوال کیا۔

''کندھے پر اٹھا کر'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''مگر اس طرح تو اس کی کٹی گردن سے خون گرتا چلا جائے گا۔'' بڑھیا بولی۔

''ہاں۔۔ یہ تو ہے'' بوڑھا سوچنے لگا۔

''اگر لاش کو بوری میں ڈال کر لے جایا جائے تو خون زمین پر نہیں گرے گا'' رجو نے مشورہ دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو۔۔ گھر میں کوئی بوری ہے'' بوڑھے نے رجو کی بات سن کر کہا۔

''نہیں۔۔۔ گھر میں تو کوئی بوری نہیں ہے''۔

''میں ابھی معراج دین کے گھر جاتا ہوں۔۔ اس کی پرچون کی دکان ہے اس کے پاس بوریاں ہوں گی'' بوڑھا بولا۔

''اور معراج دین نے پوچھا کہ بوری کیوں چاہیے تو۔۔'' بڑھیا کا سوال برمحل تھا۔

''کہہ دونگا کچھ فالتو سامان رکھنا ہے'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''معراج دین اتنی رات کو جاگ رہا ہوگا'' رجو نے سوال کیا۔

''اسے نیند نہ آنے کی بیماری ہے وہ اکثر گھر کے باہر چبوترے پر رات بھر بیٹھا رہتا ہے'' بوڑھے نے جواب دیا اور پھر اپنے کندھے پر ایک میلا سا کپڑا ڈال کر ہاتھ میں ڈنڈا تھام کر جھونپڑی سے نکل گیا ساتھ ہی رات کو راستہ دیکھنے کے لئے اس نے لالٹین بھی لے لی تھی۔

بوڑھا تیز قدموں کے ساتھ معراج دین کے گھر کی جانب چلا جا رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے اس کے پیروں میں بجلیاں بھر گئی ہوں وہ تیز تیز قدموں سے معراج دین کے مکان کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا معراج دین اپنے مکان کے سامنے بنے چبوترے پر چادر اوڑھے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا تھا بوڑھا

تیز قدموں کے ساتھ معراج دین کے قریب پہنچا۔

''ارے رحیمو کہاں بھاگا چلا جارہا ہے'' معراج دین نے بوڑھے کو دیکھ کر پوچھا۔

''تیرے ہی پاس آرہا تھا'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''خیریت تو ہے نا؟''۔

''ہاں۔۔ہاں سب خیریت ہے۔۔مجھے ایک خالی بوری چاہیے تھی'' بوڑھے نے کہا۔

''کیوں''

''وہ گھر کی صفائی کی ہے نا اس لئے کچھ فالتو سامان بوری میں بھر کر رکھنا ہے'' بوڑھے نے پہلے سے سوچا ہوا جواب اسے دیا تو معراج دین حقہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کے اندر گھس گیا اور کچھ ہی دیر میں ایک خالی بوری ہاتھ میں لئے گھر سے باہر آیا۔

''یہ لو۔۔رحیمو۔۔اور سناؤ۔۔گھر میں حال چال کیسا ہے؟'' معراج دین بوری بوڑھے کو دیتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہے'' بوڑھے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔۔یا سب خوش ہے'' معراج دین ہنستے ہوئے بولا۔

''خوش''؟ بوڑھے کا دل زور زور دے دھڑکنے لگا۔

''ہاں بھی اتنا مال جو ہاتھ آگیا۔۔تو پھر سب خوش نہیں ہوں گے'' معراج دین کی مسکراہٹ بوڑھے کو بڑی پراسرار لگی۔

''مال۔۔کونسا مال'' بوڑھے کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''اب مجھ سے نہ چھپاؤ۔۔سب سے پہلے تو مجھے ہی پتا چلا تھا'' معراج دین بولا۔

''کیا پتا چلا تھا؟'' بوڑھے کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

''تمہارا بیٹا صابر۔۔۔عرف سابو۔۔واپس گاؤں آگیا ہے'' معراج دین نے کہا تو بوڑھا اچھل پڑا۔

''صابر۔۔۔میرا بیٹا سابو۔۔واپس آگیا۔کہاں سے میرا بیٹا؟'' خوشی سے بوڑھے کی آواز لرز گئی۔

''ارے بھی بس سے اتر کر گاؤں آرہا تھا تو مجھے راستے میں ملا۔۔میں تو پہچان بھی نہ سکا آخر کو دس سال ہوگئے اسے شہر گئے ہوئے۔۔اب تو کڑیل جوان ہوگیا ہے اس نے مجھے خود سے سلام کیا اور اپنے بارے میں بتایا تھا'' معراج دین بولا۔

''پھر۔۔پھر سابو کہاں گیا؟'' بوڑھے کا دل بیقرار ہوگیا دس سال سے بچھڑے بیٹے کا سن کر اس کا دل پھر سے جوان ہوگیا تھا۔

''وہ تو کہہ رہا تھا کہ وہ سیدھا گھر ہی جارہا ہے۔۔۔نیلی پینٹ اور لال چیک والی قمیص پہن رکھی تھی اس نے اور ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا'' معراج دین سوچتے ہوئے بولا۔۔۔تو بوڑھا دھک سے رہ گیا۔

''سابو۔۔۔سابو میرا سابو'' اچانک بوڑھا واپسی کے لئے پلٹا اور چیختا ہوا گھر کی جانب بھاگا۔

''لو بوری تو یہیں چھوڑ گیا۔۔بیٹے کے آنے کی خوشی میں بوڑھا پاگل ہوگیا ہے'' معراج دین ہنستے ہوئے بڑبڑایا اور زمین پر گری بوری اٹھا کر دوبارہ اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔

بوڑھا تیز قدموں سے اپنی جھونپڑی کی جانب جارہا تھا جتنی تیزی سے اس کے قدم اٹھ رہے تھے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے برسوں بعد واپس آنے والے اپنے بیٹے کو وہ نہ پہچان سکا۔۔۔اور اس سے آگے کی سوچ اسے خون کے آنسو رونے پر مجبور کررہی تھی وہ اپنی جھونپڑی کے سامنے پہنچا اور جھونپڑی کا دروازہ زور سے کھول کر ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں دیوار سے ٹیک لگائے اس کی بیوی بیٹھی تھی اور اس کی بیٹی رجو جو اجنبی مسافر کا بریف کیس کھولے اس میں موجود نوٹوں کو گھور رہی تھی اس نے ایک نظر اپنی بیوی اور بیٹی پر ڈالی اور پھر اس کی نظر اپنے بیٹے اپنے سابو کی لاش پر پڑی تو اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ اپنے

بیٹے کی لاش کے قدموں میں بیٹھ گیا اور اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

''کیا ہوا۔۔کیا ہوا؟'' بوڑھیا گھبرا گئی رجو بھی حیرت سے اپنے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

''سابو۔۔۔۔اپنا سابو۔۔۔یہ اپنا صابر ہے۔۔۔ہمارے۔۔لئے شہر سے یہ سارے پیسے کما کر لایا تھا'' بوڑھے نے روتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا بوڑھے کی بات سن کر بڑھیا کی سانسیں اس کے اپنے حلق میں گھٹ گئی اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔

''سابو۔۔۔میرا سابو'' بڑھیا کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی دلسوز تھی اس کی چیخ سن کر وقت کا کلیجہ بھی پھٹ پڑا بڑھیا اپنے بیٹے کی لاش کی جانب بڑھی اور میرا سابو کہہ کر اپنے بیٹے کی لاش پر گر پڑی اور ساتھ ہی اس کی آنکھیں بے نور ہو گئیں وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔وہ اپنے بیٹے سے معافی مانگنے اس کے پاس چلی گئی۔

رجو نے جو اپنی ماں کو اس طرح چیختے دیکھا تو وہ بھی چیختے ہوئے اپنی ماں کے قریب پہنچی اور اپنی ماں کو سیدھا کیا۔۔۔مگر اس کی ماں مر چکی تھی اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں اپنی ماں کے مرنے کا احساس ہوتے ہی رجو کے منہ سے ایک دکھ بھری آہ نکلی اور اس نے پہلے اپنی ماں کی لاش کو دیکھا پھر اپنے بھائی کی لاش کو دیکھا اور پھر اس نے اس بریف کیس کی جانب دیکھا جس میں رکھی رقم کی لالچ میں ان تینوں نے اپنے گھر کے رکھوالے اپنے بیٹے اپنے بھائی کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

بریف کیس کے ساتھ ہی وہ خون آلود درانتی بھی پڑی تھی جس سے انہوں نے سابو کا گلا کاٹا تھا اس درانتی پر ابھی تک سابو کا خون لگا ہوا تھا رجو دیوانوں کی طرح درانتی کی جانب بڑھی اور اس نے جھک کر درانتی اٹھالی اور پھر چارپائی کے پاس آئی اس نے ایک نظر اپنے باپ کو دیکھا جو اپنے بیٹے کے قدموں پر سر رکھے روئے جا رہا تھا پھر اس نے اپنی ماں کی بے نور آنکھوں میں دیکھا اور پھر اپنے بھائی سابو کی کٹی ہوئی گردن کو دیکھا جہاں سے ابھی تک خون نکل نکل کر زمین کو سرخ کر رہا تھا یہ سب دیکھ کر رجو نے دیوانگی کے عالم میں ایک چیخ ماری پھر اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھا جس ہاتھ میں اس نے درانتی پکڑی ہوئی تھی پھر وہ ہاتھ تیزی کے ساتھ نیچے آیا اور اس ہاتھ میں پکڑی درانتی نے ایک ہی جھٹکے میں رجو کی آدھی سے زیادہ گردن کاٹ دی۔

رجو کی گردن سے بھی خون ابل پڑا اور سابو کے خون کے ساتھ مل کر زمین کو سرخ کرنے لگا رجو لڑکھڑا کر اپنی ماں کے برابر میں سابو کی لاش پر گر پڑی اور اس کی آنکھیں بھی بے نور ہو گئیں۔

رجو کی چیخ سن کر بوڑھے نے اپنا سر اوپر کیا اور رجو اور اپنی بیوی کی لاشیں دیکھ کر اس کا رونا تیز ہو گیا کچھ دیر وہ روتا رہا پھر وہ کھڑا ہوا اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ دیوار کی جانب بڑھا جہاں چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی بوڑھے نے دیوار پر رکھے چراغ کو اپنے ہاتھ سے اٹھایا اور پھر اس کی بتی اونچی کی جس سے چراغ کی لو تیز ہو گئی بوڑھے نے ایک نظر اپنی بیوی بیٹے اور بیٹی کی لاشوں کی جانب دیکھا اور پھر چراغ کو روئی کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

جلتا ہوا چراغ جیسے ہی روئی کے ڈھیر پر گرا روئی نے فوراً آگ پکڑ لی اور آن کی آن میں پوری جھونپڑی آگ کی لپیٹ میں آ گئی۔

سویرے گاؤں والوں نے دیکھا کہ بوڑھے رحیمو کی جھونپڑی جل کر خاک ہو چکی ہے اور اس کے سارے گھر والے بھی جھونپڑی میں لگنے والی آگ میں جل کر ہلاک ہو چکے ہیں لیکن گاؤں والوں کے لے جھونپڑی سے نکلنے والی چوتھی لاش معمہ تھی۔جو کسی جوان لڑکے کی معلوم ہوتی تھی۔معراج دین سب گاؤں والوں کو بتا رہا تھا کہ برسوں بعد بوڑھے رحیمو کا جوان بیٹا سابو واپس اپنے گھر آیا تھا اور چوتھی لاش اسی کی ہے۔

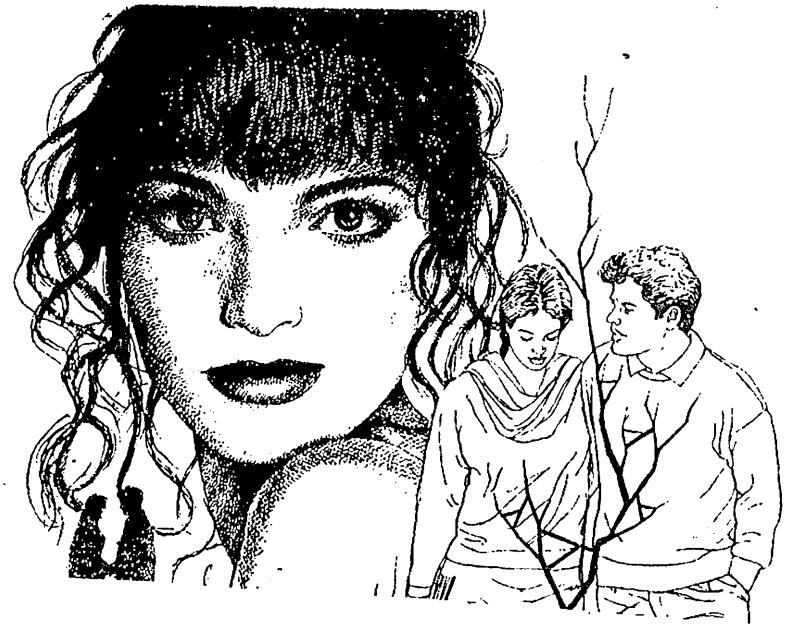

آخری وعدہ

زمر خان-ملتان

گلی بہت اندھیری تھی وہاں کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جیسے جیسے گلی میں داخل ہوتا رہا اسے احساس ہوا کہ وہ گلی کسی بھی قسم کے مکان سے عاری تھی .....

دل و دماغ پر دہشت طاری کرتی اور جسم کو سہاتی ہوئی لرزیدہ لرزیدہ خوفناک کہانی

یہ کہانی دانیال نامی ایک خوبرو نوجوان کی ہے جو کہ ایک پوش علاقے میں رہا کرتا تھا۔ وہ ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا اپنا بزنس تھا۔ بڑا گھر، نوکر چاکر غرض کسی چیز کی کمی نہیں تھی سوائے ماں باپ کے۔ اس کے والدین اس کے بچپن میں ہی ایک کار ایکسیڈنٹ میں وفات پا گئے تھے۔ اس کا کوئی بہن بھائی بھی نہ تھا۔ صرف ایک چچا تھے جنہوں نے اس کے والدین کے مرنے کے بعد اس کی پرورش کا بیڑا اٹھایا تھا۔

اکرام صاحب، چچا کی کوئی اولاد نہ تھی اور ان کی بیوی بھی دو برس قبل انہیں چھوڑ کے جا چکی تھی۔ انہوں نے دانیال کو بالکل اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اس کی ہر جائز، ناجائز خواہش پوری کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دانیال بہت بگڑ گیا تھا۔

ایسی بات نہیں تھی کہ وہ بہت بدتمیز اور بدلحاظ تھا،

بس پیسے کی فراوانی نے اور بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بہت ضدی ہو گیا تھا۔

رات رات بھر گھر سے باہر رہنا، دوستوں کے ساتھ جوا کھیلنا، شراب پینا غرض ہر قسم کی برائی اس میں موجود تھی۔ اکرام صاحب اسے بہت سمجھایا کرتے تھے مگر اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور ایک دن اکرام صاحب بھی دانیال کو تنہا چھوڑ کر دوسری دنیا میں چلے گئے۔ اب دنیا میں دانیال کا کوئی سہارا نہ بچا تھا۔ اس کا گھر میں بھی دل نہ لگتا تھا۔ اس لیے وہ زیادہ تر وقت اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ جو کہ محض اس کے پیسے پر عیاشی کرنے کے لیے اس کے ساتھ تھے۔ دن یونہی گزر رہے تھے کہ اچانک ایک دن دانیال کی زندگی میں ایسا وقت آیا کہ اس کی زندگی ہی بدل گئی۔

وہ ایک اندھیری رات تھی جب دانیال اپنی بڑی سی گاڑی میں سینما میں فلم دیکھنے کے بعد اپنے گھر کی جانب رواں دواں تھا۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا لیکن اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی وہ اکثر رات چار چار بجے تک اپنے دوستوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

آسمان پر سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے کچھ ہی لمحوں میں بس بارش شروع ہوئی۔ دانیال بارش شروع ہونے سے قبل گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے گاڑی کی رفتار تیز کر رکھی تھی۔ گاڑی میں ہلکا ہلکا میوزک بج رہا تھا اور دانیال اپنے خیالوں میں محو ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔

اچانک اس کی نظر سڑک کنارے کھڑے ایک وجود پر پڑی جو کہ سیاہ چادر میں ملبوس تھا۔ پہلے تو اس نے غور نہ کیا لیکن پھر اس خیال کے تحت کے شاید کسی کو مدد کی ضرورت ہو اس نے گاڑی اس شخص کے پاس جا کے روک دی اور پوچھا۔

''کیا آپ کو کہیں جانا ہے؟'' سامنے والے نے کوئی جواب نہ دیا۔

رات کافی گہری تھی اس لیے اسے یہ اندازہ لگانے میں کافی مشکل پیش آ رہی تھی کہ آیا کہ وہ شخص مرد ہے یا عورت؟

اچانک اس کی نظر اس کی کلائی پر پڑی جہاں اسے سرخ رنگ کی چوڑی نظر آئی۔ جس سے اسے معلوم ہوا کہ وہ ایک لڑکی تھی۔ لڑکی نے پوری طرح اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا اور سیاہ چادر سے نقاب بھی کچھ اس طرح کر رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں بھی بمشکل نظر آ رہی تھیں۔

''اگر آپ کو کہیں جانا ہے تو پلیز آپ گاڑی میں بیٹھ جائیں میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں، رات کافی ہو چکی ہے اور بارش بھی ہونے والی ہے اور اس وقت کوئی ٹیکسی، وغیرہ بھی مشکل ہی ملے۔'' دانیال نے وضاحت پیش کی۔

وہ لڑکی شاید اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ کچھ دیر خاموشی سے کھڑی کچھ سوچتی رہی، پھر کسی خیال کے تحت وہ اس کی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

گاڑی کچھ ہی دیر میں اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔ پورے راستے ان کے بیچ کوئی بات نہ ہوئی۔ لڑکی کچھ نہ بولی تھی اور نہ ہی دانیال نے کچھ پوچھنا ضروری سمجھا۔ کچھ آگے جا کر ایک اندھیری گلی کے سامنے پہنچ کر لڑکی نے گاڑی روکنے کو کہا۔

''دانیال نے گاڑی روک دی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتری اور دانیال کو شکریہ کہا۔

دانیال نے آج تک اس قدر خوبصورت آواز نہیں سنی تھی۔ لڑکی کی میٹھی آواز اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔

اسی لمحے تیز ہوا کا جھونکا آیا اور لڑکی کا نقاب تھوڑا سا ہٹ گیا۔ اس کے بھورے بال اس کے چہرے پر آ گئے اور وہ فوراً اپنا نقاب درست کرنے لگی۔

دانیال نے جو اس کی ایک جھلک دیکھی تو اس کا دل گویا دھڑکنا ہی بھول گیا۔ وہ ابھی اس کی خوبصورت جھیل جیسی آنکھوں میں گم تھا کہ زور سے بادل گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی اور وہ لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی اس اندھیری گلی کی تاریکیوں میں غائب ہو گئی۔

دانیال نے بھی اپنے آپ کو سنبھالا اور گھر روانہ

ہوگیا۔ گھر پہنچ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور سونے کے لیے لیٹ گیا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ ابھی بھی اسی حسین دوشیزہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہ تھی۔ اس کی بے تحاشہ لڑکیوں سے دوستیاں تھیں۔ ان کے ساتھ گھومنا پھرنا، انجوائے کرنا اس کا معمول تھا لیکن ان میں سے آج تک کسی لڑکی نے اس کو اتنا مدہوش نہیں کیا تھا جتنا اس حسن کی ملکہ کو دیکھ کر وہ ہوا تھا۔

اس دوشیزہ کے خیالوں میں ''نہ جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔''

وہ صبح اٹھا تو رات والا واقعہ اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اس نے نہا دھو کر کپڑے بدلے ناشتہ کیا اور آفس کے لیے روانہ ہوگیا۔ وہ آفس میں کچھ ضروری فائلز کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا کہ اس کے فون پر جنید اس کے دوست کی کال آتی دکھائی دی، اس نے فون اٹھالیا۔

''کیا حال ہے جانی؟ اور رات کا کیا پلان ہے۔''

''یار جو تم لوگ بولو، وہی پلان رکھ لیتے ہیں،'' دانیال نے خوش دلی سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے یار تو پھر ملتے ہیں رات میں اسی جگہ پر۔'' دانیال اس کی بات پر ہنسا لیکن اس وقت ہی اس کی Assistant اندر آئی۔ دانیال نے فون بند کر دیا اور آفس کے کاموں میں مشغول ہوگیا۔

رات کو وہ سارے دوست جوئے خانے میں موجود تھے، اچانک حیدر نے جنید سے پوچھا۔

''یار کتنی بچیاں ہیں تیرے پاس؟''

جنید نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''یار اپنے پاس تو پوری 12 بچیاں ہیں۔'' تو سب زور سے ہنسے۔

''اور دانیال تیرے پاس؟''

''میرے پاس کیا؟'' دانیال نے سنجیدگی سے استفسار کیا۔

''یار میں عشق، پیار، محبت کی بات کر رہا ہوں، کیا کبھی عشق ہوا تجھے کسی سے؟''

عشق کے لفظ پر دانیال کو وہ لڑکی یاد آ گئی۔ وہ

ٹیچر ہمارے عہد کے

ایک ٹیچر آتے ہی اسٹاف روم میں ممناتے ہوئے بولی۔

''آج کل کے بچے، بچے نہیں رہے۔''

دوسری ٹیچر نے پوچھا۔ ''کیوں، اب کیا ہوگیا۔''

پہلی ٹیچر نے کہا۔ ''آج کل بچوں کا دھیان پڑھنے پر کم پڑھانے والی پر زیادہ ہوتا ہے۔''

دوسری ٹیچر نے پوچھا۔ ''آپ کو کیسے پتا چلا۔''

پہلی ٹیچر نے کہا۔ ''ابھی کلاس ریڈنگ کرتے ہوئے راؤنڈ لگا رہی تھی کہ ایک بنچ پر بیٹھا چار پانچ سال کا بچہ دوسرے بچے سے کہنے لگا کہ دیکھو ذرا میم کی لپ اسٹک کتنی لائٹ ہوگئی۔ اس پر دوسرا بچہ کہنے لگا کہ میم نے پرسوں فراک پہنا تھا اس میں میم زیادہ گوری اور اسمارٹ لگ رہی تھی۔ آج سوٹ کا کلر بہت لائٹ ہے جو کہ میم پر سوٹ نہیں کر رہا۔''

دوسری ٹیچر نے پوچھا۔ ''اچھا تو تم نے کیا کہا۔''

پہلی ٹیچر نے جواب دیا۔ ''بس میں نے بچوں کی باتیں سن کر فیصلہ کرلیا، ہلکے کلر کے کپڑے پہننا چھوڑ دوں گی۔''

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈو الہ یار)

گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کے دوست بھی حیرانی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''یار سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''ہاں ہاں سب ٹھیک ہے، میں اب چلتا ہوں۔'' دانیال نے یہ کہتے ہوئے قدم باہر کی جانب بڑھا دیئے اور اسے اس کے دوست پریشانی سے جاتا دیکھتے رہ گئے۔

وہ آج پھر اسی راستے سے گزر رہا تھا جہاں اس کو دو دن پہلے وہ لڑکی دکھائی دی تھی لیکن آج سڑک خالی تھی۔ لڑکی کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ یہ تو دانیال کا معمول تھا کہ وہ ہر روز اسی راستے سے گزرتا تھا تاکہ وہ اس لڑکی کی ایک جھلک دوبارہ دیکھ سکے۔ لیکن اس کو ہمیشہ مایوسی ہی ہوئی۔ وہ لڑکی نظر نہ آئی۔

وہ بہت اداس اور بے چین رہنے لگا تھا، اس کے عیاش دوست بھی اسے اس حال میں دیکھ کر پریشان تھے، کیونکہ ان کا خرچہ پانی جو بند تھا۔

پھر ایک دن وہ اسے نظر آ ہی گئی۔ وہ اسے دیکھ کر ایسے خوش ہوا جیسے اسے برسوں سے کسی کی تلاش تھی جو پوری ہوگئی ہو۔

رات کافی ہو چکی تھی۔

''کیا میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں؟'' دانیال نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو وہ چپ چاپ آ کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی کچھ دیر میں گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

''آپ کا نام کیا ہے؟'' دانیال نے اُس لڑکی سے پوچھا۔

''نور'' لڑکی نے چھوٹا سا جواب دیا۔

دانیال ابھی اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس گلی کے سامنے اسے گاڑی روکنی پڑی وہ اتری اور چلی گئی۔ اب کی بار دانیال نے اپنے آپ کو کوسا کہ اسے گاڑی اتنی تیز نہیں چلانی چاہیئے تھی۔

خیر وہ جان گیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے محبت کر بیٹھا ہے اب وہ مزید انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ کل اس سے ملے گا اور اسے اپنا حال دل سنا دے گا۔

صبح ہوئی وہ اسی جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں وہ اسے ملتی تھی، وہ بے صبری سے اس کا انتظار کرتا رہا وہ جانتا تھا کہ وہ آج دن میں بھی اسے ملے گی۔

کچھ ہی دیر میں وہ اسے سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ دانیال کو دیکھ کر کچھ دیر کے لیے رک گئی اور پھر آگے بڑھی۔

''سنیئے۔'' دانیال نے اسے پیچھے سے آواز دی تو وہ پیچھے مڑی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''وہ..... مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ آپ برا نہ مانیں تو پاس والے ہوٹل میں کچھ دیر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔'' دانیال نے تمہید باندھی تو وہ کچھ نہ بولی اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔

وہ آج بھی اس سیاہ چادر میں اپنے آپ کو چھپائے ہوئے تھی۔

دانیال نے آج سے پہلے اتنی حسین لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں اب بھی گم ہی رہنا چاہتا تھا جب اس کی آواز آئی۔ ''فرمایئے۔''

''جی وہ.....'' دانیال کو اپنا حال دل سناتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اذان کی آواز آئی اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ظہر کا وقت ہو گیا ہے، اب میں چلتی ہوں۔''

دانیال حیرانی سے کھڑا ہوا اور بولا۔

''دیکھئے میں آپ سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں!''

''نماز سے بھی ضروری؟'' لڑکی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

دانیال بہت شرمندہ ہوا۔

''خیر فرمایئے!'' لڑکی نے اسے بولنے کی اجازت دی۔

''وہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' دانیال نے جلدی سے تمام باتیں کہہ دیں۔ وہ لڑکی پہلے تو غصہ سے کچھ دیر کے لیے اسے دیکھتی رہی پھر تیز تیز قدم بڑھاتی ہوٹل سے باہر

چل دی، وہ اس کے پیچھے آیا۔

''دیکھئے آپ میری بات کا جواب تو دیتی جائیں۔'' دانیال نے منت کے انداز میں کہا۔

وہ رکی اور بولی۔ ''آپ جانتے کیا ہیں میرے بارے میں بس دو تین ملاقاتوں میں ہی آپ نے عشق بھی کرلیا مجھ سے! چلو مان لیا کہ واقعی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے! تو محبت تو قربانی مانگتی ہے کیا قربانی دینے کو تیار ہیں آپ۔'' لڑکی نے سوال کیا۔

دانیال تیزی سے بولا۔ ''ہاں..... ہاں! جو قربانی آپ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔''

''اپنے دوستوں کو چھوڑ دیں۔ شراب نوشی چھوڑ دیں اپنی تمام بری عادتوں کو بدل دیں اور آج کے بعد ایک نماز بھی نہ چھوڑنا۔''

دانیال نہیں جانتا تھا کہ اسے اس کے بارے میں اتنا کچھ کیسے پتہ چلا، لیکن وہ بہت شرمندہ ہوا اور بولا۔

''ٹھیک ہے، میں یہ سب کرنے کو تیار ہوں۔''

''اور ایک آخری چیز مجھے بھول جاؤ۔ اور کبھی آئندہ میرے انتظار میں نہ رہنا، میں آئندہ کبھی تمہیں نظر نہیں آؤں گی۔'' وہ اپنی بات ختم کر چکی تھی۔

دانیال کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ''لیکن میں یہ کیسے کرسکتا ہوں؟'' لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی۔

دانیال اس کے پیچھے نہ گیا کیوں کہ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھر آ گیا۔ وہ بہت اداس تھا، پریشانی میں چکر کاٹتے کاٹتے اس کو کافی وقت گزر چکا تھا، وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

اچانک وہ رک گیا اور گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کی جانب چل پڑا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اس لڑکی کے گھر جائے گا اس کے والدین سے اس کا ہاتھ مانگے گا اور وہ اسے یقینی طور پہ اپنی بیٹی دینے کو تیار ہوں گے کیونکہ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کوئی بھی والدین اپنی بیٹی کے لیے چاہتے ہیں۔

وہ بہت خوش تھا، وہ جانتا تھا کہ کامیابی اس کے انتظار میں ہے۔ اس نے گاڑی اسی گلی کے سامنے روک دی اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ وہ اس سے پہلے کبھی اس کے گھر نہ گیا تھا، اس لیے تھوڑا ہچکچا رہا تھا۔

گلی بہت اندھیری تھی۔ وہاں کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا۔ وہ جیسے جیسے گلی میں داخل ہوتا رہا، اسے احساس ہوا کہ وہ گلی کسی بھی قسم کے مکان سے عاری تھی وہاں کوئی مکان نہ تھا۔ وہ چلتا گیا۔ اس امید کے ساتھ کہ شاید گلی کے آخر میں وہ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ رہتی ہو۔ وہ چلتا رہا، گلی کافی طویل تھی۔

پھر ایک جگہ جا کر وہ رک گیا، سامنے ایک دیوار تھی اور گلی ختم ہو چکی تھی۔ وہ ورطہ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ گلی سے باہر آ گیا اور آتے جاتے کچھ لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ گلی تو ہمیشہ ہی سے جنات کا مسکن ہے، وہاں کبھی کوئی انسان نہیں رہا، اس لیے وہ گلی ہمیشہ اندھیرے میں ڈوبی رہتی ہے۔

وہ چپ چاپ گھر آ گیا وہ سمجھ چکا تھا کہ جس لڑکی سے وہ محبت کر بیٹھا تھا وہ کوئی انسان نہیں تھی بلکہ کوئی اور ہی مخلوق تھی۔

اس نے نماز پڑھی اور اللہ سے سکون کے لیے دعا مانگی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آخری بار اس نے نماز کب پڑھی تھی۔ لیکن اس نے اب نماز کو معمول بنا لیا تھا اور تمام آوارہ دوستوں اور بری عادتوں کو بھی خیر باد کہہ دیا تھا۔ وہ اب ایک مکمل انسان بن چکا تھا۔

وہ کبھی دوبارہ اس گلی میں نہ گیا اور نہ ہی کبھی وہ لڑکی دوبارہ اسے نظر آئی۔

لیکن دانیال نے محبت کی قربانی دی تھی اور وہ تمام کام چھوڑ دیے تھے جو نور نے کہے تھے لیکن اس کے آخری وعدے کو وہ وفا نہ کر پایا تھا، وہ اسے بھول نہ پایا تھا۔

سچ کہتے ہیں کہ برے جنات کے علاوہ اچھے جنات بھی اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں جیسے دانیال کو نور ایک مکمل اور دیندار انسان بنا گئی تھی۔

خونی سڑک

رضوان علی سومرو۔ کراچی

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک سنسان سڑک پر ایک خوبرو حسینہ کھڑی نظر آئی اور اسے دیکھ کر نوجوان کی رال ٹپکنے لگی وہ قریب گیا اور اپنی گاڑی روک دی کہ پھر اچانک.....

اکثر انسان مستی اور خرمستی کی وجہ سے موت کو گلے لگالیتا ہے، دل نگار تحیر انگیز کہانی

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی چاروں طرف پراسرار سناٹا طاری تھا۔

تارکول کی پکی سڑک کے دونوں اطراف دور دور تک ایک طویل میدانی سلسلہ تھا جس میں خود رو جھاڑیاں اور پودے کثرت سے اُگے ہوئے تھے یہ طویل میدانی سلسلہ جابجا اونچے نیچے ٹیلوں پر مشتمل تھا چہار سو گھمبیر سناٹے کا راج تھا۔ ایسے میں ایک کار کی تیز روشنی ابھری اس نے سناٹے کے احساس کو مجروح کردیا کار میں دو بندے سوار تھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، لڑکے کی عمر چھبیس سال کے آس پاس جبکہ لڑکی کی عمر چوبیس سال ہوگی لڑکی نے دلہن کا جوڑا زیب تن کر رکھا تھا اور وہ فل میک اپ میں تھی صاف لگ رہا تھا کہ وہ اپنی شادی چھوڑ کر بھاگی ہے لڑکے نے عام سی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔

''ہم نے گھر سے بھاگ کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔۔'' لڑکی نے مسکرا کر اس لڑکے سے پوچھا۔

''نہیں۔۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ ویسے بھی تمہارے گھر والے راضی بھی نہ تھے''۔۔ لڑکا مسکرا کر بولا۔

''گھر والے راضی بھی کیسے ہوتے تم کوئی کام بھی تو نہیں کرتے۔۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تم جانتی ہو۔ میں نے نوکری کے حصول کے لئے کیا نہیں کیا۔''

لڑکی نے ٹھنڈی سانس لی اور اثبات میں سر ہلا کر خاموش ہوگئی چند ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ لڑکی یکدم چونک کر بولی۔

''سرفراز ہم کہاں جارہے ہیں۔''

''ہم لوگ دانش کے گھر جارہے ہیں یہ رات گزار کر ہم لوگ شادی کرلیں گے اور کل دوسرے شہر کے لئے نکل لیں گے۔''

''مگر یہ راستہ دانش کے گھر تو جاتا نہیں۔'' لڑکی پھر چونکی۔

''یہ شارٹ راستہ ہے۔ جو ہم کو جلد دانش کی طرف پہنچادے گا''۔

''کہیں یہ وہی خونی سڑک تو نہیں۔ جس کے بارے میں مختلف باتیں مشہور ہیں۔ لڑکی پھر چونکی تھی۔

جواب میں سرفراز نے اثبات میں سر ہلا کر ہاں کیا اور اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ ''صدف تم ایک پڑھی لکھی لڑکی ہو آج کے دور میں یہ باتیں۔'' سرفراز کے جملے اسی کے منہ میں رہ گئے۔

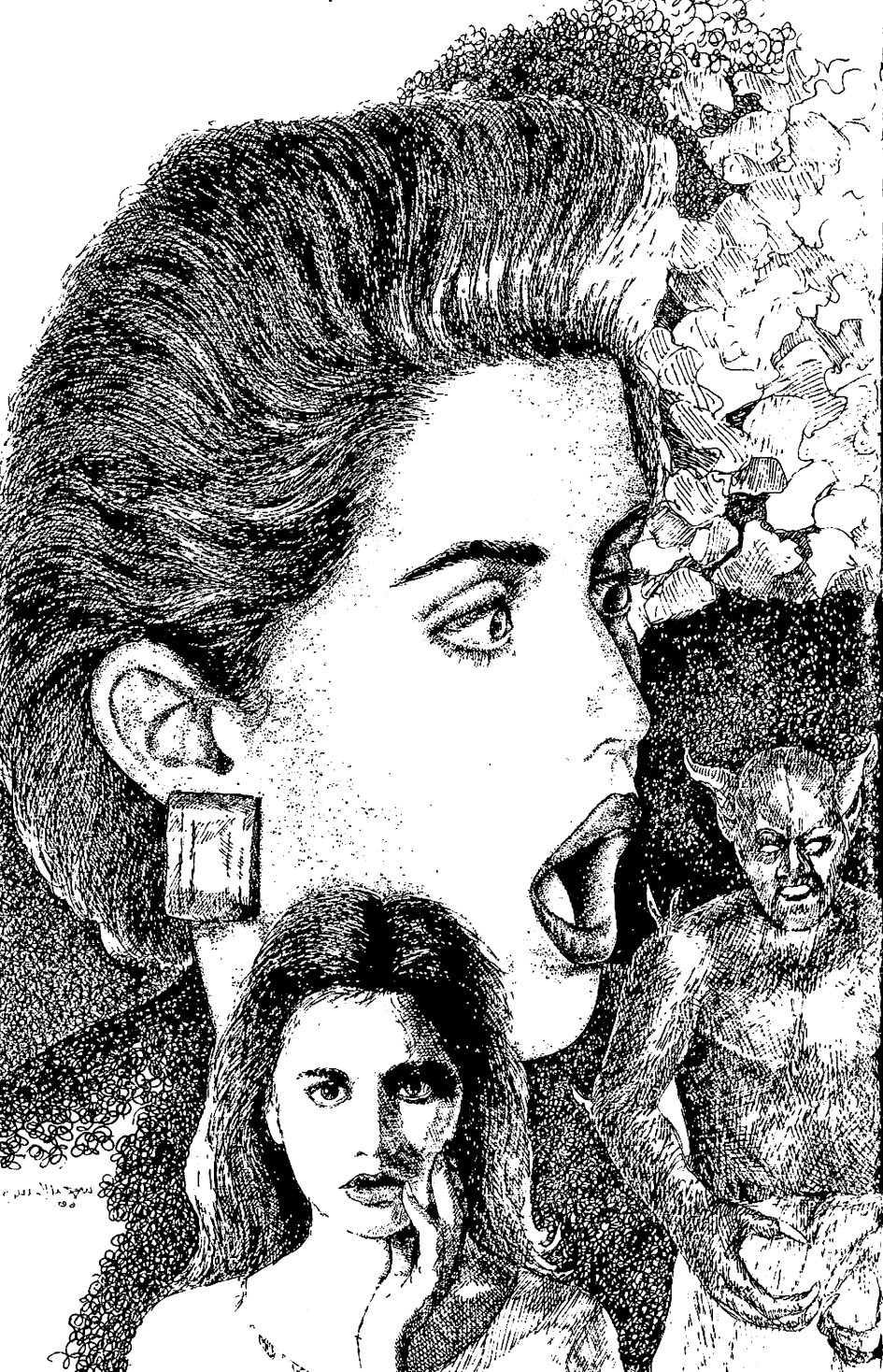

سرفراز نے ایک زور دار دھماکے کی آواز سنی تو گاڑی کا توازن بگڑ گیا اور کار لہرا گئی۔ کار کے بونٹ سے کوئی چیز ٹکرائی تھی جسے سرفراز نے صاف دیکھا تھا۔ وہ نہ جانے کیا چیز تھی کالی سی جس کی چمکتی سرخ آنکھیں تھیں۔ جس کی سرفراز ایک ہی جھلک دیکھ پایا تھا۔

صدف کے حلق سے دلخراش چیخ نکلی گاڑی لہراتی ہوئی دائیں طرف والے میدانی حصے میں اتر گئی گاڑی تھوڑی ہی دور چلی ہوگی کہ کسی چیز سے ٹکرا کر رک گئی اور سرفراز کا سر کار کے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور سرفراز اسٹیئرنگ پر ہی بے سدھ ہو گیا۔

صدف نے چیختے ہوئے سرفراز کو ہلایا لیکن سرفراز نے کوئی حرکت نہیں کیونکہ سرفراز بے ہوش ہو چکا تھا۔

باہر سناٹا تھا کار میں سرفراز بے ہوش پڑا تھا اور صدف اکیلی تھی صدف کے دل میں عجیب عجیب خیالات آنے لگے تھے اس سڑک سے جڑے تمام پر سرار واقعات اس کے دل و دماغ میں گھومنے لگے تھے اگر اس کو پتہ ہوتا کہ سرفراز اس سڑک سے کار گزارے گا تو وہ کبھی بھی اس سڑک سے اس کو جانے نہ دیتی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا کچھ تو کرنا تھا۔

چنانچہ صدف ڈرتے ڈرتے کار سے اتری اس نے دیکھا کہ کار کے بونٹ پر بہت سا خون پڑا ہے۔ ہو سکتا تھا یہ اس چیز کا خون ہو۔ جو چیز کار کے بونٹ سے ٹکرائی تھی۔ صدف اور آگے بڑھی یہ دیکھ کر وہ چونک گئی کہ کار ایک بہت طویل قد آدم مجسمہ سے ٹکرا کر رکی ہے۔

صدف نے غور سے اس مجسمہ کو دیکھا دوسرے پل چونک گئی یہ پتھر کا عجیب سا مجسمہ تھا صدف کو سمجھ ہی نہ آیا کہ کس طرح کا مجسمہ ہے اندھیرے کے سبب اس کے خدوخال ٹھیک طرح سے واضح نہیں تھے بس اتنا ہوا کہ صدف کو خوف کی ایک لہر اپنے اندر دوڑتی محسوس ہو رہی تھی صدف حیرت اور خوف اسے اس مجسمہ کو دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ ہاتھ کے رکھتے ہی صدف بری طرح سے اچھل پڑی اور اس کے حلق سے چیخ نکل گئی اس نے مڑ کر دیکھا تو پھر چیخوں کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ صدف نے جس کو دیکھا وہ بہت ہی خوفناک تھا اس کی لال سرخ آنکھیں صدف کو گھور رہی تھیں، دوسرے پل صدف لہرا کر اس نو وارد کی بانہوں میں جھول گئی۔

دوسرے دن سرفراز کی لاش پولیس نے اسی سڑک پر دریافت کی تھی لاش کی یہ حالت تھی کہ اس کے جسم اور چہرے پر جا بجا زخموں کے نشانات تھے اور جسم میں خون بے حد کم تھا یوں لگتا تھا کہ کسی درندے نے بڑی بے دردی سے سرفراز کا خون پیا ہے۔

پولیس رپورٹ کے مطابق سرفراز گزشتہ رات شہر کے ایک باعزت بزنس مین نثار احمد کی لڑکی کی اسی شادی سے لے بھاگا تھا اب پولیس کو اس کی لاش ملی تھی مگر لڑکی کا کوئی پتہ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

کاشف خان شہر کے ایک معروف بزنس مین تھے اپنے بزنس کے سلسلے میں اکثر کاشف کو بیرون ملک سفر کرنا پڑتا تھا چند سال پہلے تک کاشف اتنا کامیاب کاروباری نہ تھے۔ بس چھوٹا موٹا سا کاروبار تھا جس کو چلانے کے لئے کاشف کو بے حد پاپڑ بیلنے پڑتے تھے لیکن ان کی محنت اور لگن نے ان کے کاروبار کو دس سال میں بلندی اور عروج بام عطا کیا تھا عروج حاصل ہونے کے بعد بھی کاشف کے انداز میں تکبر پیدا نہیں ہوا تھا ہر ایک سے محبت اور عاجزی سے ملتے تھے ان کی محنت کی وجہ سے ملک کی سب سے بڑی کپڑے کی انڈسٹری ان کے ساتھ کاروباری سودے پر راضی ہوئی تھی۔

وقت رات کے آٹھ بجے طے پایا تھا۔ کاشف رات سات بجے گھر سے نکل گئے تھے۔ کاشف کی بیگم ایک خالص گھریلو عورت تھیں وہ ہمیشہ ہی ان بے وقت کی کاروباری میٹنگ سے چڑ کھاتی تھیں چنانچہ کاشف گھر سے نکلے تو بیگم نے ناک بھوں چڑھائی تھی چنانچہ کاشف ہنس کر ٹالتے ہوئے گھر سے نکل گئے۔ جلد پہنچنے کے لئے کاشف نے ایک مختصر راستے کو چنا تھا کاشف جانتے تھے اگر وہ مختصر راستے سے نہیں گئے تو شدید قسم کے ٹریفک

جام میں پھنس جائیں گے جو کہ کاشف کو گوارا نہ تھا۔

یہ وہی راستہ جس کو اختیار کرنے پر پابندی تھی اس کی وجہ اس سڑک پر ہونے والی پراسرار اموات تھیں پہلے پہل اس سڑک پر خاصی آمدورفت ہوا کرتی تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں میں ڈر وخوف پھیلنے لگا تھا بہت جلد یہ خونی سڑک کے نام سے مشہور ہوگئی اس کی وجہ لوگوں کی لاشیں تھیں جو اس سڑک سے ملا کرتی تھیں وہ لاشیں بربریت اور وحشت کا اعلیٰ نمونہ ہوا کرتی تھیں لاش کے چہرے اور جسم پر زخموں کے جا بجا نشانات ہوتے اور جسم میں خون بے حد کم پایا جاتا جس سے ایسا لگتا کہ یہ کسی درندے کا کارنامہ ہے۔ جب اس طرح کے واقعات بہت زیادہ بڑھ گئے تو حکومت کی طرف سے انکوائری ٹیم تشکیل دی گئی لیکن ٹیم کے ممبران بھی ان حادثات کا شکا رہوگئے جو زندہ بچنے میں کامیاب ہوئے وہ ہمیشہ کے لئے پاگل ہوگئے ان کے چہروں پر ایسا خوف پایا جاتا جو کہ ناقابل یقین ہوتا۔

لوگوں نے ان واقعات کے بارے میں بہت قیاس لگائے تھے کوئی یہ کہتا کہ یہ بدروحوں کا گروہ ہے جو لوگوں کو ورغلا کر عوام کا خون پی جاتا ہے کوئی آدم خور شیر کی داستان سناتا۔

مگر ایک روایت نے زیادہ شہرت حاصل کی کہا جاتا ہے کسی زمانے یہاں پر کسی ملک کے باغیوں کا گروہ آکر رہنے لگا یہ گروہ زندگی گزارنے کے لئے ڈاکے مارا کرتا تھا جب یہ واقعات بڑھ گئے تو حکومت نے پولیس پارٹی ان مجرموں کی سرکوبی کے لئے روانہ کی۔ ڈاکو تو محفوظ رہے مگر پولیس والے کبھی واپس نہ آسکے اس کے بعد حکومت کوئی اور ٹھوس قدم اُٹھا پاتی ملک میں طاعون کی وبا پھیلی جس سے پورا ملک شدید متاثر ہوا تھا۔ طاعون اس علاقے میں پھیلا چونکہ یہ لوگ مطلوب تھے اس لئے ان کی کوئی مدد نہ کی گئی جس کی وجہ سے یہ سارا قبیلہ وبا کا شکار ہوکر مارا گیا۔ اس کے بعد لوگ یہ سمجھنے لگے کہ ان مجرموں کی بدروحیں اس علاقے میں لوگوں کو مارتی پھرتی ہیں۔

چنانچہ حکومتی اقدامات کا کوئی ٹھوس فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے اس سڑک پر آنے جانے پر پابندی لگادی گئی اور اس سڑک کو حادثاتی مقام قرار دے کر بند کردیا گیا لیکن پھر بھی بہت سے منچلے چلے جاتے اور پھر کبھی واپس نہ آتے اور ان کی لاشیں اس حالت میں ملتیں جو کہ وحشت اور بربریت کا نمونہ ہوتیں۔

کاشف بڑے ہی پرسکون انداز میں کار چلاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور تو ہم پرست لوگوں کی تو ہم پرستی پر مسکرا رہے تھے جو کہ اس سڑک کو آسیبی گردانتے تھے ابھی تک کاشف کے ساتھ ایسی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی جو غیر معمولی ہو، سڑک کے دونوں اطراف طویل میدانی سلسلہ تھا جس میں خودرو پودے، جھاڑیاں اور اونچے نیچے ٹیلے وافر تعداد میں موجود تھے کاشف کو کار چلاتے ہوئے دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا مگر سڑک ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی سڑک تو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہی ہوتی جارہی تھی۔

کاشف سوچ میں پڑ گئے اس کے اندازے کے مطابق فاصلہ اتنا زیادہ نہیں تھا بہت سے بہت پندرہ منٹ کے بعد کاشف کو اس مین روڈ پر ہونا چاہیے تھا جہاں سے ہوٹل سی ایگل کا راستہ شروع ہوتا تھا۔

اچانک کاشف کی نظر فیول میٹر پر پڑی فیول کا نشان بتانے والی سوئی زیرو کی جانب اشارہ کررہی تھی مطلب پیٹرول بھی ختم ہونے والا تھا۔ اب شدید قسم کی پریشانی کاشف کے چہرے پر نظر آنے لگی تھی ملاقات کا وقت بھی شروع ہوا جاتا تھا اچانک کار نے جھٹکے لینے شروع کردیئے اور چند لمحوں کے بعد کار لہراتی ہوئی سڑک کے دائیں طرف کچے میں اتر گئی۔ کار کا فیول میٹر زیرو کی ریڈنگ شو کررہا تھا اور کار رُک چکی تھی۔

''او۔۔ خدایا ۔۔اب کیا ہوگا۔۔۔'' کاشف کار سے نکل کر بڑبڑائے۔

کاشف نے گھڑی دیکھی تو رات کے دس بج رہے تھے کاشف مزید پریشان ہوگئے کمپنی کے لوگ کاشف کا انتظار کررہے ہوں گے اگر وہ لوگ انتظار کرکے چلے گئے تو کاشف کی ریپوٹیشن بزنس مارکیٹ

میں کافی خراب ہوجائے گی کاشف شدید پریشان ہوگئے، اتنا ہی وقت لگ گیا تھا جتنا ٹریفک جام میں لگتا تھا۔

دور دور تک تاحد نگاہ ویرانے اور سناٹے کا راج تھا۔ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں کہ اچانک ان کو اپنے فون کا خیال آیا تو انہوں نے فوراً ہی جیب سے موبائل فون نکالا یہ دیکھ کر ان کو شدید قسم کی مایوسی ہوئی کیونکہ فون بند تھا کاشف کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فون بند کیوں ہے۔ان کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب گھر سے نکلے تھے تو فون کو اچھی طرح سے چارج کرلیا تھا۔

کاشف کی یہ عادت ہمیشہ سے تھی کہ جب بھی وہ گھر سے نکلتے تو اپنا فون چارج کرکے ہی نکلتے تھے لیکن آج تو بالکل ہی انہونی ہوئی تھی۔ کاشف کو سردی کا احساس بھی ہورہا تھا چنانچہ انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر کار کا ہیٹر آن کرلیا اور کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ کاشف ایک عجیب سی آواز سن کر چونک پڑے جیسے کوئی عورت پائل پہنے چھن چھن کرتی چلی آرہی ہو۔

کاشف کار سے باہر نکل آئے اور جیسے ہی وہ گاڑی سے باہر نکلی دور دور تک گہرے سناٹے اور خاموشی کا راج تھا لیکن پائل کی آواز برابر ان کے کانوں کو سنائی دے رہی تھی۔

اب تو کاشف کی ہوا خشک ہونے لگی تھی خوف کا احساس ان کے دل میں سرایت کرنے لگا ویرانے اور سناٹے میں پائل کی آواز اچھے خاصے لوگوں کا خون خشک کرنے کے لئے کافی تھی کاشف کو وہ ساری پراسرار کہانیاں یاد آنے لگی تھیں جو کہ اس سڑک سے منسوب تھیں۔

کاشف ادھر اُدھر دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ان کو دور سے روشنی اپنی طرف آتی نظر آئی تو انہوں نے غور سے دیکھا تو کوئی انسان ہاتھ میں لالٹین لئے چلا آرہا ہے جیسے ہی نووارد قریب آیا تو یہ دیکھ کر وہ حیران ہوگئے۔

وہ ایک لڑکی تھی جو کہ دیکھنے میں دیہاتی معلوم ہوتی تھی اس لڑکی نے گھاگھرا چولی زیب تن کررکھا تھا جو کہ اکثر و بیشتر اس علاقے کے بنجارے پہنا کرتے تھے۔ اس لڑکی نے خالص دیہاتی لہجے میں کاشف کو مخاطب کیا۔

''بابو۔کیا ہوا گاڑی خراب ہوگئی ہے۔''

''نہیں گاڑی تو ٹھیک ہے مگر افسوس پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔'' کاشف نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ۔'' لڑکی نے تاسف کا اظہار کیا۔

''بس اب انتظار ہے کوئی مدد آجائے مگر تم اس ویرانے میں کیسے۔'' کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

''بابو۔ یہاں تھوڑی دور ایک بستی ہے جہاں ہمارا گھر ہے۔ ہم بھولے بھٹکے راہگیروں کی مدد کرتے ہیں۔'' لڑکی مسکرا کر بولی۔

''مگر۔ میں نے تو سنا ہے یہاں کوئی آبادی نہیں ہے اور یہاں پر آمدورفت کی پابندی ہے۔'' کاشف بدستور حیرت بھرے لہجے میں بولے۔

لالٹین کی روشنی میں کاشف نے دیکھا کہ ان کی بات سن کر لڑکی کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا اور جیسے وہ یکدم گڑبڑا سی گئی ہو دوسرے پل وہ مسکرا کر بولی۔

''نہیں بابو یہاں ایک ڈاکوؤں کا گروہ ہے جو عوام کو پریشان کرتا ہے لوگوں سے لوٹ مار کرتا ہے''۔

''اچھا۔'' کاشف نے مختصراً کہا۔

''بابو۔۔۔تم ہمارے گھر چلو رات ہمارے گھر میں گزار لینا صبح کوئی نہ کوئی گاڑی گزرے گی تو پھر پٹرول کا بھی کچھ انتظام ہوجائے گا۔'' لڑکی پھر مسکرائی تھی۔

کاشف نے دل میں سوچا کہ ساری رات یہاں گاڑی میں کالی کرنے سے بہتر ہے لڑکی کے ساتھ چلا جائے صبح ہونے پر دیکھا جائے گا کیونکہ ابھی دوسری کسی گاڑی کے گزرنے کے کوئی آثار نہیں ہیں meeting تو خراب ہو ہی گئی ہے۔ چنانچہ کاشف اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ چل پڑا، چلنے سے پہلے کاشف کار کے ڈیش بورڈ سے ٹارچ نکالنا نہیں بھولتا تھا کاشف کی ڈیش بورڈ میں ہمیشہ ہی ایک ٹارچ موجود رہتی

اسرارِ سحر قلمی (اصلی قدیمی نسخہ)

یہ ایسی کتاب ہے جو کہ پرانے اور قدیمی عملیات پر مشتمل ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہر فرد اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی مانگ میں آج تک کمی نہیں ہوئی اور کسی تعریف کی محتاج نہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس دن اس کتاب کی تعریف کا کوئی خط یا فون نہ آیا ہو۔ اس کتاب میں مسلم حضرات کے لئے نوری عملیات اور غیر مسلم کے لیے منتر درج کیے گئے ہیں۔ اس کے متعلق مصنف نے یہ کہا ہے کہ اس کو نااہل لوگوں کی پہنچ سے دور رکھا جائے کیونکہ اس میں نہائیت سریع الاثر عملیات ہیں جو کہ نااہل کی پہنچ سے دور رکھنے چاہیے۔ اس کتاب کو پڑھ کر کسی بھی طرح کا جائیز یا ناجائیز عمل کرنے والا خود ہی ذمہ دار ہوگا مصنف، پرنٹر، پبلیشر، ایڈورٹائیزر، سپلائیر، ڈائجسٹ کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اس کتاب کو استعمال کرنے والا ہی ہر طرح سے ذمہ دار ہوگا۔ جیسے ہی آپ اس کتاب کا آرڈر کریں گے آپ ان تمام شرائط کے پابند ہوں گے۔ یہ ایسے عملیات ہیں جس کی مدد سے آپ اپنی روزی کما سکتے ہیں یا مفت میں عوام کی خدمت کر کے ثواب کما سکتے ہیں۔ اس کتاب کی مختصر سی فہرستِ مضامین درج ذیل ہیں۔ شیطانی بونوں، جنات، پریوں، دیو، دیوتاؤں، اپسراؤں، ویر، موکلات، بیر، دیوی، ہمزاد، قبر کے مُردے، سندوبی، جناتی بچوں، چھوٹے بڈاوں، بڑے بڈاوں کو حاضر کرنے کے طریقے اور اُن سے حیرت انگیز کام لینے کے طریقے درج ہیں، طلسمی چراغ کا عمل جو روح کو حاضر کرتا ہے، امتحان میں کامیاب ہونے کا منتر، امتحانات کے سوالات معلوم کرنے کا منتر، ایک ایسا تعویز جس کے اوپر سے گزرنے والے کا آزار بند کو توڑ دے، خوبصورت اور مغرور حسینہ کے دل میں محبت پیدا کرنا، ایک ہی رات میں محبوب کو حاضر کرنا، خوبصورت اور مغرور حسینہ سے اپنے دل کی بات منوانا، پسند کی شادی کرنا، خاوند کو اپنے بس میں کرنا، ہاتھ کے اشارہ سے دوسرے کو زبردست دھکا دینا، دشمن کو ہلاک کرنا، دشمن کو تکلیف پہنچانا، دشمن کا پیشاب بند کرنا، جنات دیکھنا، خواب میں لوگوں کو ڈرانا، محبت کا طلسمی سرمہ (جس کو تیار کر کے مہنگے داموں بیچا بھی جا سکتا ہے)، لوگوں کی نظروں سے غائب ہونے کا طلسمی سرمہ، چور پکڑنے کا عجیب عمل، قیدی کو قید سے رہائی دلانا، ہر مشکل کے حل کا عمل، پلک جھپکتے گمشدہ چیزوں کو ڈھونڈنے کا حیرت انگیز عمل، نظر بد سے بچنے کا عمل، مردہ مچھلی ناچنے لگے، لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا کرنا، لوگوں میں مشہور ہونا، اولاد کی پیدائش کے لئے، گھر سے چھپکلیاں اور چوہے بھگانے کا حیرت انگیز ٹوٹکا، چابی کے بنا تالا کھولنا، روتے ہوئے بچے کو چپ کرانا، اندھیرے میں تحریر کا پڑھنا، سانپ اور بچھو کے زہر دور کرنے کا منتر، دولت اور خوشحالی حاصل کرنے کا منتر، ہر مشکل کے حل کا عمل، فالنامہ لڑکا ہوگا یا لڑکی، نقش بھرنے کا طریقہ، عملیات کرتے کن باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے، انگوٹھے میں جنات کو حاضر کرنے کا طریقہ، انڈے کو نچانا، خونی انڈا، جواجیتنا وغیرہ وغیرہ

نیا سٹاک، بہترین کاغذ، صاف ستھری لکھائی، مضبوط جلد، کتاب قیمت -/3200 (علاوہ ڈاک خرچ جو بذمہ خریدار ہوگا) آج ہی بذریعہ وی۔ پی طلب کریں۔ ایڈوانس رقم ارسال نہ کریں۔ ایک خط لکھ دیں یا فون کر دیں کتاب آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

نوٹ: ہماری کوئی برانچ نہیں۔ ہم سے ہی صرف اصل کتاب بمعہ مفت رجسٹریشن نمبر لیں۔ رجسٹریشن کے بنا آپ کا مصنف سے رابطہ نہیں ہوگا۔ شکریہ

پی۔ او۔ بکس نمبر 77 سرگودھا، پاکستان

فون نمبر 03070287767

نوٹ: شام ۴ بجے سے پہلے آرڈر کرنے پر کتاب اسی دن پوسٹ کر دی جائے ورنہ اگلے دن پوسٹ کی جائے گی۔

تھی تاکہ اگر کار میں کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوجائے تو ٹارچ کی روشنی کی مدد سے دور کی جاسکے لڑکی آگے آگے چلی جارہی تھی اور کاشف اس کے پیچھے تھا ٹارچ کی روشنی میں کاشف نے لڑکی کے سراپے کو غور سے دیکھا لڑکی بے حد حسین تھی اور اس کی چال بہت دلکش تھی۔

"بابو۔ کیا نام ہے تمہارا" لڑکی نے چلتے چلتے پوچھا۔

"کاشف خان۔"

"کیا کرتے ہو بابو۔"

"کاروبار ہے میرا کپڑے کا۔" کاشف نے مسکرا کر کہا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا وہ دونوں چلتے ہی رہے کاشف بس لڑکی کی دلکش چال کو دیکھتا چل رہا تھا کاشف کو اپنی کاروباری میٹنگ کے خراب ہونے کا بہت افسوس تھا مگر کیا ہوسکتا تھا تھوڑی دور چلنے کے بعد کاشف کو آبادی کے آثار نظر آئے چاند کی روشنی میں مکانوں کے دھندلے اور ملگجے سائے دیکھ کر کاشف کا حوصلہ بلند ہوگیا آبادی دیکھ کر کاشف کو اُمید جاگ گئی کہ چلو رات کا کوئی انتظام ہوگیا ورنہ پہلے اس کے دل و دماغ میں یہی تھا کہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مکانات صاف اور واضح نظر آنے لگے تھے لیکن دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا عجیب سا غیر فطری سناٹا طاری تھا جیسا سناٹا قبرستانوں میں ہوتا ہے کاشف اس چیز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اتنا سناٹا کیوں ہے بالکل غیر فطری سا۔" کاشف نے حیرت سے پوچھا۔

کاشف کی بات سن کر لڑکی چونک گئی اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

"تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بابو۔ سیدھے سادے دیہاتی ہیں زیادہ دیر تک جاگنے کے عادی نہیں، جلد سوجاتے ہیں۔"

کاشف نے کوئی جواب نہ دیا لڑکی کے چہرے کے تاثرات اس کے الفاظوں کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

ایسا لگ رہا تھا کہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے مگر کیوں۔ اس کا جواب کاشف کے پاس نہیں تھا کاشف نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا ابھی فی الحال اس کے ساتھ چلا جائے اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ یہ لڑکی ضرور اس علاقے کے ڈاکوؤں کی ساتھی ہے۔ مگر کاشف نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کردینا بہتر سمجھا کیونکہ وہ ساری رات گاڑی میں تو نہیں گزار سکتا تھا۔ چنانچہ کاشف چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا کچھ ہی لمحات کے بعد اچانک کاشف اس کی جانب دیکھ کر گویا ہوا۔

تمہارا نام کیا ہے کاشف نے چلتے چلتے پوچھا۔

"زاغونہ"۔

نام بڑا ہی عجیب سا تھا کاشف نے سوچا ایسا نام تو اس نے زندگی میں پہلی بار ہی سنا تھا لڑکی کاشف کو مسلمان معلوم نہیں ہوتی تھی کاشف نے اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے نام کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "بہت خوب صورت نام ہے جو کہ تم پر بہت جچ رہا ہے۔"

اپنی تعریف پر کاشف نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی جس میں احساس تفاخر نمایاں تھا۔

اس کی مسکراہٹ کاشف کو سپاٹ اور کھوکھلی لگی بالکل غیر فطری زندگی کے ہر احساس سے عاری کاشف کوشش کے باوجود بھی اس میں زندگی تلاش نہ کرسکا۔

اچانک لڑکی نے مسکرا کر کاشف کو مخاطب کیا۔

"تم مجھے توہم پرست انسان معلوم ہوتے ہو۔ اگر بستی میں سناٹا ہے اس میں غیر فطری پن کہاں سے گھس آیا"۔

"شاید میں نے غلط کہا ہو۔ لیکن مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے میرے قدم کسی بستی کے بجائے قبرستان کی سمت اُٹھ رہے ہیں"۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا بس عجیب انداز میں مسکرا کر رہ گئی۔

جس انداز میں وہ مسکرائی اس کو دیکھ کر کاشف کو پھر کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اردگرد کوئی اندیکھا جال سا ہے جس میں وہ

پھنس رہا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد چاند کی روشنی میں کاشف کو ایک پتھر کا ایک مجسمہ نصب نظر آیا پتھر کے اس مجسمے کو دیکھ کر کاشف حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا یہ ایک عجیب سا مجسمہ تھا جس کو کاشف کوئی نام نہ دے سکا ٹارچ کی روشنی میں کاشف نے دیکھا کہ یہ مجسمہ کسی عورت کا تھا جس کے خدوخال نہایت خوب صورت تھے عجیب بات یہ تھی کہ اس مجسمہ کو دیکھ کر کاشف کے اندر ایک سرد لہر سی ڈورتی محسوس ہوئی تھی اس مجسمہ کو دیکھ کر کسی ریاست کی حکمران کا گمان ہوتا تھا۔

''یہ کس کا مجسمہ ہے۔'' کاشف نے زاغونہ سے سوال کیا۔

''یہ ہماری دیوی ہے رامونہ۔ ہم اس کی پوجا کرتے ہیں یہی ہے جو ہم کو موت کے بعد زندگی دے گی۔'' زاغونہ نے عقیدت مندانہ انداز میں جواب دیا۔

کاشف اس کے شرکیہ خیالات سن کر کانپ کر رہ گیا کہ زاغونہ نے پتھر کے مجسمہ سے اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کرلی تھیں حالانکہ امیدوں کا محور صرف اور صرف ذات واحد ہی ہونی چاہئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہ بستی کے اندر داخل ہو گئے بستی کے اندر کاشف کو مزید حیرتوں کا سامنا کرنا پڑا اس بستی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی دفن شدہ شہر میں آ گیا ہو۔ یوں لگتا تھا کہ یہ بستی آثار قدیمہ کی دریافت ہو۔ کوئی بھی مکان سالم حالت میں نہ تھا سب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے اکثریت ایسے مکانوں کی تھی جو کہ کھنڈر معلوم ہوتے تھے کاشف اگر مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو شاید بے ہوش ہوکر گر جاتا رات کے اندھیرے میں لالٹین کی روشنی میں ایک پراسرار لڑکی کاشف کو ایسی بستی میں لے آئی تھی جو کہ زیادہ تر اُجاڑ اور ویران معلوم ہوتی تھی کاشف کو وہ ساری پراسرار کہانیاں یاد آنے لگی تھیں جو اس سڑک سے منسوب تھیں ایک سرد سی لہر اس کو اپنے جسم میں دوڑتی محسوس ہوئی تھی کاشف نے سوچا جو ہوگا دیکھا جائے گا اس نے اپنے آپ کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرلیا تھا۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو کہ دوسرے مکانوں کی طرح اُجاڑ ویران اور کھنڈر سا بنا ہوا تھا لڑکی اس کو لے کر ایک ایسے کمرے میں پہنچی جہاں دیواروں پر انرجی سیور کی جگہ بڑی بڑی موم بتیاں روشن تھیں جو دیکھنے میں بڑا ہی پراسرار تاثر پیش کررہی تھیں ان روشن موم بتیوں کو دیکھ کر کاشف نے اپنے جسم میں لرزش محسوس کی تھی نہ جانے کیوں کاشف کو یہ سارا ماحول آسیبی لگ رہا تھا۔ کمرے کی دیواریں سیاہ تھیں بائیں طرف والی دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی چارپائی پر ایک پرانا سا گدا بچھا ہوا تھا دیوار کی دوسری طرف ایک کائی زدہ مٹکہ اور ایک گلاس موجود تھا لیکن کمرے میں کسی طرح کے پنکھے کا کوئی بھی وجود نہ تھا لیکن پنکھا نہ ہونے کے باوجود کاشف کو گرمی کا ذرا بھی احساس نہ تھا بلکہ اس کو ہلکی سی سردی محسوس ہورہی تھی جو کہ کاشف کے لئے نہایت ہی حیرت انگیز تھی۔

''کیا اس گھر میں تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے۔'' کاشف نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں لیکن تم پریشان نہ ہو صبح ہوتے ہی چلے جانا تم۔'' زاغونہ مسکرائی۔

''شکریہ۔ مگر کیا بستی کے دوسرے لوگ تمہارے کسی اجنبی مرد کی موجودگی پر اعتراض نہیں کریں گے۔''

''اوہ۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ یہاں کوئی کسی کے ذاتی معلامات میں دخل نہیں دیتا۔'' زاغونہ نے جواب دیا۔

''مجھے حیرت ہے۔''

''اوہ۔ تم اس کی فکر نہ کرو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کے لئے لاتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ کاشف کا جواب سُنے بغیر ہی باہر نکل گئی۔

کاشف چند لمحوں تک پتھر کے بت کی طرح کھڑا رہا اور پھر طویل سانس لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اس کی چھٹی حس کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی لیکن وہ کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی گاڑی بھی خراب تھی اپنے آپ کو حالات

کے سپرد کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

زاغونہ اس کو آسیبی کمرے میں تنہا چھوڑ کر اس کے لئے کھانے پینے کا انتظام کرنے چلی گئی تھی کاشف کو چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ اچانک اس کو قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے سر اُٹھا کر دیکھا تو زاغونہ ہاتھ میں ایک تھال لئے کھڑی نظر آئی، زاغونہ کو دیکھ کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی زاغونہ نے اپنے جسم پر ستر پوشی کے لئے صرف ایک چادر اوڑھ رکھی تھی چادر سے اس کے جسم کی رعنائیاں پھوٹ پڑ رہی تھی کاشف کی نظریں ازخود جھک گئی تھیں زاغونہ نے چہرے پر بہت ہی گہرے قسم کا میک اپ کر رکھا تھا اس سے قبل زاغونہ کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔

''لو۔ بابو۔ کھانا کھاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے کاشف کی جانب تھال بڑھا دیا۔

کاشف نے فوراً ہاتھ بڑھا کر تھال لیا تو کاشف کے ہاتھوں کی انگلیاں اس کے ہاتھوں سے ٹکرا گئیں انگلیاں اس کے ہاتھوں سے ٹکراتے ہی کاشف کو حیرت کا ایک شدید جھٹکا سا لگا تھا زاغونہ کا ہاتھ بے حد گرم تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی تپتے ہوئے لوہے سے اس کے ہاتھ ٹکرا گئے ہوں۔

کاشف نے حیرت بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں لیکن زاغونہ اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر مسکرا کر بولی۔

''مجھے۔ بخار ہے بابو۔۔۔''

''کاشف اس کی بات پر چونک پڑا اور بولا اتنے تیز بخار کے باوجود تم میری مدد کے لئے۔ کہیں سے بھی تمہاری باتوں سے مجھے ایسا نہیں لگا کہ تم بیمار ہو۔'' کاشف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں کیا کروں بابو۔ میں ایسی ہی ہوں کسی کو تکلیف میں دیکھ کر اپنا درد بھول جاتی ہوں۔'' زاغونہ نے مسکرا کر کہا۔

کاشف نے کوئی جواب نہ دیا اور کھانے کی سمت توجہ کر لی، تھال میں چاول تھے اور ان میں بوٹیاں تھیں۔

''تم کھاؤ میں دو منٹ میں آتی ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

چاول واقعی مزیدار تھے اتنے لذیذ چاول تو اس نے شہر میں بھی نہیں کھائے تھے کاشف کھانے میں مشغول تھا کہ زاغونہ پھر اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی اس بار اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ تھا جس میں کوئی مشروب تھا۔

''بابو۔ تمہارے لئے یہاں کی ایک خاص چیز لائی ہوں پی کر جی خوش ہو جائے گا تمہارا۔'' اتنا کہہ کر اس نے وہ پیالہ کاشف کے ہاتھ میں تھما دیا کاشف جو کہ چاول ختم کر چکا تھا مشروب کا پیالہ لے کر مسکرایا اور بولا۔

''بہت شکریہ تمہارا۔ زاغونہ چاول بہت لذیذ ہیں۔'' اتنا کہہ کر اس نے دیکھے بغیر ہی مشروب سے منہ لگا لیا۔

مشروب جیسے ہی کاشف کے حلق سے نیچے اترا تو زاغونہ کے ہونٹوں پر نہایت ہی پراسرار قسم کی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

مشروب کا ذائقہ نہایت تلخ تھا لیکن تھا وہ بھی مزیدار مشروب پیتے ہی کاشف کی آنکھیں خمار آلود ہو گئیں اب پہلی بار کاشف نے زاغونہ کو بدلی ہوئی نظروں سے دیکھا جبکہ زاغونہ پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی کاشف نے زاغونہ کا ہاتھ پکڑ لیا زاغونہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی زاغونہ نے کوئی تعرض نہ کیا یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ان معاملات کے لئے پہلے سے تیار ہو۔ زاغونہ نے اپنے جسم سے لپٹی ہوئی چادر اتار پھینکی اور کچھ ہی دیر بعد کمرے کے آسیب زدہ ماحول میں خمار آلود سسکاریاں گونج رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

زندگی میں پہلی بار کاشف نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی غیر عورت کی قربت حاصل کی تھی ورنہ کاشف نے اپنی بیوی کے سوا کسی نامحرم کو آج تک ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن زاغونہ کے پلائے ہوئے مشروب میں نہ جانے کیا بات تھی جس نے کاشف کی ساری پارسائی کو ہمیشہ

کے لئے داغدار کردیا تھا کافی دیر تک کاشف اور زاغونہ کے درمیان قرب کا ماحول رہا اس کے بعد کاشف تھک کر سو گیا تھا۔

اچانک ایک تیز قسم کی چبھن سے کاشف کی آنکھ کھل گئی درد کا شدید احساس کاشف کو اپنے جسم میں محسوس ہو رہا تھا چبھن کا احساس کاشف کو اپنی گردن کے پاس ہو رہا تھا ساتھ ہی کاشف کو کوئی ٹھنڈی سی شے اپنی گردن کے پاس بہتی محسوس ہو رہی تھی کاشف نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا تو خوف سے اس کی چیخ نکل گئی زاغونہ برہنہ حالت میں کاشف کو اپنے اوپر جھکی نظر آئی زاغونہ کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر تھا جو کہ خون سے بھرا ہوا تھا اور زاغونہ کے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا۔ کاشف کو یہ سمجھنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ زاغونہ خون آشام ہے اور خنجر کی مدد سے لوگوں کی گردنوں پر چیرا لگا کر ان کا خون پیتی ہے چبھن کا احساس اسی خنجر کا تھا کاشف نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے زاغونہ کو دھکا دیا اور چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا کاشف کی گردن سے خون نکل رہا تھا جس سے اس کی پوری بنیان بھیگ چکی تھی۔

دھکا لگتے ہی زاغونہ دوسری طرف جا گری تھی کاشف نے فوراً اپنی بنیان اتاری اور گردن کے گرد باندھ دی تھی تاکہ خون کا اخراج رک سکے زاغونہ چلاتی ہوئی اُٹھی لیکن کاشف نے فوراً ہی اس کمرے سے باہر نکلنے میں عافیت سمجھی تھی۔

''بابو۔ بابو۔ میں بہت پیاسی ہوں۔ تمہارا خون بہت لذیذ ہے اب تو سڑک پر کوئی بھی نہیں آتا تم آئے ہو تو ہماری پیاس بجھے گی۔'' زاغونہ خمار آلود لہجے میں بڑبڑائی۔

زاغونہ چلاتی ہوئی کاشف کے پیچھے بھاگی تھی کاشف بھاگتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں گھس گیا تھا کاشف کا دل ایک عجیب انداز میں دھڑک رہا تھا اس کو اب پتہ لگ گیا تھا کہ اس سڑک پر لوگوں کی لاشیں جو ملتی ہیں وہ ان روحوں کی مرہون منت ہیں، کاشف جس کمرے میں گھسا تھا اس کمرے میں بھی ویسی ہی موم بتیاں روشن تھیں جو کہ زاغونہ والے کمرے میں روشن تھیں۔ جس سے کمرے کا ماحول آسیبی اور پراسرار ہو رہا تھا کاشف نے کمرے کا جائزہ لیا تو کمرے کے اندر کی چیزیں دیکھ کر وہ مزید دہشت زدہ ہو گیا۔

کمرے کے اندر لاتعداد انسانی کھوپڑیاں اور ڈھانچے موجود تھے جن کا ڈھیر ایک دوسرے کے اوپر تھا نہ جانے کن بدنصیب انسانوں کو مار کر ڈھانچوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا کاشف فوراً ہی ان ڈھانچوں کے پیچھے جا چھپا کاشف کسی بھی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ زاغونہ اس کے تعاقب میں آگے ہی نکل گئی تھی کاشف کو ڈھیر کے پیچھے چھپے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک عجیب سی آواز سن کر کاشف چونک گیا۔ وہ آواز کاشف کو اس ڈھیر سے آ رہی تھی وہ آواز نہایت عجیب سی تھی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی جیسے کوئی سخت تکلیف میں ہو۔ بیمار ہو، کاشف نے چونک کی ادھر اُدھر دیکھا تو اس کو ڈھیر میں حرکت ہوتی محسوس ہوئی ڈھیر اپنی جگہ چھوڑتا جا رہا تھا۔

اچانک کاشف نے اس ڈھیر کے وسط سے ایک ہاتھ کو برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ برآمد ہوتے ہوئے ہاتھ کو دیکھ کر کاشف کی چیخ نکل گئی اور اس کی تھرتھری چھوٹ گئی۔ جو جگہ جگہ سے زخمی تھا اور خون اور چربی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک انسانی وجود تھا جو کہ آہستہ آہستہ باہر آ رہا تھا۔ اس انسانی وجود کو دیکھ کر کاشف اپنی چیخوں پر قابو نہ رکھ پایا۔ وہ انسانی وجود تھا ہی اتنا خوفناک اس کا پورا جسم جگہ جگہ سے زخمی تھا جس سے خون اور چربی جھانک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جگہ بڑے بڑے ڈیلے تھے اور سفید دانتوں کی طویل قطار جھانکتی نظر آ رہی تھی۔ وہ خوفناک انسان کاشف کی جانب بڑھا۔ وہ ڈھانچوں پر پیر رکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جس بھی ڈھانچے پر پیر رکھتا ایک چیخ کی آواز بلند ہوتی۔ چیخ ان ڈھانچوں سے بلند ہو رہی تھی۔ وہ آگے بڑھتا جاتا کاشف نے سوچا کہ اگر میں جان بچا کر بھاگا نہیں تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ وہ خوفناک انسان کاشف کے قریب پہنچا اور اس نے

کاشف کی گردن پر ہاتھ ڈال دیا۔

اُسی پل کاشف کی حاضر دماغی کام آئی اور کاشف جھکائی دے کر بچ گیا اور گھوم کر کاشف نے ایک بھرپور لات اس کی پیٹھ پر ماری اور بھاگ کھڑا ہوا کاشف نے یہ دیکھنے کی بھی توفیق نہ کی کہ اس کی لات کا انجام کیا ہوا۔ جیسے ہی کاشف کمرے سے باہر نکلا سامنے زاغونہ کھڑی نظر آئی زاغونہ کاشف کو دیکھ کر مکروہ انداز میں ہنسی اور چیختی ہوئی کاشف کی طرف بھاگی کاشف پلٹا تو یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کے پیچھے وہی خوفناک انسان کھڑا نظر آیا۔

صورتحال اب یہ تھی کہ کاشف کے سامنے زاغونہ اور پیچھے وہی خوفناک انسان کھڑا تھا موت کاشف سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھی کاشف بھاگنا چاہتا تو بھاگ نہیں سکتا تھا۔

''زلموس۔ دفع ہوجا یہاں سے یہ میرا شکار ہے۔'' زاغونہ اس خوفناک انسان کی جانب دیکھ کر بولی اس کی آواز سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔

جواباً اس خوفناک انسان کے لب ہلے۔ اس کا منہ کھلا، منہ کھلتے ہی کاشف نے دیکھا کہ اس کے منہ سے شعلے نکل گئے۔

''یہ تیرا نہیں زاغونہ۔ رامونہ دیوی کا شکار ہے۔ تو ایک حقیر سی داسی جس کو کھرچن مل جائے غنیمت ہے وہ پورا ہڑپنا چاہتی ہے۔'' زلموس کے حلق سے کھوکھلی اور چیختی ہوئی آواز نکلی۔

رامونہ کا نام سن کر کاشف چونک پڑا کیونکہ یہ اسی پتھر کے مجسمے کا نام تھا کاشف نے دیکھا کہ رامونہ کے نام پر زاغونہ کے چہرے پر مردنی دوڑ گئی تھی چند لمحے تک وہ سوچتی رہی اور پھر بولی۔'' کچھ بھی ہو اس کے خون سے صرف میری ہی پیاس بجھے گی۔'' زاغونہ کا لہجہ حتمی تھا۔

''لگتا ہے تم کو سبق سکھانا ہی ہوگا۔'' اتنا کہہ کر زلموس نے زاغونہ کی جانب بھاگنا شروع کردیا اس کو بھاگتے دیکھ کر بالکل ہی ایک طرف ہوگیا۔ زاغونہ نے زلموس کی طرف بھاگنا شروع کردیا۔ دونوں ہی اچھل کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے کاشف موقع جان کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

جیسے ہی وہ اس کھنڈر نما مکان سے باہر نکلا اُس کے سامنے ایک دوسرا مکان تھا جو کہ بالکل اسی طرز کا تھا۔ ابھی کاشف کھڑا ہی تھا کہ ایک تیز چیخ سن کر وہ اچھل پڑا۔ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ کسی عورت کی تھی کاشف کو ایسا لگا کہ جیسے کہ چیخنے والی کو بڑی ہی بے دردی سے ذبح کیا جارہا ہو۔ اس کا دل یکبارگی اچھل کر حلق میں آگیا کاشف اپنی تکلیف بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ غیر انسانی مخلوق کے نرغے میں پھنس گیا تھا جو اس کے حصول کے لئے آپس میں لڑ پڑے تھے نہ جانے ان کی لڑائی کا انجام کیا ہوا۔

کاشف ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ کیا کرے چیخ پھر بلند ہوئی تھی اس بار وہ چیخ پہلے سے زیادہ دردناک تھی وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہاں کہیں پر کوئی مجبور عورت پر ظلم ڈھایا جارہا ہے اس کا دل اس مظلوم عورت کی مدد پر آمادہ ہونے لگا تھا چنانچہ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تاکہ وہ اس مظلوم کی مدد کرسکے جو شاید اسی کی طرح ورغلا کر لائی گئی تھی۔

وہ اذیت ناک چیخ پھر سنائی دی جس کو سن کر کاشف کے جسم میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی خوفزدہ دل و دماغ میں انسانی ہمدردی غالب آگئی اس کے خیال کے مطابق وہ چیخ اسی کھنڈر نما مکان سے بلند ہوئی تھی۔

کاشف فوراً ہی اس مکان میں داخل ہوگیا یہ سوچے بغیر کہ وہ تو خود مصیبت زدہ ہے پھر اس کی مدد کیسے کرے گا۔

بہرحال یہ کاشف کے لئے مشکل تھا اندر داخل ہوتے ہی کاشف چونک گیا۔ پورا مکان خالی تھا جیسے ان میں کوئی رہتا نہ ہو۔ کیا اس مکان کے مکین کانوں میں تیل ڈال کر سو رہے تھے یا بہت زیادہ خودغرض تھے کہ کسی مظلوم کی چیخیں بھی ان کو متاثر نہیں کررہی تھیں۔

اچانک کاشف کے کانوں نے پھر وہی چیخ سنی جس کو سن کر کاشف چونک گیا اس کو ایسا لگا کہ چیخ کی آواز زمین کے اندر سے آرہی ہو۔ کاشف جس جگہ کھڑا تھا چیخ

بالکل ٹھیک اسی کے نیچے سے سنائی دے رہی تھی اچانک کاشف اچھل پڑا اور پیچھے ہٹ گیا گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ فرش نیچے کی طرف دب رہا تھا جیسے اس میں راستہ بن رہا ہو کاشف کے لئے یہ نئی پریشانی تھی۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد سارا فرش اندر دب گیا۔ وہ ایک زینہ سا تھا جو کہ نیچے کی طرف اتر رہا تھا جو کہ ایک تہہ خانہ کا راستہ تھا کاشف شش وپنج میں پڑ گیا کہ نیچے اترے یا نہیں لیکن اس نے اللہ کا نام لیا اور زینہ پر قدم رکھ دیا جیسے ہی کاشف نیچے پہنچا اسی لمحے کاشف کے قدم تہہ خانے کے فرش سے چپک کر رہ گئے ہوں سامنے والا منظر ہی اتنا لرزہ خیز تھا کہ خوف سے کاشف کی آنکھیں اُبل پڑیں۔

☆.....☆.....☆

جو منظر کاشف کی آنکھوں نے دیکھا وہ اتنا لرزہ خیز اور روح فرسا تھا۔ تہہ خانہ کی دیوار کے ساتھ پتھر کا رامونہ بت کھڑا تھا جو کہ کاشف نے بستی میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا اس کے بالکل سامنے چوبی شکنجے سے ایک نیم برہنہ نوجوان عورت جکڑی ہوئی تھی اس عورت کے چہرے سے درد وکرب کا زبردست اظہار ہو رہا تھا آنکھوں میں اذیت وخوف کے ملے جلے سائے لہرا رہے تھے کاشف اس عورت کو دیکھ کر چونک گیا، اس نے اس کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی کیونکہ کاشف ہزاروں بار اس کی تصویر نیوز چینل اور اخباروں میں دیکھ چکا تھا یہ وہی لڑکی تھی جو کچھ عرصہ قبل اپنی شادی چھوڑ کر ایک لڑکے کے ساتھ فرار ہوگئی تھی بعد میں اس لڑکے کی لاش ملی تھی اور لڑکی لاپتہ ہوگئی تھی یہ صدف تھی۔

شکنجے کے قریب ہی ایک بڑے سے کھڈے میں آگ دہک رہی تھی ایک ادھیڑ عمر مضبوط اور سفاک قسم کا خوفناک شخص ہاتھوں میں دہکتی سلاخیں لئے صدف کی جانب بڑھ رہا تھا صاف ظاہر تھا کہ وحشی انسان اس کے خوب صورت اور نازک جسم کی چربی پگھلانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس تہہ خانے میں اور بہت سے لوگ اس آگ کے گرد دائرے کی صورت میں کھڑے تھے سب کے سب برہنہ حالت میں تھے ان سب کے چہروں پر عقیدت نمایاں تھی وہ سفاک شخص ہی صرف پورے کپڑوں میں تھا وہ کپڑے ایسے تھے جو کہ کسی مندر یا معبد کے پجاری وغیرہ پہنتے ہیں صرف ایک چوغہ تھا جو کہ اس نے پہن رکھا تھا اگلے پل ہی اس سفاک بوڑھے نے جس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی سرخ سلاخ تھی۔ اس نے مڑ کر کاشف کی جانب دیکھا تو دوسرے ہی پل کاشف لرز کر رہ گیا۔ اس کو اپنے جسم کا سارا خون اپنی ہی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا۔

اوہ۔۔۔ وہ سرد آنکھیں جن میں سفاکیت بھری تھی وہ ان آنکھوں میں کاشف کو سانپ کی تیز اور خوفناک چمک لہراتی ہوئی نظر آرہی تھی اس کے منحوس اور شیطانی چہرے پر درندگی رقص کرتی نظر آرہی تھی اس کے کالے کالے موٹے ہونٹوں پر نہایت ہی شیطانی قسم کا تبسم کھیل رہا تھا۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' وہ کاشف کی طرف دیکھ کر عجیب پھٹی ہوئی غیر انسانی آواز میں بولا۔

''میرا۔'' کاشف کا دل خوف سے کانپ گیا۔

''ہاں تمہارا۔'' وہ مسکرایا۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے اور تم کو آنا ہی تھا۔''

اس کی بات سن کر خوف کی ایک تیز لہر کاشف کے جسم میں دوڑ گئی اور اس کا رہا سہا حوصلہ بھی پست ہوگیا پتہ نہیں اس منحوس چہرے پر ایسی کیا بات تھی کہ ایک انسان نظر آنے کے باوجود وہ اور انسانوں سے مختلف تھا اس کی آواز غیر انسانی اور کھوکھلی تھی زاغونہ کی آواز کی طرح کاشف کا دل دہشت سے بھر چکا تھا۔

''نوجوان۔ اس لڑکی کے بعد تمہارا ہی نمبر ہے وہ تو زاغونہ نے غداری کردی وگرنہ تم وہاں سے بھاگ نہیں سکتے تھے۔'' بوڑھا مسکرا کر بولا۔

زاغونہ کا نام سن کر کاشف کو یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس زاغونہ اور زلموس کو اس کے حصول کے لئے لڑتے ہوئے دیکھا کاشف دل میں سوچنے لگا کہ زاغونہ ہے کہاں۔ مگر کاشف یہ سوال پوچھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ بوڑھا کاشف کے دل کی بات جان کر بولا۔

''ادھر دیکھو نوجوان۔'' بڈھے نے اس لڑکی کے

دائیں جانب اشارہ کیا۔

کاشف نے دوسری طرف دیکھا تو زاغونہ فرش پر پڑی تڑپتی نظر آئی۔ زاغونہ کے پورے جسم پر وہی سفید کیڑے چپکے ہوئے تھے جو زاغونہ کے جسم کو چاٹ رہے تھے اور یاس ہی زلموس کھڑا تھا۔ زاغونہ کے چہرے پر شدید قسم کی تکلیف کے تاثرات نظر آرہے تھے۔

''یہ اس کی غداری کی سزا ہے۔'' بوڑھا سفا کی سے مسکرایا۔

''کیسی۔ غداری۔'' کاشف کے منہ سے ازخود نکلا۔

''ہاں۔ غداری۔'' بڈھا غصے سے بولا۔ وہ تمہارا خون اکیلے ہی پینا چاہتی تھی وہ جانتی تھی کہ تمہارا خون دیو ی رامونہ کی امانت ہے۔ مگر تم بھاگ نکلے اور اب اس کو اس جرم کی سزا ملے گی۔'' بوڑھا غصے سے بولا۔

کاشف نے کوئی جواب نہ دیا بس ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''رحم۔ رحم۔ مقدس راعون۔'' زاغونہ کے حلق سے درد میں ڈوبی آواز نکلی۔

''تو جانتی ہے زاغونہ ہماری کتاب میں رحم نہیں تیری وجہ سے رامونہ کی صدیوں پرانی خواہش دم توڑ دیتی۔ اب۔ چل اس آگ میں کود جا۔ جو کہ اب صدیوں تک تیرا مقدر بنادی گئی ہے۔'' بوڑھا قہر آلود لہجے میں دھاڑا۔

کاشف یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہ کرسکا کہ رامونہ کون ہے وہ تو پہلے ہی خوف کا شکار تھا۔

''نن۔ نہیں۔ یہ آگ۔'' زاغونہ خوف سے بڑبڑائی۔

''تو جانتی ہے۔ یہ مقدس آگ ہمارے جلانے کے بجائے ہماری روحوں کو اذیت دے گی کیونکہ ہم تو پہلے ہی مر چکے ہیں۔'' بوڑھا بڑبڑایا۔

''مر چکے ہیں۔'' کاشف چونکا۔

''ہاں۔ نوجوان بہت سال پہلے اس بستی میں طاعون کی بیماری پھیلی تھی جس سے سارے لوگ مارے گئے تھے چونکہ ہم لوگ ڈکیت تھے اس لئے حکومت نے ہماری مدد نہیں کی تھی اس لئے کوئی امداد نہ ملنے کے سبب سب کے سب لوگ مارے گئے بچے بوڑھے عورتیں۔ ہم شروع سے مقدس رامونہ کے پجاری تھے رامونہ کے لئے خون فراہم کرنا ہماری ذمہ داری تھی اس لئے جو بھی ہمارے شکنجے میں پھنس جاتا وہ رامونہ کی بھینٹ چڑھ جاتا طاعون کی وجہ سے ہم لوگ مارے گئے مگر ہماری روحوں کو مقدس رامونہ نے فنا ہونے نہیں دیا۔ پھر ہم باہر کے لوگوں سے بدلہ لینے لگے لوگ اپنی گاڑیوں میں یہاں آتے ہم ان کے جسم کا سارا خون پی لیتے اور لاش لوگوں میں خوف پیدا کرنے کے لئے سڑک پر چھوڑ دیتے۔ ہم چاہتے تو لاش لے جانے والے بھی ہمارا شکار بن سکتے تھے مگر جان بوجھ کر دہشت کے لئے ان کو چھوڑ دیتے تاکہ لوگوں میں خوفناک ہراس پھیلے''۔

اس کی بات سن کر کاشف کی آنکھیں خوف سے ابل پڑیں یہ اس کے باعث دہشت تھا کہ وہ خون آشام روحوں کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ بوڑھا چند لمحے تک زاغونہ کو دیکھتا رہا اور پھر بولا۔

''زاغونہ چل۔ شاباش چھلانگ لگا آگ میں وگرنہ تیری سزا کی مدت بڑھادی جائے گی اور دو سو سال کی جگہ چار سو سال تک آگ میں رہنا پڑے گا۔'' بوڑھا غصے سے بولا۔

زاغونہ کی آنکھوں میں مردنی دوڑ گئی دوسرے ہی پل وہ تڑپتے ہوئے اُٹھی اور مرے مرے قدموں سے اس کھڈے میں چھلانگ لگادی۔ زاغونہ کے کھڈ میں گرتے ہی تہہ خانے کا گھٹا گھٹا ماحول غیر انسانی چیخوں سے گونج اُٹھا تھا۔

منظر بہت خوفناک تھا جس کو سن کر صدف کی چیخیں نکل گئیں۔ صدف کی چیخ سن کر وہ مردود بوڑھا یوں چونکا جیسے صدف کو فراموش کر بیٹھا ہو۔ دوسرے پل اس کی آنکھوں میں طاغوتی قوتیں رقص کرنے لگیں اور بوڑھا دوبارہ جلتی ہوئی سلاخیں لئے صدف کی جانب بڑھنے لگا تھا صدف کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا صدف

کاشف کی جانب ترحم نظروں سے دیکھنے لگی تھی لیکن کاشف چاہنے کے باوجود اس کی مدد نہ کر پایا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس خونی بوڑھے نے وہ سلاخ صدف کی گردن میں گھونپ دی صدف کی دلخراش چیخ نکلی اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا تھا صدف کی گردن سے اور کمرے کے گھٹے ہوئے آسیب زدہ ماحول میں جلے ہوئے گوشت کی چراند پھیل گئی۔ صدف کی آنکھیں پھٹ پڑجانے کی حد تک ابل پڑی تھیں چہرے پر تشنج کی کیفیت نظر آنے لگی اور پھر صدف کی گردن ڈھلک گئی اور پھر صدف نے دم توڑ دیا۔

صدف کی عبرت ناک موت دیکھ کر کاشف کی آنکھوں میں آنسو آگئے کاشف چاہنے کے باوجود بھی صدف کو نہیں بچا سکا تھا۔ چنانچہ کاشف کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی تھی چنانچہ کاشف یہ منظر دیکھ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

''نوجوان رک جاؤ۔ کہاں جارہے ہو۔''

کاشف نے اپنی پشت سے اس بوڑھے کی کھوکھلی اور غیر انسانی آواز سنی لیکن کاشف نے پروانہ کی بس وہ تو اس منحوس جگہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جیسے ہی کاشف بھاگا کاشف کو ایسا لگا کہ جیسے اُس کے پیچھے بہت سے ان دیکھے سائے لگ گئے ہوں بھاگتے ہوئے اس نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا تو دوسرے ہی پل اس کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہونے لگا تھا وہ انسانی ڈھانچے تھے جو کہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور کاشف کے پیچھے چلاتے ہوئے بھاگ رہے تھے سب سے آگے وہ فریبی بوڑھا تھا جو چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کاشف نے یہ سب دیکھا اس کے حلق سے بھی چیخوں کی آوازیں نکلنے لگی تھیں کاشف آگے آگے تھا وہ خونی ڈھانچے اس کے پیچھے تھے کچھ ہی لمحوں کے بعد کاشف رامونہ کے اس بت کے پاس پہنچ گیا جو اس نے بستی میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا ڈھانچے اب کافی پیچھے تھے چنانچہ کاشف اس بت کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا۔

رات اب گہری ہو چکی تھی کاشف کو امید تھی کہ اس اندھیری رات میں وہ اتنی جلدی نہیں پکڑا جائے گا کاشف کے اندازے کے مطابق رات کے بارہ سے اوپر کا وقت تھا کاشف کا سانس بے حد تیزی سے چل رہا تھا۔

شدید قسم کی نقاہت، پیاس اور تھکن سے اس کا برا حال تھا اس کو بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی اس کو اپنے اردگرد ان گنت بھٹکتی روحیں چکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ خوف نے اس کے اعصاب کو چٹخا کر رکھ دیا تھا دور دور تک کسی متنفس کا پتہ نہ تھا نہ جانے اس کے تعاقب میں لگے وہ ڈھانچے اور اور شیطان بوڑھا کہاں چلا گیا تھا۔

اچانک کاشف کو زاغونہ کی یاد آئی جو اس کے خون کو دیوی پر بھینٹ کرنے کے بجائے اکیلے ہی پینا چاہتی تھی۔ پکڑے جانے پر زاغونہ کو آگ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ صدف کا چہرا بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جس کی آنکھوں میں شادی کے ارمان مچلے تھے مگر ان خونی بھیڑیوں نے وقت سے پہلے ہی ان ارمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔

کاشف کو بیٹھے کافی دیر ہو چکی تھی اور کاشف کا تھکاوٹ سے برا حال تھا ڈھانچے بھی شاید مایوس ہو کر جا چکے تھے کاشف نے انگڑائی لی تو بت کی دیوار ایک گڑگڑاہٹ سے پیچھے کی طرف ہٹنے لگی تھی کاشف چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا بت کے اندر ایک زینہ نیچے کی طرف جارہا تھا اچانک کاشف کا پیر پھسلا کاشف لڑھکتا ہوا زینہ سے نیچے جا گرا۔ کاشف کے نیچے گرتے ہی دروازہ بند ہو گیا دروازہ بند ہوتے ہی اندر گھپ اندھیرا چھا گیا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کاشف کراہ کر اُٹھا اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن کچھ دکھائی نہ دیا کاشف کو ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی اچانک کاشف کو عجیب سی ناگوار بو محسوس ہوئی جیسے کہ جمے ہوئے خون سے آتی ہے۔

''یاالٰہی۔ یہ کیا ماجرا ہے۔ میں کس گورکھ دھندے میں پھنس رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی پراسرار واقعات میرے ذہن کو غیر متوازن کر دیں۔''

کاشف از خود بڑبڑایا۔

اچانک روشنی کی ایک ننھی سی کرن نظر آئی جو کہ اس کے بالکل سامنے نظر آرہی تھی وہ کرن لال رنگ تھی جو بالکل کسی جگنو کی طرح چمکی تھی پھر اس روشنی کا قطر بڑھتا ہی چلا گیا وہ روشنی اتنی بڑھی کہ اس جگہ کی ہر چیز کاشف کو بہت صاف اور واضح نظر آنے لگی تھی۔ جو کچھ کاشف کو نظر آیا اس کو دیکھ کر کاشف دہشت زدہ سا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ منظر تھا ہی اتنا خوفناک اور ہولناک کہ کاشف کو وہ سارے خوفناک تجربات فراموش ہوگئے۔ وہ ایک تنگ و تاریک کمرہ تھا جس کی دیواروں پر عجیب جانوروں کی تصویریں جس میں بلی نمایاں تھی اور اشاروں کی زبان میں نہ جانے کیا کیا لکھا تھا اس تنگ و تاریک کمرے کے وسط میں سنگ مرمر کے چبوترے پر ایک تابوت رکھا تھا جس کا ڈھکن کھلا تھا تابوت کے بالکل سرہانے کی جانب ایک حنوط شدہ ممی کی لاش مجسمہ کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی اس ممی کے پھیلے ہوئے دونوں ہاتھوں میں پتھر کا پتیلہ نما کوئی برتن موجود تھا جو کہ جھکا ہوا تھا اس برتن سے بوند بوند کر کے خون اس تابوت میں گر رہا تھا۔ تابوت کے چاروں پایوں پر موم بتیاں روشن تھیں موم بتیاں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی اس نے زاغونہ کے کمرے میں دیکھی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ وہ موم بتیاں چار چھوٹے چھوٹے شمع دانوں میں روشن تھیں۔ کاشف نے آگے بڑھ کر اس تابوت میں جھانکا تو خوف سے اس کی کپکپی چھوٹنے لگی تھی تابوت کے اندر حنوط شدہ انسانی لاش موجود تھی جو کہ کسی عورت کی تھی وہ لاش تازہ تازہ حنوط کی ہوئی لگتی تھی۔

لاش کا منہ کھلا تھا جس میں وہ خون قطرہ قطرہ کر کے گر رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ منظر نہایت ہی خوفناک تھا خون اس حنوط شدہ لاش کے منہ میں جاتا خون اس منہ میں گرتا اور پھر نہ جانے کہاں غائب ہوجاتا۔ کاشف حیرت و خوف سے خوفناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اس سرہانے کھڑی ممی کے حلق سے ایک ڈراؤنی غراہٹ کی آواز بلند ہوئی۔ آواز سنتے ہی کاشف کے حلق سے چیخ نکلی کاشف نے بھاگنا چاہا۔ لیکن اس کے پیر جیسے زمین سے چپک گئے تھے اس ممی نے سر اُٹھایا اور مشینی انداز میں کاشف کی جانب گردن گھمائی اس کی آنکھیں دیکھ کر کاشف کے حلق سے چیخ نکل گئی وہ آنکھیں کاشف کو جلتی ہوئی نظر آئی تھیں۔ اس ممی کے لب ہلے کاشف کے کانوں نے کھوکھلی اور غیر انسانی آواز سنی جسے سن کر کاشف تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

''تم صرف مر کر یہاں سے نکل سکتے ہو۔ اس لئے چپ چاپ اپنے آپ کو بستی کی روحوں کے حوالے کردو۔''

اس کی بات پر کاشف نے ایک طویل سانس لی اور دل میں سوچا کہ یوں ڈرتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا مرنا تو ہے کیوں نہ مقابلہ کر کے مروں شاید بچنے کی کوئی صورت نظر آجائے۔ چنانچہ کاشف بولا۔

''زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے تم بدروحوں کے ہاتھ میری موت ہے تو کوئی بچا نہیں سکتا اور زندگی ہے تو کوئی مار نہیں سکتا۔ چنانچہ میں لڑوں گا اور بھاگنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔'' کاشف نے سنجیدگی سے کہا۔

جواب میں کاشف کو ایک گرجتا ہوا قہقہہ سنائی دیا تھا جس میں تضحیک کا عنصر نمایاں تھا۔

اچانک وہی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''اچھی بات ہے کوشش کر کے دیکھو۔''

''یہ سب کیا ہے۔'' کاشف نے تابوت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

جواب میں کچھ لمحے تک خاموشی چھائی رہی اور پھر وہی آواز دوبارہ اس کے کانوں نے سنی۔

''بتانا تو ضروری نہیں ہے۔ مگر مرنے والے کی آخری خواہش ضرور پوری کی جاتی ہے جو کہ اصول ہے۔'' وہی کھوکھلی آواز کاشف کے کانوں سے ٹکرائی۔

''ہم مصر کے سب سے قدیم دیوتاؤں کے پجاری ہیں ان کی پوجا وہی لوگ کرتے ہیں جو جادو ٹونہ اور کالے علم میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں دیوی

رامونہ مصر کی سب سے قدیم ساحرہ تھی وہ قدیم دیوتاؤں کی پجارن تھی اور دیوتاؤں نے اس کو بہت سی قوتیں بخشی تھیں۔ لیکن رامونہ دیوی مصر کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتی تھی اس کا ماننا تھا کہ حکومت کرنے کا حق صرف اس کو ہے جو طاقتور ہو۔ جس کو کبھی موت نہ آئے چنانچہ رامونہ دیوتاؤں کی دن رات پرستش کرنے لگی دیوتاؤں نے خوش ہوکر ہمیشہ زندہ رہنے کا راز بتادیا۔ ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے اس کو نوجوانوں کے خون سے غسل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ مصر کے نوجوانوں کو اپنے حسن وجوانی کے جال میں پھانس کر ان کے خون میں غسل کرتی رہی۔

مصر کے نوجوانوں کی پراسرار طور پر غائب ہوجانے پر حکومت چوکنا ہوگئی اور ایک روز اس کو غسل کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا گیا اور پھر رامونہ دیوی کو مصر کی سب خطرناک سزا دی گئی مقدس پانی کی مدد سے اس کا سارا جادو سلب کرلیا گیا اور اس کو زندہ ممی بنا کر تابوت میں دفنا دیا گیا اور مقدس کیڑے اس پر چھوڑے گئے تاکہ وہ اس تابوت سے نکل نہ سکے، رامونہ کے پرستار بے بس تھے وہ لوگ وقت کا انتظار کرتے رہے۔ ہزاروں سال گزر گئے حکومتیں ختم ہوگئیں۔ لیکن مقدس رامونہ دیوی کی روح ختم نہ ہوسکی پھر پچاس سال قبل تمہارے ملک کے آرکیالوجسٹ مصر کی قدیم تاریخ پر ریسرچ کرتے ہوئے رامونہ دیوی کے اہرام تک پہنچ گئے اور اہرام اور رامونہ دیوی کو دنیا کے سامنے پیش کردیا پوری دنیا میں تہلکہ مچ گیا اس مقدس تابوت کو اہرام سے نکال کر تمہارے ملک لایا گیا جہاں رامونہ کے وہ پرستار جو صدیوں سے رامونہ کے باہر آنے کا انتظار کررہے تھے ان میں اس خبر سے تہلکہ مچ گیا رامونہ کے پرستاروں نے اپنی جان پر کھیل کر تابوت کو چرایا اور یہاں اس علاقے میں لایا گیا پرستار اور گھر والے اپنی جانوں پر کھیل کر مقدس رامونہ کے لئے نوجوانوں کے خون کا انتظام کرتے رہے اور پھر ایک روز طاعون کی بیماری پھیلی اور سب لوگ مارے گئے لیکن مقدس اور یگاس نے ان کی روحوں کو مرنے نہ دیا اور رامونہ کے پرستار اپنا کام کرتے رہے اور آج تم وہ آخری انسان ہو جس کے خون سے رامونہ کی ممی کا غسل ہوگا اور وہ زندہ ہوجائے گی کبھی نہ مرنے کے لئے۔"

اتنا سننا تھا کاشف پر لرزہ طاری ہوگیا، وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ اس نے دیکھا کہ بہت سے ڈھانچے اور وہ بوڑھا کاشف کو تہہ خانے کے اندر آتے دکھائی دیئے وہ شیطان بوڑھا سب سے آگے تھا۔

"نوجوان۔ تم مل ہی گئے۔" بوڑھا سفاکی سے مسکراتا ہوا بولا۔

"مم۔ مجھے معاف کردو۔" کاشف نے منت کرتے ہوئے کہا۔

"ارے نوجوان بہادر۔ بنو۔ تم ابھی تو کہہ رہے تھے کہ تم اپنی زندگی کے لئے لڑو گے۔" بوڑھے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

کاشف نے کوئی جواب نہ دیا باہر جانے کا راستہ بھی کوئی نہ تھا۔ جو راستہ تھا اس پر وہ شیطانی ڈھانچے موجود تھے کاشف نے ادھر اُدھر دیکھا تو اس کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے موت کو اتنے قریب دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس کے آنسو دیکھ کر بوڑھا ہنس کر بولا۔

"نوجوان مرد ہوکر روتے ہو۔ میں نے تو سنا تھا کہ مسلمان کبھی نہیں روتا وہ ہر حال میں اپنے پالنے والے کا شکر ادا کرتا ہے۔ مگر تم گھبراؤ مت موت تم کو آرام سے ملے گی اس لڑکی کی طرح اذیت والی نہیں۔"

کاشف نے یہ سنا تو کانپ گیا کہ اس نے اب تک اللہ سے مدد مانگی نہیں تھی وہ تو ہر جگہ مدد کرنے والا ہے۔ چنانچہ کاشف نے دل ہی دل آیۃ الکرسی کی تلاوت شروع کردی۔

جیسے جیسے وہ تلاوت کرتا جاتا ویسے ویسے اس کے دل کو تقویت ملتی جاتی تھی کلام اللہ سے یہ ہوا کہ کاشف کا ڈر از خود ختم ہوگیا اس کو یقین ہوگیا اگر میری موت ہے تو کوئی بچا نہیں سکتا زندگی ہے تو کوئی مار نہیں سکتا۔

کاشف نے ادھر ادھر دیکھا اس کی نظر ان شمع دانوں پر پڑی جن میں موم بتیاں روشن تھیں کاشف نے آگے بڑھ کر ایک شمع دان کو اُٹھالیا اور جیسے ہی اس اس نے شمع دان کو اُٹھایا تو اس کو پہلی بار اس بوڑھے کی منحوس آنکھوں میں خوف نظر آیا تھا۔

''چچ۔ چھوڑ دو۔ اس مقدس شمع کو۔'' بوڑھا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

کاشف کو سمجھ نہیں آیا کہ اس شمع کی کیا وبلیو ہے جو اس کے چھوتے ہی بوڑھا اس قدر خوفزدہ نظر آرہا ہے۔

''مم۔ مجھے جانے دو۔ وگرنہ میں اس شمع کو توڑ دوں گا۔'' کاشف نے دھمکی دیتے ہوئے جواب دیا۔

کاشف نے شمع کو اس طرح اُٹھایا جیسے توڑ دے گا۔

''نن۔ نہیں۔ یہ توڑنا مت ورنہ ساری محنت مٹی میں مل جائے گی۔ رامونہ دیوی زندہ نہیں ہوسکے گی۔'' بوڑھے نے بدستور خوفزدہ لہجے میں کاشف سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ پھر مجھے جانے دو۔''

''نہیں۔ جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ نوجوان۔ اتنا کہہ کر بوڑھا چلاتے ہوئے اپنے ڈھانچوں سے بولا۔ ''چھین۔ لو اس مقدس شمع کو رامونہ کے پرستارو۔''

یہ دیکھ کر کاشف بوکھلا گیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا ڈھانچوں نے آگے بڑھ کر کاشف کو پکڑ لیا ڈھانچوں نے جیسے ہی کاشف کو گردن سے پکڑا کاشف کے حلق سے چیخ نکلی ساتھ ہی اس کے گردن کا زخم کھل گیا۔ زخم کے کھلتے ہی خون نکلنے لگا جو کہ ٹپکتا ہوا سیدھا رامونہ دیوی کے منہ کے کھلے ہوئے دہانے میں جا گرا تھا خون جیسے ہی ممی کے کھلے دہانے میں گرا بے جان ممی میں ہلکی سی حرکت پیدا ہوئی تھی جس حرکت کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ کاشف کے حلق سے چیخ نکلی اور اس کے ہاتھ سے شمع چھوٹ گئی۔

شمع کے نیچے گرتے ہی آگ بھڑک اُٹھی آگ کے بھڑکتے ہی کاشف نے دیکھا بوڑھے کی آنکھوں میں خوف تھا ایک ایسا جمود خوف جو کہ کامیابی کے قریب کے آنے کے بعد ناکامی ملنے پر ہوتا ہے تہہ خانے کی محدود فضا غیر انسانی چیخوں سے گونج اُٹھی تھی۔

بوڑھے کے حلق سے بھی چیخیں نکلنے لگی تھیں ساتھ ہی ساتھ ڈھانچوں میں بھی آگ بھڑک اُٹھی۔ آگ نے اس منحوس بوڑھے کو بھی نہیں بخشا تھا۔ وہ ممی جو سر جھکائے کھڑی تھی آگ کے شعلوں سے محفوظ نہیں تھی۔

کاشف موقع غنیمت جان کر بھاگ کھڑا ہوا، اور بھاگتے ہوئے کاشف نے دیکھا آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں وہ بوڑھا مرغ بسمل کی طرح ناچ رہا تھا اور ڈھانچے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، آگ بہت بڑھ چکی، باہر کی طرف کاشف بھاگنے لگا اس کا رخ اپنی گاڑی کی جانب تھا۔ گاڑی اسی حالت میں سڑک پر کھڑی تھی کاشف نے گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

کاشف نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کی چابی گھمائی تو گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ یہ چیز کاشف کے لئے باعث حیرت تھا کہ جب گاڑی رکی تو اس میں فیول میٹر زیرو شو کر رہا تھا اب فیول اتنی مقدار بتا رہا تھا کہ وہ باآسانی اپنے گھر تک پہنچ سکتا تھا۔

یہ ہونہ ہو انہی قوتوں کا کرشمہ تھا جو ہر گزرنے والی گاڑی کو اسی طرح روکا کرتے تھے۔

کاشف نے دل میں اللہ شکر ادا کیا کہ ان شیطانی قوتوں سے اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی تھی۔ کاشف نے کار واپس اپنے گھر کی جانب گھمالی تھی سارے واقعات جیسے اس کے ذہن میں کسی فلم کی طرح گھوم رہے تھے جن سے کاشف ابھی دوچار تھا۔

کاشف نے دیکھا کہ آگ کے بلند شعلے اس کو دور سے بھی دکھائی دے رہے تھے اور کاشف دل ہی دل میں اپنے پروردگار کا شکر گزار تھا کہ جس نے اس کی جان کی حفاظت فرمائی تھی۔

درندگی

محمد عثمان اشرف-راولپنڈی

خوبصورت لڑکی پر نوجوان کی نظر پڑتے ہی اس لڑکی کو گھورنے لگا، اس کی نظروں میں سفاکیت واضح نظر آرہی تھی اور آنکھوں میں ہوس کی چنگاریاں نکلنے لگیں کہ.....

ایک سفاک شخص کی درندگی کی داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کو لرزا کر رکھ دے گی

گل روتے روتے سو چکی تھی اور پھر جب اٹھی تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ ہاتھ منہ دھو کر کچن میں گئی۔ اپنے لئے کھانا گرم کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ خالی ذہن کے ساتھ لیٹ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں اس کو راضی کرنے کے لئے بھرپور کوشش کرے گی۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ ثریا بیگم آ گئی۔ گل دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن ثریا بیگم نے دوبارہ سے بات چھیڑ دی۔ ''دیکھو میں تمہیں دوبارہ کہہ رہی ہوں۔ میری بات مان لو اور عامر کے لئے ہاں کر دو۔''

گل معمول کے مطابق اپنی بات پر قائم تھی۔

''امی آپ کو میری بات کیوں سمجھ میں نہیں آ رہی۔ مجھے نہیں کرنی عامر سے شادی، آپ کو کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ وہ شراب پیتا ہے۔ غلط حرکات اس کی سارے

خاندان میں مشہور ہیں اور اس کی عمر بھی مجھ سے زیادہ ہے۔ میں ہر چیز کے لئے تیار ہوں۔ لیکن میں ہرگز عامر سے شادی نہیں کروں گی۔''

اس کا باپ الیاس بھی آچکا تھا۔ الیاس نے گل کو گھورا۔ ''ہم دونوں کو مجبور نہ کرو۔ سیدھی طرح مان جاؤ۔ ہم ان لوگوں کو زبان دے چکے ہیں۔ تمہیں اس سے شادی کرنی ہی ہوگی۔''

''بابا پلیز! ایسا نہ کریں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' گل نے روتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ میری دوسری بہن کی حالت نہیں دیکھتے دو وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا اس کو۔'' یہ عامر کے بڑے بھائی وقاص کی بیوی تھی۔ شادی کے وقت امنہ اور اشفاق نے کوششوں کے بعد گل کی بہن عروج کو اور اس کے والدین کو وقاص کے لئے منایا۔

لیکن گل ماننے کے لئے تیار نہیں تھی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اس کی آگے کی زندگی بھی اس کی بہن کی طرح نہ گزرے۔

بابا اپنا فیصلہ سنا کر کب کے جا چکے تھے۔ اب گل کے پاس رونے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

شام کو بابا گھر واپس آئے۔ تو ان کے ہاتھ میں تین چار شاپر تھے۔ جن میں رنگ برنگے سوٹ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ثریا کو آواز دی، تھوڑی دیر بعد ثریا ان کے سامنے تھی۔ بابا نے ماں کو جو بتایا وہ گل کی جان نکالنے کے لئے کافی تھا۔

بابا نے 15 اپریل کو اس کی شادی کی تاریخ پکی کردی تھی۔ گل واپس کمرے میں بھاگی دروازہ بند کیا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ دوبارہ اُٹھی کچھ نہ سوجھا۔ دیوار سے اپنا سر زور زور سے ٹکرانے لگی۔ اتنی شدت سے اپنا سر دیوار پر مارتی کہ اس کا جسم اندر سے ہل جاتا اور پھر وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔

جب وہ اُٹھی تو اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ آج 14 اپریل تھی۔ اور کل 15 تھی۔ وہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔ کبھی گھر سے بھاگ جانے کا خیال آرہا تھا تو کبھی خودکشی کا۔ اب اس کی ہمت جواب دے رہی تھی وہ اسی وجہ سے ماں سے اتنی بار مار کھا چکی تھی۔ اب شاید اس میں اور مار کھانے کی سکت موجود نہ تھی۔

شادی تو اس نے کرنی تھی۔ اس لئے اس کی رائے تو بہت ضروری تھی۔ لیکن کوئی اس کی رائے لینے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ دونوں ماں باپ بس کسی بھی طرح اس سے وقاص کے لئے منوانا چاہتے تھے۔ نہیں تو بس ان کی ایک ہی رٹ تھی۔ وہ یہ تھی۔ ''ہماری عزت نیلام ہو جائے گی۔ خاندان والے کیا سوچیں گے۔''

لیکن اب گل ہتھیار ڈال چکی تھی۔ سارا دن یوں ہی گزر گیا رات بھی اسی طرح ہی گزر گئی۔ اگلے دن مہمان اکٹھے ہوئے۔ سادگی سے نکاح پڑھایا اور سب اپنے اپنے گھر کو چل دیئے۔

عامر اس کی سوچ سے بھی زیادہ بُرا تھا۔ شروع کے دنوں میں تھوڑا بہتر رہا۔ پھر واپس اپنی عادت پر آگیا۔ رات بھر دوستوں کے ساتھ آوارہ پھرنا، نشہ کرنا اور سارا دن سوئے رہنا اور بات بات پر جھگڑنا اس کا معمول تھا۔ اور اب تو ہاتھ بھی اُٹھانا تھا۔

وہ کسی کو کیا بتاتی بہن دو گلی پرے مکان میں رہتی تھی۔ لیکن اب اس کو احساس ہوا وہ کم از کم اس سے بہتر زندگی بسر کر رہی ہے۔ اس کی طرح بات بات پر مار تو نہیں کھانی پڑتی۔ گھر کو چلانے کے لئے اس نے لوگوں کے گھروں میں کام شروع کر دیا۔ اب وہ کمانے والی ایک تھی اور کھانے والے تین لوگ اور بھی تھے۔ عامر اور اس کے ماں باپ بھی۔ وہ بہت مشکل سے گزارا کر رہی تھی۔ اس کو یہ سوچ کر اور بھی دکھ ہوتا کہ شاید میں والدین پر بوجھ تھی۔ جو وہ اتارنے کے بعد کبھی اس کو دیکھنے کے لئے بھی نہیں آتے۔ شاید وہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کا کام صرف اتنا ہی تھا۔ وہ دو ہی تو ان کی اولاد تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اچھی طرح پرورش نہیں کر پائے تھے۔

وقت اپنی رفتار سے اسی طرح گزرتا گیا۔ تین

سال کے بعد اس کے گھر ایک خوب صورت بچی نے جنم لیا۔ وقت تو ویسے بھی اس کے لئے مشکل تھا۔ بچی کی پیدائش نے اور بھی مشکل کھڑی کردی۔ اس کی ساس اور سسر بچی کی پیدائش پر بہت لڑے۔ یہاں تک کہ عامر نے تو اس کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ بس ان کی ایک ہی رٹ تھی۔ ''تم نے بچی پیدا کیوں کی؟''

جیسے بچی پیدا کرنے میں اس کا کوئی قصور ہو۔ اس لئے اس کو ہر وقت ڈر لگا رہتا کہ کہیں یہ لوگ اس بچی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس لئے وہ پریشان رہتی تھی۔ بچی واقعی بہت خوب صورت تھی۔ اس نے اُس کا نام حنا رکھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ عامر میں اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ساری رات اپنے آوارہ جواری دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ اور سارا دن سویا رہتا۔ کھانا مانگتا دیر سے ملنے پر ہاتھ اُٹھاتا۔ گھر سے جو رقم ملتی لے کر نکل جاتا۔

ایک چیز جو اس میں بڑھ رہی تھی وہ اپنی ہی بیٹی سے نفرت تھی۔ گل کو صرف اب اپنی بیٹی کی فکر تھی کہ جس طرح اس نے زندگی کے مشکل وقت دیکھے۔ کہیں دوبارہ سے اس ماحول کی نذر نہ ہوجائے۔ اس کی کوششوں کی وجہ سے اس نے حنا کو مڈل تک تعلیم دلوادی۔ اس کے بعد اس نے دوسرے قریبی اسکول سے میٹرک کروائی۔ معمول کے مطابق عامر اور اس کے والدین نے اس کی خوب مخالفت کی۔ لیکن گل نے کوشش جاری رکھی۔ لیکن اب گل میں گھر چلانے کی اور ہمت نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ صرف اپنی بیٹی کے لئے محنت کررہی تھی۔ اس نے نا چاہتے ہوئے بھی حنا سے اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے کہا اور ساتھ پڑھائی جاری رکھنے کے لئے کہا۔

حنا تو جیسے اس بات کی منتظر تھی۔ اس نے کام کے لئے فوراً ہاں کردی اس کو اپنے گھر کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا۔ اور ماں کو دیکھ کر بے حد پیار اور ترس آتا۔ جس نے اس حالت میں بھی اس کی پرورش کے علاوہ اس کو تعلیم کا موقع بھی فراہم کیا تھا۔ جو اس ماحول میں ناممکن تھا۔

حنا کے ساتھ کام کرنے کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہوگئے۔ حنا صبح کے وقت کالج جاتی واپسی پر کھانا کھانے کے بعد محلے کے گھروں میں ماں کے ساتھ برتن دھوتی۔ کپڑے دھوتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ کام خود کرتی۔ وقت اب گزر رہا تھا۔ صرف اگر وہ پریشان تھیں تو عامر اور اس کے والدین کی وجہ سے۔

انٹر کرنے کے بعد حنا نے پارٹ ٹائم ایک اور جاب شروع کردی جو اس کو اور ماں کے گھروں کے کام سے نجات ملی۔ حنا کو اتنی آمدنی آسانی سے مل جاتی جس سے ان کا گھر اچھا چل سکتا تھا۔ عامر گھر آتا معمول کے مطابق بیوی کو مارتا گالی گلوچ کرتا اور باہر نکل جاتا۔

والدین سارا دن کھانا کھانے یا چغلیاں کرنے کے بعد سوئے رہتے۔

معمول کے مطابق وقت گزر رہا تھا۔ ایک روز گل نے اپنے والدین کی وفات کے بارے میں سنا۔ جیسے بھی تھے لیکن والدین تو تھے۔

گل سن کر صدمے سے نڈھال ہورہی تھی۔ اس مشکل گھڑی میں اس کے لئے گزارا کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر حنا کا ساتھ نہ ہوتا۔

خودغرضی کی انتہا کہ عامر اور اس کے والدین جنازے پر بھی نہ آئے۔ گل کے والدین کی وفات چھت گرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ دن گزرنے لگے۔

حنا نے ماں کو محلے کے گھروں سے کام کرنے سے بھی منع کردیا۔ اس کی محنت کا امتحان شروع ہورہا تھا۔

وہ کالج سے واپس آکر جاب پر جاتی پھر واپس آکر گھر کے کام کرتی۔ اب ساری کی ساری ذمہ داری اس پر تھی۔ اور وہ اس ذمہ داری کو اچھی طرح نبھا رہی تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی وہ اتنے کام کرنے کے باوجود ماں کے بعد وہ اپنے بزرگوں کا خیال رکھتی۔ لیکن

وہ معمول کے مطابق دونوں ماں بیٹی کو برا کہتے۔ ''دونوں ہمیشہ اس کے سامنے ماں کو گالیاں دیتے اور ہر بار یہ کہتے۔'' تو نے اس کو بڑی چھوٹ دے رکھی ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں پھرتی ہے۔'' یعنی کہ اس کے بارے میں نہایت غلط سوچ رکھتے تھے۔

اور عامر نے تو حد کردی تھی۔ دوستوں کے ساتھ باہر جانے کے بجائے اب وہ اکثر گھر میں ہی دوستوں کو لے آتا شاید اب اس نے گھر کو شراب خانے کا اڈا سوچ رکھا تھا۔ ساری رات جوا کھیلتے شراب پیتے۔ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے۔ عجیب غلیظ ماحول ہو چکا تھا۔

حنا کو تو اب اپنے باپ سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ اکثر اس کو عجیب سی نظروں سے گھورتا۔ جب کسی کا ضمیر مرجائے تو وہ انسان کسی بھی حد تک جاسکتا ہے۔

معمول کے مطابق عامر اپنے دوستوں کو موج مستی کروانے میں مصروف تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ تو ایسے مصروف تھے جیسے گھر میں موجود ہی نہ ہوں۔

حنا کمرے میں بیڈ سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ امی کب کی سو چکی تھی۔

اچانک حنا کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کو پکارا ہے۔ جب اس نے غور کیا۔ تو اس کو پتا چلا یہ آواز کسی اور کی نہیں اس کے باپ کی آواز تھی۔ عجیب سا خوف اس پر مسلط ہونے لگا۔ دل اور دماغ کی آپس میں عجیب سی جنگ چھڑ گئی کہ وہ جائے یا نہ جائے۔ آج تک باپ نے کبھی شفقت سے نہیں پکارا تھا۔ ہمیشہ جب بھی پکارا۔ گالیاں دینے کے لئے۔

بدن میں کپکپی شروع ہوگئی تھی۔ وحشت ہو رہی تھی۔ کیا کرتی مرتی کیا نہ کرتی۔ لرزتی ہوئی دروازے تک پہنچی۔ دروازے پر دستک دی۔ اجازت ملنے پر دروازے پر دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اندر آٹھ دس افراد موجود تھے۔ تقریباً تمام ادھیڑ عمر کے تھے۔ حلیے سے سب کے کردار اچھے نظر نہ آرہے تھے۔

صرف ایک لڑکا نوجوان نظر آرہا تھا۔ جس کی عمر تقریباً چوبیس سال کی تھی۔ لرزتی ہوئی باپ کے سامنے ہوئی ''جی''

''چل جا کولر میں ٹھنڈا پانی لے کر آ۔'' حنا کو بڑی حیرت ہوئی۔ کولر ان کے کمرے میں ہی پڑا ہوا تھا۔ اور اس کو اس کمرے میں سے آواز دے کر صرف پانی لانے کے لئے کہا۔ ''جی میں لے کر آؤں۔''

''ہاں تم کو ہی آواز دی ہے تو تم ہی لے کر آؤ گی نا۔'' باپ نے پھر سے گھورتے ہوئے کہا۔ جی آپ ہی لے کر آؤ گی نا۔''

''نہیں تو میں لادوں۔'' کہیں سے آواز اُبھری۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہی نوجوان اس کو شیطانی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہوس کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ باپ نے قہقہہ لگایا۔ ''واہ اختر تیرا تو لڑکا بھی بڑا اداکار ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے اپنے دوست کی جانب دیکھا۔ اختر نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس لڑکے جس کا نام یامین تھا۔ اس نے اچانک گلاس اٹھایا اور میری طرف آنے لگا۔ پھر اس نے میری کلائی سختی سے اپنے ہاتھ میں پکڑلی اور گلاس منہ کو لگانے کی کوشش کی۔

حنا نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور دوڑ کر کمرے سے واپس باہر نکل گئی۔ اس کو اپنے باپ سے گھن آرہی تھی۔ جو بے غیرتی سے ان کے ساتھ ہنسے جارہا تھا۔

کمرے میں واپس آئی تو امی جاگ رہی تھیں۔ اس نے روتے ہوئے سارا واقعہ امی کو بتایا۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو چکی تھیں۔ امی نے دروازے کے پیچھے پڑا ہوا لوہے کا راڈ اُٹھایا اور مارنے کے ارادے سے بھاگیں۔ لیکن حنا نے بہت منت کرنے کے بعد ان کو کسی طرح روک لیا۔

اگلے دن صبح کے وقت حنا نے ماں کے ساتھ ناشتہ کیا۔ آٹھ نو بجے کا وقت تھا۔ حنا کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی۔ وہ آج کالج بھی نہیں گئی تھی۔

اچانک باہر والا دروازہ کسی نے بجایا۔ امی دروازہ کھولنے کے لئے باہر گئیں۔ باہر ایک دس بارہ سال کا بچہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے پھولی ہوئی سانس سے بتایا۔ ''آنٹی وہ گلی کے نکڑ والے مکان میں جو بڑی آپا رہتی ہیں وہ فوت ہوگئی ہیں۔ ان کے لئے اچھی سی چارپائی چاہیے۔''

''اچھا بیٹا کسی بڑے کو بلاؤ۔'' وہ بچہ واپس چلا گیا۔ امی واپس اندر آ گئیں۔ واپس حنا کے پاس بیٹھ گئیں۔ حنا کو فوتگی کے بارے میں بتایا اور اس سے کہا کہ ''ہم لوگوں کو بھی جانا چاہیے۔'' حنا نے اپنی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بتایا تو امی خود اُٹھیں بڑی سی چادر لی اور گھر سے نکل گئیں۔

معمول کے مطابق عامر گھر پر موجود نہیں تھا۔ سر صاحب بھی کہیں نکلے ہوئے تھے۔ اب حنا گھر میں اکیلی تھی۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کچھ غلط ہونے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا برا وقت کسی کو بتا کر نہیں آتا۔

اچانک سے دروازہ بری طرح کسی نے بجایا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کا باپ موجود تھا۔ معمول کے مطابق ہاتھ میں بوتل اٹھائے گھر میں داخل ہوا۔ عجیب سے گمان سر اٹھانے لگے۔ حنا نے سوچا کہ کاش وہ بھی چلی جاتی۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ باپ عجیب شیطانی نظروں سے گھورتا ہوا قریب آیا اور بولا۔ ''کدھر ہیں سب؟'' حنا نے کوئی جواب نہ دیا۔ حنا اندر ہی اندر بہت ڈر رہی تھی۔ اس کو بار بار غصہ آ رہا تھا۔ وہ بھی ماں کے ساتھ چلی جاتی۔

''کدھر گم ہے۔'' عامر نے مسکراتے ہوئے کہا تو حنا نے پوری قوت سے بھاگنے کی کوشش کی تو عامر اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ اس نے بھی حنا کو تیزی سے اس کو جکڑ لیا۔ اس کو پوری قوت سے نیچے گرایا۔ اس کے ناپاک ارادے واضح ہو چکے تھے۔ وہ اس پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور حنا زار و قطار رو رہی تھی۔ دنیا کے کسی فرد میں اس منظر کو دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ کسی وحشی درندے کی طرح اس پر حاوی ہو چکا تھا۔ حنا رو رو کر نڈھال ہو رہی تھی۔ شاید اس منظر پر پوری دنیا بھی روئے تو یہ اس کے ساتھ انصاف نہیں تھا۔

اچانک دروازہ دھڑام کی آواز سے کھلا۔ ماں اندر داخل ہو کر یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس نے لوہے کا راڈ پوری قوت سے عامر کے سر پر مارا۔ لیکن وقت نے عجیب رخ موڑ لیا۔ عامر کے سر کے پاس سے ہوتے ہوئے حنا کے سر پر لگا۔ حنا تو پہلے سے ہی نڈھال ہو رہی تھی۔ ماں ایک بار پھر لوہے کے راڈ کے بغیر عامر پر جھپٹی۔ اس نے پوری قوت سے اس کو سر سے جکڑ کر دیوار سے لگے شیشے سے ٹکرا دی۔

ٹکر لگتے ہی عامر کے سر سے خون تیزی سے نکلنے لگا۔ اب ماں رکنے والی کہاں تھی۔ اس نے دوبارہ اسی قوت سے اس کی آنکھوں میں انگلیاں گھسیڑ دیں۔ یہ وار اتنی قوت سے ہوا تھا کہ اس کی انگلیاں عامر کی آنکھوں کو چیرتی ہوئی اندر گھس گئیں۔ وہ دلدوز انداز میں چیخا۔ لیکن ماں پر اس کی چیخ کا اثر نہ ہوا۔ وہ ایک دفعہ پھر سے اُٹھی اور پاس پڑی راڈ پوری قوت سے عامر کے سر کے پچھلے حصے پر مارا۔ ضرب اتنی شدت سے لگی کہ عامر تیورا کر گرا۔ کچھ لمحے بکرے کی طرح ڈکراتا رہا پھر دم توڑ گیا۔

ماں روتے ہوئے حنا کی طرف مڑی تو حنا نے چند لمحے ماں کو احسان مند نظروں سے دیکھا۔ ماں حنا سے لپٹی ہوئی تھی۔ حنا کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاید موت کے فرشتے نے اجازت نہ دی اور دم توڑ گئی۔

ماں دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

ہمیشہ کی طرح پولیس اپنے وقت پر آئی۔ لاشوں کا معائنہ کرنے کے بعد ماں کو اپنے ساتھ لے کر جانے کے بجائے اس کی حالت دیکھ کر پاگل خانے کی طرف روانہ ہوگئی۔

انتقام

حافظ مون بخاری ۔ سرگودھا

ایک طویل عرصہ بعد بزرگ کی روح اپنی ملازمہ کے سامنے آن موجود ہوئی اس کی آنکھیں غصہ کی وجہ سے انگارہ ہورہی تھیں، ملازمہ بہت اچھلی کودی مگر وہ اذیت سے دو چار ہوگئی۔

خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اور دہشت پھیلاتی ایک روح کی عجیب کہانی

سورج کی پہلی ٹکیہ غضب ناکی سے چلچلاتی دھوپ پھینک رہی تھی۔ مگر اس قدر شدید تھی کہ ''بدن'' آگ میں بھونا ہوا لگتا تھا۔

ہر ذی نفس بے حال تھا۔ زبیدہ نے ہانپتے ہوئے قدیم حویلی کا آہنی زنگ آلود گیٹ کھولنے کے لئے بڑے ''قفل'' میں پرانی چابی گھمائی۔ ''تالا'' کھٹکے سے کھل گیا۔

''زبیدہ'' نے ''چڑ چڑ'' کرتی کنڈی کو کھول کر گیٹ وا کیا اور حویلی کے اندر داخل ہوکر گیٹ اندر سے بند کر دیا۔

آج ضرور کنڈی کو تیل لگاؤں گی۔

اس نے خود کلامی کی۔ وہ جب بھی ہفتوں بعد ادھر کا رخ کرتی تو اسی طرح خود کلامیاں کرتے ہوئے مختلف کاموں کو کرنے کا ارادہ باندھتی۔

یہ الگ بات ہے کہ اس نے کبھی وہ کام کئے نہیں ارادہ باندھنے کے باوجود...... وہ پاؤں گھسیٹتی ہوئی آگے بڑھی اور حویلی کے برآمدے اور گیراج کا حال دیکھ کر سر پہ ہاتھ مار کر بولی۔

''لو جی...... اتنا گند پڑا ہے۔ ساری دوپہر اتر جائے گی یہاں۔ کیا تھا جو پرسوں آندھی نہ آتی اور صفائی کرنا آسان ہو جاتا۔ ذرا بھی کہیں دھول نظر آئی تو مالکن کا کھانس کھانس کر برا حال ہو جانا ہے خیر اس کا تو جو حال ہونا ہے۔ میری شامت الگ آئے گی۔ ناک چڑھا کر بولے گی۔''

''زبیدہ تم کام پر دھیان کیوں نہیں دیتی۔ لیتی ہوں تمہاری خبر...... کہوں گی ملک صاحب سے نوکرانی بدل لیں...... ہونہہ۔''

آخر میں اس نے اپنی مالکن کی نقل اتاری اور پھر تمام کمروں کے دروازے باری باری کھول دیئے اندر کا حبس تیزی سے باہر لپکا۔ ہر شے کی حالت ابتر تھی۔ کمرے کے روشن دانوں اور دروازوں کی درزوں سے راہ بنا کر گرد و غبار نے تہہ جما دی تھی۔ وہ چکرا گئی۔

''اوہ...... سارا ''سیاپا'' میں نے ہی ختم کرنا ہے۔ ایک تو مالکوں کا بھی کوئی جواب نہیں۔ رہنا سہنا...... کھانا پینا...... کمانا پڑھنا سارا کچھ شہر میں۔ بس ''وڈے وڈیروں'' کا ختم اکٹھا اک عددی ''پنڈ'' میں دلانا ضروری ہے۔ بندہ پوچھے ثواب تو ہر جگہ سے پہنچ جاتا ہے۔ ادھر آنا ضروری ہے کیا...... اس عمر میں کہاں مجھ سے اتنی دوڑیں لگائی جاتی ہیں...... ہائے......

پھر زبیدہ نے خدا کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔

دراصل پرسوں ''حاجی غلام عباس'' کے والدین اور دادا دادی کی برسی کا ختم شریف تھا۔ وہ اپنی والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ویسے تو وہ یہیں پلے بڑھے تھے۔ مگر سرکاری محکمے میں اہم عہدہ مل جانے پر شہر میں رہائش اختیار کرلی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ ان کی شریک حیات بھی دولت مند باپ کی شہری لڑکی تھی۔ اس کے بڑے مزاج تھے۔ گاؤں میں رہنا ناپسند تھا۔ اس لئے وہ سال میں صرف ایک بار مقرر ماہ کی مقرر تاریخ کو یہاں کا رخ کرتے اور تمام فوت شدگان کا ختم دلا کر اپنے تئیں فرماں بردار اولاد ہونے کا ثبوت دیتے۔

حالاں کہ ان کے والدین اور داد دادی مختلف تاریخوں اور سال میں فوت ہوئے تھے۔

وہ پھر بھی ایک بار ہی سارا ''کام'' تمام کرجاتے اور صرف تین دن مشکل یہاں گزارتے۔

حویلی کی دیکھ بھال کے لئے انہوں نے قابل اعتماد ''انصاری'' گھرانے کی عورت کے سپرد کررکھی تھی۔

''جو نسل درنسل اس حویلی کے لوگوں کے خدمت گزار تھے۔ حاجی غلام عباس نے اپنے ہوش میں ''خالہ زبیدہ'' کو حویلی میں پایا۔ وہ اس کا احترام بھی کرتے اور پوری پوری مالی معاونت بھی۔

حویلی کی چابیاں ''زبیدہ'' کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ زبیدہ ویسے تو بڑی ایمان دار عورت تھی۔ مگر ذرا تساہل پسند تھی۔ ویسے بھی عمر کے اس حصے میں اسے جوڑوں کا درد چمٹ گیا تھا جس کی وجہ سے مشکل پیش آتی تھی۔

اور وہ ''اوپری اوپری'' جھاڑ پونچھ کرتی۔ مگر آج تو ساری کاہلی کو دور رکھنا مجبوری تھی۔ ورنہ ''حاجی غلام عباس'' کی بیگم شہلا نے جان کو آ جانا تھا۔

زبیدہ نے کمر کس لی۔ اور دن کو بیش تر حصہ صرف کرکے حویلی کا کونہ کونہ صاف کرکے دم لیا۔ بھلے یہ مکمل صفائی تو نہ تھی پھر بھی اسے امید تھی کہ گزارہ ہوجائے گا۔ اب اس کا درد سے برا حال تھا اور اپنے میلے کچیلے گرد آلود کپڑوں سے بھی الجھن ہورہی تھی۔ زبیدہ نے وقت دیکھنے کے لئے دیوار گیر بوسیدہ گھڑی پر نظر ڈالی۔ گھڑی دوپہر کے تین بجا رہی تھی۔ ''اور ابا...... دوپہر گیارہ بجے آئی تھی میں اور کیا ٹیم (ٹائم) ہوگیا۔ بھوک بھی لگی ہے۔ دانے تو کل صاف کرکے ''کامی'' کہوں گی پسوا لائے...... ابھی کیا کھاؤں...... پیٹ میں گرہیں پڑنے لگی ہیں۔ میری نکمی بہو نے بھی چائے ابال کر رس کیک کھالئے ہوں گے۔ میرے لئے بھلا کیا پکائے گی وہ......''

زبیدہ نے کلس کر سوچا اور طوعاً و کرہاً اٹھ گئی۔
منہ سے کراہ نکل گئی۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر الماری کی طرف آہستگی سے بڑھ گئی۔

یہ حاجی غلام عباس اور شہلا کا مشترکہ کمرا تھا۔ وہ جب کبھی آتے یہیں ٹھہرتے۔ بچوں کے لئے دوسرا کمرا مختص تھا۔ ''شہلا'' اپنے کپڑے اکثر ادھر بھول جاتی۔ زبیدہ کی موج ہوتی۔ کیوں کہ نئے کپڑے مفت میں ہاتھ لگتے جن کے بارے کبھی پلٹ کر کوئی پوچھ گچھ نہ ہوتی۔ اس نے کپڑوں کی تلاش میں الماری کھولی۔ سبز رنگ کا ایک نیا جوڑا اچکلے خانے میں پڑا تھا۔ وہ خوش ہوگئی۔

بس یہی ایک بے ایمانی کرتی ہوں میں۔''

اس نے خود سے کہا۔ اور تر و تازہ ہونے کے لئے ''بیڈ روم'' سے ملحق باتھ روم میں گھس گئی۔ 20 منٹ بعد وہ مہدی حسن کی کسی پرانی غزل کو گنگناتی ہوئی باہر آئی۔ سر پر دوپٹہ جمایا۔ اپنے میلے کچیلے کپڑے سمیٹ کر شاپر میں ڈالے۔

اب اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔

''چائے بنا کر پیتی ہوں۔ تھک گئی ہوں۔ دودھ کا ڈبہ ابھی ہفتہ بھر پہلے تو رکھا تھا کیبنٹ میں اگر بچا پڑا ہوا تو.....''

زبیدہ نے کیبنٹ کو کھولا۔ ڈبہ موجود تھا۔ اس نے جلدی سے چائے تیار کی اور کپ دھونے کے لئے ''سنک'' کی ٹونٹی کو کھولنا چاہا۔

''مگر یہ کیا اس کے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ٹونٹی خود بخود کھل گئی۔

زبیدہ نے خوفزدہ ہوئے بغیر کپ دھویا اور ٹونٹی بند کردی۔ وہ حویلی میں پیش آنے والے ان واقعات کی عادی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو گھبرا کر سرپٹ بھاگتی ہوئی حویلی سے نکل جاتی اور آئندہ اس حویلی میں کسی صورت بھی نہیں آتی۔

مگر زبیدہ کی بات دوسری تھی وہ ان واقعات سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ ابھی بھی اس نے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''میں بھی کہوں میری ''سہیلی'' نے آج اپنی موجودگی کا احساس کیوں نہیں دلایا۔ چلو مجھے پتہ چل گیا میں اتنی بڑی حویلی میں اکیلی نہیں ہوں۔ کوئی میرے ساتھ ہے۔''

پھر وہ چائے کا کپ اٹھا کر برآمدے سے گزرتی ہوئی ایئر کنڈیشنر (A.C) والے کمرے میں جا بیٹھی۔

یہ کمرا کبھی حاجی غلام عباس کے دادا ''ملک حیات نواز'' کے استعمال میں ہوتا تھا۔

زبیدہ کا جسم ''فرحت'' حاصل کرنے لگا۔ گرمی گویا بھاگ گئی۔ اس نے صوفے پر بیٹھ کر سامنے میز پر یوں پیر پسارے کہ وہ اس گھر کی اصل مالکن ہو.....

سامنے دیوار پر ملک حیات نواز کی قد آدم پرانی بلیک اینڈ وہائٹ تصویر کا فریم ٹنگا تھا۔ بڑی بڑی جلالی آنکھوں میں سرخی دوڑ رہی تھی۔ بل کھاتی ہوئی گھنی مونچھوں کے نیچے بھاری لب خاموش تھے۔ بارعب چہرے کے خدوخال میں عجیب طرح کی سختی تھی۔

زبیدہ کو پہلی بار کچھ خوف محسوس ہوا۔ اس نے تصویر سے نظریں ہٹائیں اور گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگی۔

چائے بہت لذیذ تھی۔ مگر یہ مزا خوف سے برابر پڑ رہا تھا۔ زبیدہ حیران تھی یہ آج مجھے کیا ہونے لگا؟ اس نے کپ میز پر رکھا اور میز سے پاؤں ہٹا کر جوتیاں اڑس کر کھڑی ہوئی۔

''کھوں.....کھوں۔''

اس کے کانوں میں کھانسی کی آواز پڑی۔

''یہ کون کھانسا..... یہاں تو میرے علاوہ کوئی نہیں ہے۔''

زبیدہ کی نظریں بے اختیار کھڑکی سے باہر سیڑھیوں کی طرف اٹھیں۔

''دھپ.....دھپ۔''

جیسے کوئی عجلت میں سیڑھیاں اتر رہا ہو۔ یہ الگ بات وہاں کوئی نہ تھا۔ زبیدہ نے کمرے سے باہر نکلنا چاہا۔ اسے لگا کوئی قریب سے گزرا ہے۔

اس طرح تو کئی بار محسوس ہوا تھا مگر خوف کی لہر

پہلی بار ''بدن'' میں دوڑی تھی۔ دروازے کا پردہ ابھی تک سرسرا رہا تھا۔ زبیدہ نے پردہ ہٹا کر دیکھا۔

سیڑھیوں پر سفید لباس میں کوئی اور نہیں۔ ''ثریا ملکانی'' تھی۔ زبیدہ کا حلق خشک ہوگیا۔

''یہ..... یہ..... آج ..... کک کیا ہو رہا ہے؟ مجھے مُردوں کی موجودگی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔''

دہشت کے مارے وہ کوئی آیت نہ پڑھ سکی۔ ثریا ملکانی ملک حیات نواز کی بہو اور حاجی غلام عباس کی ماں تھی۔ جو اپنے سسر کی وفات کے ایک سال بعد اپنے بستر پر پراسرار طور سے مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔

''یہ..... یہ میرا وہم ہے۔''

زبیدہ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اُچھل کر مڑی۔

''بڑی عیش کرتی پھرتی تھی ناں تم..... اس حویلی کو اپنی جاگیر سمجھ بیٹھی تھی۔ فکر مت کرو۔ ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔

زبیدہ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں ملک حیات نواز تھا۔ وہ بھی سفید لباس میں پراسرار مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

''مم..... ملک جی..... آ..... آپ تو مر گئے تھے۔'' زبیدہ نے مشکل کہا۔

''تو ہم نے کب کہا..... ہم زندہ ہیں..... ہمیں مارنے میں تم نے ہی ثریا کا ساتھ دیا تھا..... یاد ہے ناں..... میری بہو کو میرا وجود جراثیم کا مرکز لگتا تھا۔ وہ میری خدمت سے کتراتی تھی۔ اور..... اور..... تم نے اس کے ساتھ مل کر مجھے زہر کے ٹیکے لگائے..... اور آخر کار میرے منہ پر تکیہ رکھ کر ''سانس'' گھونٹ دیا..... کسی کو ذرا بھر شک نہ ہو سکا۔

ملک حیات نواز کی روح نے قہر بار نظروں سے زبیدہ کو دیکھا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔

''مم..... میں..... مجبور تھی۔ مم مجھے..... معاف کر دیں۔''

''بس، ملک حیات نواز کی روح نے آگ بگولہ

جھوٹی قسم کا عذاب

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ایسے لوگ جن کی طرف اللہ قیامت کے دن (رعایت کی نظر سے) نہیں دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ وہ شخص جو احسان جتلاتا ہے اور وہ شخص جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سامان بیچتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم لے کر کھانا چاہے گا تو اللہ اس پر جہنم کی آگ کو واجب کر دے گا۔''

صحابہ نے عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟ آپؐ نے فرمایا:

''اگرچہ درخت کی ٹہنی ہی کیوں نہ ہو۔''

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تجارت میں بہت قسمیں کھانے سے پرہیز کرو! کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہو جاتی ہے۔''

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

ہو کر کہا..... مکر کر رہی ہو تم..... کوئی مجبور نہیں تھی تم..... برسوں کی خدمت گزاری کو ایک ذرا لالچ میں داغ دار کر دیا اور تم کو ذرا شرم نہ آئی مجھ بوڑھے کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہوئے یاد ہے ناں..... تم میرے وارث میرے پوتے غلام عباس کو میرے پاس آنے سے روکتی تھی۔ اور یہ سب تم نے اپنی مالکن ثریا کے کہنے پر کیا۔ بیٹا تو میں اپنی زندگی میں کھو چکا تھا..... اور میرے پوتے کو تم لوگوں نے کبھی میرے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ بس اب ظلم کا بدلہ لینے کا وقت آ چکا ہے۔ کیا سمجھی تم نمک حرام عورت۔''

یہ سنتے ہی زبیدہ اپنے ہوش کھو بیٹھی۔

☆.....☆.....☆

آج سے کئی سالوں پہلے یہ حویلی ویران نہ تھی۔ یہاں زندگی کی رونقیں اور انسانوں کی چہل پہل تھی۔

ملک حیات نواز، گاؤں کے معزز زمیندار تھے۔ ان کا اخلاق و کردار بھی اعلیٰ تھا۔ ان کی بیوی ایک وارث کا تحفہ ملک جاوید نواز کی شکل میں دے کر خالق حقیقی سے جا ملی۔ ملک حیات نواز نے اپنی تمام تر توجہ کا مرکز اپنے بیٹے ''جاوید'' کو بنا لیا۔

اس کی پرورش ناز و نعم سے کی مگر تربیت کا بھی خاص خیال رکھا۔ ان کی پرسکون زندگی میں بربادی کی علامت ''ثریا'' بن کر آئی۔ جو ان کی دور پرے کی رشتہ دار تھی۔ نصیبوں کے کھیل یوں ہی کھیلے جاتے تھے۔ ملک حیات نواز نے ملک جاوید نواز کی شادی ثریا سے کر دی اور یہیں سے بدقسمتی کا آغاز ہوا۔

ثریا کا خاندانی پس منظر مفلوک الحال تھا۔ وہ غریب گھر کی لڑکی تھی اور شکل و صورت میں بھی خاص نہ تھی۔ ملک حیات نواز نے سب باتوں کو نظر انداز کر کے اسے بہو بنایا۔ وہ خدا ترس انسان تھے۔ ان کے نزدیک دولت مرتبے کی وقعت نہ تھی۔ ان کا بیٹا ملک جاوید نواز بھی نیک فطرت تھا اس نے بخوشی باپ کی پسند پر ہاں کر دی۔

دونوں باپ بیٹے کی نظر سے ثریا کا ''حاسدی پن'' اور کینہ پرور مزاج اوجھل رہ گیا۔ شادی کے تھوڑے عرصے بعد ہی ان کے گھر غلام عباس نے جنم لیا۔ وہ بچہ ابھی سال بھر کا تھا کہ ایک کار حادثے میں ملک جاوید نواز کی جان چلی گئی۔ یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ ملک حیات نواز کی گویا کمر ٹوٹ کر رہ گئی۔ وہ بستر سے لگ کر رہ گئے۔ زمینوں کا کام قابل اعتماد منشی اور مزارعوں پر پڑ گیا۔

اور آہستہ آہستہ ثریا بیگم نے ان معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دی۔ آغاز کے چند ماہ سوگ میں گزارنے کے بعد اس کی شاطر طبیعت نے رنگ جمانا شروع کر دیئے۔ سسر کی گرتی ہوئی صحت کی اسے کوئی پرواہ نہ تھی۔ دنیا دکھاوے کے لئے اس نے اچھے اچھے اسپتالوں میں ملک حیات نواز کا علاج کرایا مگر وہ تندرست نہ ہو سکے۔ آخر کار ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا۔

ثریا بیگم نے آنے بہانے سے کاغذات پر زمینوں کی ملکیت کے لئے ان سے دستخط حاصل کر لئے تھے۔ جب ملک حیات نواز پر فالج کا حملہ ہوا تو اس نے شکر کیا کہ اب وہ کبھی بھی اس کے کرتوتوں کو نہ جان سکیں گے۔ وہ سارا دن چپ چاپ ساکت اپنے بستر پر پڑے رہتے۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے پندرہ سالہ لڑکے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ جو ان کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کی معاون زبیدہ تھی۔ جو صرف اوپری اوپری خیال رکھتی۔

اس نے کبھی بھی وقت پر ملک حیات نواز کو کھانا اور دوا وغیرہ نہ دی۔

اور کچھ ثریا کی طرف سے ڈھیل تھی۔ اسے معلوم تھا ملک حیات نواز کی بہو سسر سے چھٹکارا چاہتی ہے۔

ملک حیات نواز اپنے پوتے کو دیکھنے کے لئے ترستے تھے۔ مگر ثریا بیگم نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔

''خبردار! عباس کو بوڑھے کے پاس نہیں لے جانا، کیونکہ جراثیم کا مارا تو ہے باغی بوڑھا.....'' جب بہو کو کوئی پرواہ نہ تھی تو زبیدہ کو کیا پڑی تھی۔

اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ ملک حیات نواز کے اس پر اور اس کے خاندان پر بہت سارے احسانات تھے۔

ثریا بیگم مہلک زہر کے ٹیکے خود ملک حیات نواز

کے وجود میں پیوست کرتی تھی۔ یہ ایسا زہر تھا جو آہستہ آہستہ اثر پذیر ہوتا۔ پھر ایک روز ثریا بیگم اس سے بھی تنگ آ گئی۔ اس نے زبیدہ کے ساتھ مشورہ کیا۔

''کیوں نہ اس باغی بوڑھے کو ایک بار ہی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ زبیدہ مکاری سے بولی۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے بی بی جی۔ بس زہر کی مقدار زیادہ کر دیں۔''

''ہوں۔'' ثریا بیگم نے سر ہلایا۔ ''مگر میں اس کو اپنے سامنے تڑپتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے..... تم جانتی ہو اب تو غلام عباس بھی جوان ہو گیا ہے۔ اس کا خون جوش مارتا ہے یہ تو میں نے اسے ملک حیات نواز کے ظلم و زیادتی کے جھوٹے قصے سنا سنا کر اسے متنفر کر دیا ہے۔ یہ بھی شکر ہے کہ اس نے ہاسٹل میں رہ کر پڑھنے پر اعتراض نہیں کیا۔ بس مجھے اس موذی سے نجات چاہئے۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے اور میرا سر چکرانے لگتا ہے، لوگوں کو دکھاوے کے لئے میں اپنائیت تو جتاتی ہوں مگر میرا بس چلے تو میں فوراً اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبا دوں۔''

تو پھر؟

زبیدہ نے سوال کیا۔

''پھر آج رات اس کا کام تمام کر دیتے ہیں۔''

ثریا نے جواب دیا۔

رات کے دس بجے منصوبے کے مطابق وہ دونوں ملک حیات نواز کے کمرے میں آئیں۔ جس کا مفلوج وجود زندوں میں شمار کیا جا سکتا تھا نہ مُردوں میں۔

ایسے انسان کو ''مارنا'' انتہائی پستی کی دلیل تھی۔

مگر شیطان جب آنکھوں پر پٹی چڑھا دے تو ''بھلے بھلوں کی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ ''ثریا'' کو تو یوں بھی ملک حیات نواز سے بے جا چڑ تھی۔

وہ اس ''وجود'' کا خاتمہ چاہتی تھی۔ ملک حیات نواز کی موت کی صورت میں۔ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر ملک حیات نواز کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آ گئے۔

حلق سے 'غوں غاں' کی آوازیں آنے لگیں۔

ثریا بیگم نے ''سریع الاثر زہر'' سے بھرا انجکشن ملک حیات نواز کی رگوں میں اتار دیا۔ ملک حیات نواز کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ وہ تڑپ رہا تھا جب کہ ثریا مطمئن تھی۔ پھر اس نے زبیدہ کو اشارہ کیا۔ زبیدہ سمجھ گئی۔ زبیدہ نے بے رحمی سے ملک حیات نواز کے سر کے نیچے سے تکیہ کھینچا اور منہ پر رکھ دیا۔

وہ پہلے ہی جان کنی کی اذیت میں تھا۔ مزاحمت نہ کر سکا۔ ثریا بیگم اور زبیدہ نے تکیے پر دباؤ ڈال کر ملک حیات نواز کو زندگی سے آزادی دے دی اور کسی کو شک بھی نہ گزرا۔

اور آج جب کہ اتنے برس بیت گئے۔ ملک حیات نواز کی روح زبیدہ کے سامنے تھی۔

زبیدہ کو ملک حیات نواز کی روح نے بیڈ کے اوپر عین اسی جگہ دھکا دیا جہاں کبھی وہ خود ساکت صامت پڑا تھا۔

زبیدہ بے ڈول ہو کر گری تھی۔ اس کی قوت گویائی جیسے کھو کر رہ گئی۔ یا پھر توبہ کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

''تمہیں یاد ہے ناں..... میرے مرنے کے بعد میری بہو اپنے بستر پر مردہ حالت میں پائی گئی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ دہائی دیتی رہی کہ اسے کوئی مارنا چاہتا ہے۔ مگر کسی نے کوئی توجہ نہ تھی۔ جاننا چاہو گی اسے کس نے مارا؟ میں نے ہاں..... میں نے جیسے تم لوگوں نے میرا گلا گھونٹا تھا۔ میں بھی یوں ہی تم کو خاموشی کی نیند سلا دوں گا۔ تیار ہو جاؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔ غدار..... نمک حرام۔''

یہ کہہ کر ملک حیات نواز کی روح نے زبیدہ کی گردن دبوچ لی۔ تحیر اور خوف کی زیادتی سے زبیدہ کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

اور وہ فوراً موت کی آغوش میں سو گئی۔ ملک حیات نواز کی روح کمرے سے غائب ہو گئی۔

تاہم ایک لیٹر پیڈ پر تحریر تھی۔ ''انتقام پورا ہوا۔''

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

آنکھ کہتی ہے کہ دیکھا ہے انہیں ایک نظر
دل یہ کہتا ہے کہ برسوں کی شناسائی ہے
(ایس حبیب خان.....کراچی)

نہ وہ ملتے نہ ہی دل دکھاتے
یوں پھول چاہتوں کے بھی مرجھاتے
تھی آرزو اس سے ملاقات کی
وہ اقرار بھی کرتے ہم روز بھول جاتے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

سب کے لئے بہت ہوں میں
خود کے لئے کچھ بھی نہیں
(سنبیل ماہین طٰہٰ.....سرگودھا)

اس کے بے حجاب ہونے تک
ہم بھی ساحل تھے ہوش والوں میں
(عمران عبدالحمید.....دیپالپور)

لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
لفظ سننے والے کمال کرتے ہیں
(عرفان عبدالحمید.....دیپالپور)

ساحل پہ کھڑے ہو تمہیں کیا غم چلے جانا
میں ڈوب رہا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں
(شہریار خان.....کراچی)

آدمی بن کے خسارے میں رہے ہیں جاناں
پھول ہوتے، تو تیری زلفوں میں سجائے جاتے
(انجم احمد.....ملتان)

ایک ہی شخص میری دعاؤں کا محور ٹھہرا
وہ میری صبح، میری شام، میری کائنات ٹھہرا
دل دھڑکتا ہے تو دھڑکن میں وہی شامل
وہ میری روح میں شامل، میری زندگی ٹھہرا
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

چھوڑا نہ آنسوؤں نے کبھی آدمی کے ساتھ
آنکھوں میں نہ رہے تو دامن میں رہ گئے
(اکرم اکبر علی.....میرپورخاص)

آج تو آنکھیں بندوق کا کام کرتی ہیں
بنا گولی پارے بندے کی جان لیتی ہیں
(کائنات رشک تنویر.....لاہور)

نگاہیں نہ پھیرو چلے جائیں گے ہم
مگر یاد رکھنا کہ بہت یاد آئیں گے ہم
(محسن عزیز حلیم.....کوٹھا کلاں قصور)

میں زمانے میں بدنام صرف اس لئے ہوں
کہ مجھے لوگوں کی طرح بدل جانا نہیں آتا
(حلیم بھٹی.....کوٹھا کلاں قصور)

میں نے کب کہا ایسا کہ ہمیشہ پاس رہنا تم
بس جب تک سانس چلتی ہے ساتھ رہنا تم
(محسن عزیز حلیم.....کوٹھا کلاں قصور)

دو موسم اک پل میں کیسے آسکتے ہیں
وہ شاداب چہرہ میری پت جھڑ آنکھیں
(شہریار عزیز، طارق عزیز.....کوٹھا کلاں قصور)

لفظ کہنے والوں کا کچھ نہیں جاتا
لفظ سننے والے کمال کرتے ہیں
(چند المقصود، اینڈ ثروت.....قصور)

چلے جائیں گے عنقریب تجھے تیرے حال پر چھوڑ کر
قدر کیا ہوتی ہے یہ تجھے وقت سکھادے گا
(ملک نوید شوکت.....کوٹھا کلاں قصور)

کسی کے ساتھ پیار سے مذاق ضرور کرنا
مگر کسی سے بھی مذاق میں پیار نہ کرنا
(ملک نوید اینڈ میڈم عائمہ ملک.....قصور)

جو چھوڑ گئے وہ بوجھ تھے
جو پاس ہیں وہی خاص ہیں
(حافظ اسامہ عزیز.....کوٹھا کلاں قصور)

کوئی فریاد تیرے دل میں بھی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے
بھاگتے بھاگتے ایک عمر کٹی ہو جیسے
جان باقی ہے مگر سانس رکی ہو کیسے
(محمد عادل بلوچ.....بھولے دی جھوک ساہیوال)

☆

تو ہی میری جان ہو مولا!
یہ میرا ایمان ہو مولا!
تو ہو میری روح کے اندر
تو ہی میرا دھیان ہو مولا!
میں بولوں نا کچھ بھی آگے
تو ہی ورد زبان ہو مولا!
تیرے سوا نا چاہوں کچھ بھی
تجھ پر دل قربان ہو مولا!
کرنا ہے وہ کام مجھے بس
جو تیرا فرمان ہو مولا!
میری دعا ہے مرتے دم تک
ہاتھوں میں قرآن ہو مولا!
خواہش ہے خانم کی اتنی
راہ میں تیری جان ہو مولا!
(فریدہ خانم.....لاہور)

اور اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ
انسان اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتا ہے
میں بھی اپنی پاکیزہ اور بے غرض محبت کے ہاتھوں
مجبور ہوگئی ہوں
اور اس لیے تم مجھ کو ہمیشہ
خود پر مہربان ہی پاؤ گے
میں نے مانا کہ تم میری سانسوں میں بس چکے ہو!
آنسوؤں میں بس چکے ہو!
سانسوں میں بس چکے ہو!
آنکھوں میں بس چکے ہو!
باتوں میں بس چکے ہو!
میری ذات بن چکے ہو!
میری ذات بن چکے ہو!
(رابعہ آفرین.....لاہور)

چلتا رہا حسن کا جادو تمام رات
اٹھتی رہی بدن سے خوشبو تمام رات
آنکھیں کھلیں تو خواب مرا ٹوٹ جائے گا
بدلا نہ اس خیال سے پہلو، تمام رات
تیرے نقش پا کا بھی نہ سراغ مل سکا
پھرتے رہے ہم لے کر جگنو تمام رات
ملنے کا شوق دل میں ہلچل مچا گیا
دیکھے کھلے جو تیرے گیسو، تمام رات
تیرے سوا نہ چاند بھی مجھ کو دکھائی دے
چشم قریں رہے بس اک تو تمام رات
جنگل میں کیا تو ٹھہرا، اے چودھویں کے چاند
پھرتے رہے تیرے لئے آہو تمام رات
آسی وہ شخص جب بھی کبھی یاد آ گیا
آنکھوں سے رک سکے نہ پھر آنسو تمام رات
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

لاکھ دوری ہو مگر عہد نبھاتے رہنا
جب بھی بارش ہو میرا سوگ مناتے رہنا
تم گئے ہو تو سر شام یہ عادت ٹھہری
بس کنارے پہ کھڑے ہاتھ ہلاتے رہنا
جانے اس دل کو یہ آداب آئے کہاں سے
اس کی راہوں میں نگاہیں بچھاتے رہنا
اک مدت سے یہ معمول ہوا ہے اب تو
آپ ہی روٹھنا اور آپ ہی مناتے رہنا
تم کو معلوم ہے عادل خاں یہ پاگل پن ہے
دور جاتے ہوئے لوگوں کو بلاتے رہنا
(محمد عادل بلوچ.....بھولے دی جھوک، ساہیوال)

ہر تکلیف زمانے کی خوش ہو کے سہی ہے
یہ عادت تیرے جانے کے بعد پڑی ہے
اپنے سائے نے تب سے ساتھ چھوڑ دیا ہے
جب سے میری حسرتوں کی بہار لٹی ہے
چلے جاؤ شوق سے مگر وہ امید توڑ کر
جس سے میری ہر سانس کی ڈور بندھی ہے
بھولے سے آجاتا ہوگا کبھی لب پہ تیرا نام

یہ کس نے کہا تیرے آنے کی امید لگی ہے
کبھی نہ کبھی تو آئے گی زندگی میں شہزاد
اس بات پہ تو آج تک میری دنیا سجی ہے
(عامر شہزاد.....نکانہ صاحب)

خداوند عالم یہی اک دعا ہے
یہی آرزو ہے یہی التجا ہے
یہی دل میں ہے اک تمنا خدایا
محبت کی دنیا ہو دنیا خدایا
نگاہوں سے غفلت کا پردہ اُٹھادے
ہر انسان کو دنیا میں جینا سکھادے
خوشی کا الٰہی زمانہ وہ آئے
جو دنیا کو انساں کی جنت بنائے
نہ کچھ دشمنی ہو نہ خوں ریزیاں ہوں
نہ ہو ظلم کوئی نہ چنگیزیاں ہوں
خلوص و محبت کا چمکے ستارہ
بنے زندگی، زندگی کا سہارا
دلوں میں نیا حوصلہ مسکرائے
خوشی کا ترانہ ہر اک لب پہ آئے
سب انسان آپس میں ہوں بھائی، بھائی
یہ نفرت مٹے اور مٹے ہر برائی
خوشی کا زمانے میں ہو بول بالا
محبت کا ہوجائے ہر سُو اُجالا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

لوگ کتنے ناداں ہیں خود کو بھول جاتے ہیں
دوسروں کی جانب جب گولیاں چلاتے ہیں
کچھ کریں گے آخر لوگ بھوک تو مٹائی ہے
آنسوؤں کو پیتے ہیں زہر غم کو کھاتے ہیں
دلربا فسانوں سے، خوشنما بیانوں سے
سیر سبز باغوں کی رہنما کراتے ہیں
شکل ہی بدل دی ہے حسن روئے گلشن کی
روز ایک انوکھا گل پاسباں کھلاتے ہیں
روح روح زخمی ہے، جسم جسم لرزاں ہے
دیکھو قوم کے خادم اور کیا دکھاتے ہیں
رفتہ رفتہ تاریکی بڑھ رہی ہے ہائے لوگ
ایک دیا جو روشن ہو سو دیئے بجھاتے ہیں
جب بھی قتل ہوتا ہے کوئی بے خطا واجد
ظلم و جہل کے عفریت قہقہہ لگاتے ہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی.....کراچی)

غم کی باتیں نہ کیجئے ہم سے
زندگی ایک مستقل غم ہے
دل ہر غنچہ کیوں دھڑکن ہے
چشم نرگس یہ کس لئے نم ہے
عارض گل یہ کیوں ہے اشک آلود
ہائے سنبل کی زلف برہم ہے
کیوں مرے دل کے داغ جلتے ہیں
خوں سے لبریز ساغر غم ہے
کھائے جاتی ہے کیوں یہ تنہائی
آج کیا ایک ہو کا عالم ہے
کیا چمن میں خزاں کا ہے کھٹکا
کیا امید بہار مبہم ہے
کیوں وہ عامر ہو غم زدہ مغموم
اب تو آب حیات بھی کم ہے
(ایس حبیب خان.....کراچی)

گزر گئی شب غم یار بھی دل دکھانے آئے
ہجر کی راتوں میں کوئی شمع جلانے آئے
جو کہتے تھے ہم تیرے ہیں آخر ہوئے بیگانے
دل خوش فہم کو امید وفا دلانے آئے
جو خفا ہے ہم سے گزرے موسموں کی طرح
کوئی تو میرے صحن گلشن میں پھول کھلانے آئے
خاموش ہے ساری فضا تیرے جانے سے
یار بھی پرانے قرض وفا چکانے آئے
ٹھوکر ایسی کھائی ہم نے تیرے عشق میں جاوید
داغ جدائیوں کے پھر سے کوئی مٹانے آئے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

محسوس ہورہی ہے تنہائی گزارا نہیں تیرے بغیر
کوئی ساتھی بھی نہیں میرا سہارا نہیں تیرے بغیر

رونق گلستان زینت جہاں تو بہت دیکھی
کوئی اور من کو بھاتا نظارہ نہیں تیرے بغیر
کیونکر زمانے والے ہم کو اپنا سمجھ بیٹھے
کوئی اور اس جہاں میں ہمارا نہیں تیرے بغیر
فسانہ زندگی میں نے تیرے نام لکھ دیا
اب کوئی عنوان کوئی شمارہ نہیں تیرے بغیر
میں کیوں ڈھونڈوں کسی غیر کو کہ میرے لئے
خدا نے کسی اور کو اتارا نہیں تیرے بغیر
تم تو جینے کی بات کرتے ہو عادل خان
مجھ کو مرنا بھی گوارا نہیں تیرے بغیر
(عثمان نصیر احمد.....کراچی)

آج ٹھہرا ہے سمندر کل طوفان آئے گا
وقت کی زنجیروں سے دل کو آرام آئے گا
زمانہ اپنا نہیں، کب تک ستائے گا؟
یہ وعدہ ہے، موت کے بعد آرام آئے گا
ہمیں پیار ہو گیا نظروں میں
ہمیں دیدار ہو گیا نظروں میں
یاد کی تصویر بس گئی دل میں
اقرار ہو گیا نظروں میں
مت دیکھا کرو آئینہ، آئینہ ٹوٹ جائے گا
بن سنور کے نہ نکلا کرو، یہ جہاں روٹھ جائے گا
تیرا خوشبو میں بس کے مجھے پیار سے دیکھنا توبہ!
مت ڈال مجھے مشکل میں میرا صبر چھوٹ جائے گا
دل کھول کے مانگ، میرے سامنے عشق کا امتحان ہے
تیرے ساتھ عشق ہوا، میرے رب کا احسان ہے
مت کر جدا ہونے کی باتیں، رب ناراض ہو جائے گا
اس فانی دنیا میں تیرا پیار میرا ایمان ہے
(مزمل حسین چندو.....لاہور)

سنا تھا اے زندگی!
کہ تو امتحان لیتی ہے
کہ تو درد بہت دیتی ہے
کہ تو زندہ درگور کر دیتی ہے
یہ سن کر ہنسا کرتے تھے ہم
آوازیں تجھ پر کسا کرتے تھے ہم
آج جب تیرے رنگ دیکھے
خوشیوں میں پڑے بھنگ دیکھے
تو سمجھ میں آیا ہے
یہ جو تیرا جال مایہ ہے
کہ تو صرف امتحان نہیں لیتی ہے
بلکہ سارا جہان لوٹ لیتی ہے
سنا تھا اے زندگی!
کہ تو امتحان لیتی ہے!
(شاعرہ: کائنات رشک تنویر.....لاہور)

چشم انتظار تیری راہ میں بچھی ہے
صرف دل ہی نہ جھکا، گردن بھی یہ جھکی ہے
تیرے تصور کے دارالامان میں بھی جینے نہیں دیتی
خدا جانے اس فانی دنیا کو کیا مجھ سے دشمنی ہے
جس سفر میں تو ساتھ نہ ہو میرے
لگتی مجھے وہ ہر گلی، ہر راہ وحشتی ہے
جچتا تو تجھ پہ ویسے ہر رنگ ہے اے ہمسفر!
مگر شام سے بجلی ڈھا رہی تیری پوشاک وہ ہری ہے
اب تو میرا مشغلہ ہے صرف یہ کشت سخن شاہد
(رابعہ امانت علی.....لاہور)

یوں تو میخانے میں کم ہے نہ پانی کم ہے
پھر بھی کچھ کشتی صہبا میں روانی کم ہے
سچ تو یہ ہے کہ زمانہ جو کہے پھرتا ہے
اس میں کچھ رنگ زیادہ ہے کہانی کم ہے
آؤ ہم خود ہی دریا پار سے ہو آتے ہیں
یہ جو پیغام ہے قاصد کی زبانی کم ہے
تم بضد ہو تو چلو ترک ملاقات سہی
ویسے اس دل نے میری بات تو مانی کم ہے
یاد رکھنے کو تو اے دوست بہت حیلے تھے
اک تیرا زخم جدائی تو نشانی کم ہے
دفتر شوق مرتب ہو تو کیسے ہو شہزاد
دل نے ہر بار کہا ایک کہانی کم ہے
(انتخاب: ارمان ملک.....ٹنڈو آدم)

☆☆

ایلومیناٹی

عثمان غنی خان-پشاور

کائنات کے مخفی اسرار جاننا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں مگر کبھی کبھی یہ آشکار ہوجاتے ہیں، جہاں انسانی سوچ نہیں جاتی، مگر نوجوان پہاڑ پر کھڑے سوچتا رہا کہ.....

ایک حقیقت پر مبنی.....شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری.....کردے گی

جو میری لیلیٰ، میں اس کا چیلا.....نہ کوئی میرے جیسا دوسرا لیلا۔

لیلیٰ قیص کے پڑوس میں رہنے آئی تھی۔اسے دیکھ کر تو قیص اپنا آپ ہی بھول گیا تھا۔وہ سولہ سترہ سال کی ایک خوبرو نازک اندام سی حسینہ تھی۔اس کا قد بے حد خوبصورت تھا۔درمیانہ سا،اس کا چلنے کا انداز ایسا دلربا تھا کہ جو بھی دیکھتا،اس کی محبت میں گرفتار ہوکر رہ جاتا۔مگر وہ گھر سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔قیص نے لیلیٰ کو جب سے دیکھا تھا۔اپنے آپ کو ہی بھلا دیا تھا۔قیص نے لیلیٰ کو دیکھا اور اس کا عاشق بن گیا۔قیص کوئی عاشق مزاج بالکل بھی نہیں تھا۔مگر یہ لیلیٰ کا جادو ہی تھا۔وہ بے انتہا کی خوبصورت تھی۔ان کی پہلی ملاقات فلمی سی تھی۔قیص ابھی کالج کے تیسرے درجے تھرڈ ایئر میں تھا۔وہ اب بھی آدھے گھنٹے سے اپنے سراپے کا جائزہ لے رہا تھا۔قیص نے آئینہ کے سامنے خود کو دیکھتے ہوئے ایک لمبی سی سانس لی۔اب وہ بہت گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔اس نے دونوں آنکھیں بند کرلیں۔اب وہ سجا سنورا اچھا لگ رہا تھا۔الماری سے باڈی اسپرے نکال کر پوری جیسے اپنے اوپر خالی کردی۔

☆.....☆.....☆

گلی میں اس دن گھر سے باہر وہ لڑکی نکل آئی تھی۔قیص سج دھج کر گھر سے باہر نکلا۔سامنے گلی میں ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی تھی۔اس کو دیکھ کر قیص حیران رہ گیا۔اس کی حیرانی بجا تھی، محلے میں تو اتنی خوبصورت، حسین، نوجوان کوئی بھی نہیں تھی، تو پھر وہ کون تھی، اس کا ٹھٹکنا ضروری تھا۔وہ قیص کو اور قیص اسے دیکھ رہا تھا، رہی سہی کسر اس کی مسکراہٹ نے پوری کردی۔قیص بالکل ساکت ہوگیا، اس نے دونوں پلکیں ٹپٹپائیں۔پھر قیص کی طرف اشارہ کردیا۔ان دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔

''گلی میں اتنی حسین لڑکی کیا کر رہی ہے؟'' قیص نے رک کر سوچا۔

''ہوسکتا ہے کسی کے گھر مہمان آئی ہو؟ ہاں یہ ممکن ہے۔۔۔!! ایسا ہی ہے۔۔۔!!'' اس نے اپنی سوچ کو مطمئن کر کے قدم آگے بڑھا دیئے۔

''السلام علیکم۔۔۔!!'' قیص نے اس کے قریب پہنچ کر اسے سلام کیا۔کیونکہ قیص کو اس کا اشارہ یاد رہ گیا تھا، مگر سلام کا جواب نہ پاکر وہ بھی بدمزہ سا ہوگیا تھا، اس نے کچھ جواب نہ دیا۔وہ کنی کترا کر گزرنے لگا۔مگر اس نے کہا۔

''رُکیے۔۔۔!!!''قیص رک گیا۔اُسے ایسا لگا کہ چاروں اور جلترنگ سا بجنے لگا ہو، ماحول میں ہر طرف بھینی بھینی سی خوشبو بس گئی ہو۔اس کی آواز اس سے زیادہ خوبصورت تھی۔

''سنیے۔۔۔!!''اس نے اپنی شیریں آواز میں کہا اور قیص کو ایسا لگا کہ ہر طرف پھولوں کی پتیاں رقصاں ہوگئی ہوں۔جیسے اس پر پھولوں کی پتیوں کی بارش ہورہی ہو۔

''جی کہیے۔۔۔!!''الفاظ خود بخود اس کے لبوں سے نکل گئے۔

''ہم اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں۔۔۔!! اور آج آپ کو اس گلی میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔!! مجھے آپ بے حد شریف النفس انسان لگے۔۔۔!! اس لیے آپ سے بات کررہی ہوں۔۔۔!!''لیلیٰ نے پیار سے کہا۔

''جی، یہ شریفوں کا محلہ ہے۔۔۔!! سب اہل شریف یہاں آکے بس گئے ہیں۔۔۔!! آپ لوگوں نے بہت اچھی جگہ کا انتخاب کیا ہے۔۔۔!! یہاں آپ لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔۔۔!! اور آپ نے بہت اچھا کیا، جو مجھے بتادیا۔۔۔!!''قیص نے نہایت شرافت سے جواب دیا۔آج تو وہ شرافت کا ریکارڈ قائم کررہا تھا۔

''آپ بھی اسی محلے کے ہیں؟''اس نے پوچھا تو قیص نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی بالکل۔۔۔!! آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''اس کی طرف قیص نے قدرے حیرانی سے دیکھا۔

''آپ ہمارے لیے دکان سے ماچس لا سکتے ہیں؟ ہمارے سامان میں ماچس نظر نہیں آرہی ہے؟ ہم نے بہت ڈھونڈا، پر مل کے نہیں دی۔۔۔!!''اس نے گلی میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔وہ اب پریشان ہوگئی تھی۔قیص بھی اس کی پریشانی جان کر مسکرانے لگا۔

''ابھی لے کر آتا ہوں۔۔۔!! آپ ماچس تو کیا کسی بھی چیز کا کہہ سکتی ہیں۔۔۔!!''قیص جلد بازی میں کہتا ہوا، گلی سے باہر نکلا۔اس وقت وہ بلاوجہ ہنس رہا تھا۔جیسے دکان سے ماچس نہیں لیلیٰ کے لیے تاج محل خریدنے جارہا ہوں، دکان سے ماچس خریدی اور دوبارہ گلی میں جانے لگا۔وہاں پہنچ کر وہ افسوں جاں کھڑی اس کی ہی منتظر تھی۔جو بے خیالی میں سر سے دوپٹہ گرا کر ننگے سر کھڑی تھی۔اس کے لمبے گھنے سیاہ بال گھٹنوں تک تھے اور سورج کی حدت میں چمک رہے تھے۔قیص جیسے اس کے بالوں کو دیکھ کر کھو گیا۔مگر وہ جلد ہی حواسوں میں لوٹ آیا۔

''یہ لیجیے ماچس۔۔۔!!''قیص نے ماچس کا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''ارے۔۔۔!!! ہم نے ایک ماچس مانگی تھی۔۔۔!! آپ نے دس لادی۔۔۔!!''اس نے ادا سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس اب رکھ لیجیے۔۔۔!! آئندہ بھی کام آئے گی۔۔۔!!''قیص نے کہہ دیا تو اس نے رکھ لیے۔وہ مسکرانے لگی۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔۔۔!! گھر میں سینکڑوں کام پڑے ہوں گے۔۔۔!!'' اس نے قیص کو دیکھا اور گھر کے اندر جانے لگی۔

''سنیے۔۔۔!!''قیص نے ناچاہتے ہوئے بھی آواز دی۔وہ چوکھٹ میں رک کر قیص کو دیکھنے لگی۔

''جی کہیے۔۔۔!!''وہ گھر کے اندر جو قدم رنجا ہوئی تھی۔واپس مڑ کر پوچھنے لگی۔

اگر آپ کہہ دیں، تو آپ کے سارے کام میں کردوں۔۔۔!!''قیص نے کہا تو وہ مسکرادی۔

''جی نہیں، شکریہ۔۔۔!!''لیلیٰ نے نپے تلے انداز میں کہا۔

''ویسے آپ کا نام کیا ہے؟''قیص نے دل کا سوال پوچھ لیا۔وہ مسکرادی۔

''لیلیٰ۔۔۔!!''اس نے دلربانہ انداز میں کہا۔

''واہ، ماشاء اللہ۔۔۔!! سبحان اللہ، بہت

خوبصورت نام ہے۔۔۔!! شخصیت سے زیادہ نام بامعنی ہے۔۔۔!!'' قیس نے آخر میں سارے دانتوں کی نمائش کی، اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ اب وہ پریشان ہوگئی۔ مگر جلد ہی اس نے مسکرا کر اپنی پریشانی غائب کردی۔

''اور آپ کا؟'' اس نے دونوں ہونٹ ایک ادا سے چھوڑ دیئے۔

''مجنوں۔۔۔!!'' قیس نے بے ساختہ کہہ دیا۔

''کیا؟'' وہ سن کر حیرت سے اسپرنگ کی طرح اچھلی۔ قیس نے اسے دیکھا، پھر ایک آنکھ مار کر اسے کہا۔

''جی میرا نام قیس ہے۔۔۔!! قیس کا مطلب مجنوں ہوتا ہے۔۔۔!!'' قیس نے سنبھل کر کہا۔

''اوہ، اچھا ٹھیک ہے۔۔۔!! اب تو ملاقات ہوتی رہے گی۔۔۔!! آخر پڑوسی نہ سہی، محلے دار تو ہیں۔۔۔!!'' اس نے کہا۔

''انشاء اللہ۔۔۔!!'' قیس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اس کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرایا، اور وہ فوراً گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے اگلے لمحے دروازہ بہت زوردار آواز میں بند کردیا تو قیس بند دروازے کو کتنی دیر تک بے چینی سے دیکھتا رہا، پھر وہ اپنے گھر کو واپس ہولیا۔ اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ لیلیٰ اس نے ایسا کیوں کیا۔

☆.....☆.....☆

پہلے جو قیس کبھی بھی گلی میں بے وجہ پھرتا نہیں تھا۔ اب ہر دوسرے دن آوارہ سا پھرنے لگا۔ قیس نے سوچا ہوسکتا ہے کہ لیلیٰ ابھی باہر نکل کر آجائے گی۔ اس دن اس نے کوئی تیس چالیس چکر لگائے۔ لیلیٰ اپنے گھر سے باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ شام تک وہ بلا وجہ گلی میں بے چینی سے پھر پھر کر تھک گیا۔ رات کو بستر پر لیٹا تو لیلیٰ، لیلیٰ کی گردان کرتا رہا۔

''پتہ نہیں لیلیٰ اس چھوٹی سی ملاقات کے بعد کہاں چلی گئی تھی؟'' اب وہ بستر پر لیٹا تھا۔ تو جتنے بھی لیلیٰ کے نام والے گانے تھے۔ وہ سب سن لیے۔ پھر بھی کچھ سکون حاصل نہ ہوسکا۔ ابھی بھی موبائیل پر لیلیٰ لیلیٰ کا گانا شروع تھا۔ گانوں کی جان تب چھوڑ دی۔ جب موبائیل میں چارج ختم ہوگیا۔

لیلیٰ میں لیلیٰ، ایسی ہوں لیلیٰ
ہر کوئی چاہے مجھ سے، ملنا اکیلا

پرانے دور کی زینت امان موبائیل کے اسکرین پر نظر آرہی تھی، اچانک موبائیل ایک دم سے بند ہونے لگا۔ اس گانے کے بول تو اسے جیسے زبانی یاد ہوگئے تھے۔ نیند آنکھوں سے کوسوں میل دور تھی۔ آنکھوں میں وہ معصوم سی صورت بس گئی تھی۔ آنکھیں بند کرتا۔ تو لیلیٰ کی من موہنی صورت اور اس کی آواز کانوں میں جلترنگ بجانے لگتے۔

''میرا نام لیلیٰ ہے۔۔۔!!'' جب وہ یہ سنتا۔ آنکھیں کھول دیتا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ بستر میں دھنسا تھا۔ لیلیٰ کے خیالوں میں گم ہوگیا۔ وہ جیسے خیالوں میں کہیں دور نکل گیا تھا۔ وہ بھی لیلیٰ کے ساتھ محو تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ ایک خوبصورت نخلستان تھا، جس میں کھجور کے سرسبز و شاداب درخت اگے ہوئے تھے، جس پر کھجوروں کی بیلیں لٹکی ہوئی بھلی معلوم ہورہی تھیں۔ لیلیٰ نے قدیم سعودی لباس پہن رکھا تھا، جس میں صرف اس کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ نخلستان میں درخت کے سائے میں بیٹھی ہوئی تھی اور قیس اس کی گود میں سر رکھے اسے دیکھے جارہا تھا۔ لیلیٰ کی نگاہوں میں اس کے لیے صرف اور صرف پیار تھا۔ اچانک لیلیٰ اس کے اوپر جھک گئی، اس نے قیس کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ قیس نے دونوں آنکھیں بند کرلیں۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں، وہ کہیں اور نہیں، اپنے بستر پر موجود تھا۔ وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں تاریکی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

''اوہ۔۔۔!! یہ خیال تھا۔۔۔!! مگر کتنا شاندار تھا۔۔۔!! کاش، یہ سچ ہو جائے۔۔۔!! میں اور لیلیٰ دور کہیں اپنی دنیا بسالیں۔۔۔!!'' قیص نے لمبی سی سانس لی، اور دوبارہ بستر پر گر گیا۔ اب وہ اندھیرے میں دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، اور وہ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اسے عجیب سی بے چینی تھی۔ اس نے آہستہ سے قدم بستر سے نیچے رکھ دیئے۔ اب وہ زمین پر کھڑا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور باہر نکلا۔ باہر ہو کا عالم تھا۔ اب وہ گھر کے بیرونی دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اور باہر گلی میں ٹہلنے لگا۔ باہر اندھیرا تھا۔ محلے میں ہو کا عالم تھا۔ سرد ہوا کا رقص زوروں پر تھا۔ اس کے قدموں کا رخ لیلیٰ کے گھر کی طرف تھا۔ اب وہ لیلیٰ کے گھر کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اور اسی کے باہر بیٹھ گیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند میں داغ صاف نظر آ رہا تھا، آسمان پر ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ لیلیٰ کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ وہ کتنی دیر تک اس بند دروازے کو دیکھتا رہا۔

دل کا دروازہ کھول دو میری لیلیٰ باہر آ کر بول دو
میری لیلیٰ۔

تیرا عاشق تیرا دیوانہ تیری گلی میں آیا ہے، گھر کا دروازہ توڑ دو میری لیلیٰ۔

وہ کمار سانو کا گانا بے سری آواز میں گانے لگا۔ اسے گانا آگے بھی آتا تھا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دروازے پر اس کی نگاہیں جم گئی تھیں۔

''میں اس دروازے کے پار جانا چاہتا ہوں۔۔۔!! اس گھر کے اندر دنیا کی سب سے حسین لڑکی رہتی ہے۔۔۔!! مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے وہ اس گھر میں قید ہو گئی ہے۔۔۔!! میں اسے اس قید سے نکالنا چاہتا ہوں۔۔۔!! مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے۔۔۔!! میں اسے کیسے نکال پاؤں؟'' قیص نے بڑبڑا کر خود سے کہا۔ مگر خاموشی نے اسے جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند گم ہو چکی تھی۔

''لیلیٰ کہاں چلی گئی؟ اس دن کے بعد کئی دن گزر گئے ہیں۔۔۔!! اب تم گھر سے باہر ہی نہیں نکلتی ہو۔۔۔!! کب تک میرے ضبط کا امتحان لیتی رہو گی۔۔۔!! اب تو اس بند دروازے کو کھول دو۔۔۔!! میری بے چینیاں دیکھ لو، تو تم میرا یقین کر لو۔۔۔!!'' قیص اس کے دروازے سے جیسے کہہ رہا تھا۔ اب کافی دیر گزر گئی تھی۔ وہ مڑا، اور واپس جانے لگا۔ اس کے قدموں نے جانے سے جیسے انکار کر دیا۔ وہ شرابیوں کی طرح جیسے لڑکھڑا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ہائے لیلیٰ تیری لے لے گی، تو لکھ کر لے لے۔
اوئے لیلیٰ تیری لے لے گی، تو لکھ کر لے لے
جان تیرا لے لے گی، مال تیرا لے لے گی۔
ایمان تیرا لے لے گی تو لکھ کر لے لے۔

لیلیٰ کا ایک اور گانا قیص کو زبانی یاد ہو چکا تھا۔ صبح اٹھ کر اس نے اوئے لیلیٰ تیری لے لے گی کئی بار سن لیا تھا۔

''آج سے پہلے تو مجھے ان گانوں کی شاعری بالکل بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اب سمجھ میں بھی آنے لگی اور مجھے بالکل ایسا لگتا ہے کہ یہ گانے میرے لیے لکھے جا چکے ہیں کیونکہ اس میں میری لیلیٰ کا نام جو ہے اور اوئے لیلیٰ تیری لے لے گی، تو مجھے بے حد پسندیدہ لگتا ہے۔ کتنی بار سن چکا ہوں۔ مگر دل جیسے بھرتا ہی نہیں ہے۔ گانے کا یہ جملہ تو میرا فیورٹ بن گیا ہے۔ ایمان تیرا لے لے گی، تو لکھ کر لے لے۔۔۔!!'' اس نے موبائیل بند کر دیا اور آنکھیں ملتا ہوا واش روم میں گھس گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا، تو آدھا گھنٹہ بیت چکا تھا۔

''پہلے جب میں لیلیٰ سے نہیں ملا تھا۔ تب منہ پر چھپاک سے چلو بھر پانی ڈال کر باہر آتا تھا اور اب تو آدھے گھنٹے تک فیس واش سے منہ رگڑ رگڑ کر خوب چمکا کر باہر نکلتا ہوں۔ بال سلیقے سے بنا کر آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر باتیں کرتا ہوں۔ یہ تبدیلی ایسے نہیں آئی

ہے۔۔۔!! مجھے لیلیٰ سے پیار ہوگیا ہے، تو میں بھی اسے پیارا لگنا چاہتا ہوں۔۔۔!!'' اب بھی وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔ اور خود سے وہی ایک جملہ سینکڑوں مرتبہ کی طرح دہرا رہا تھا۔

''اللہ آج کسی طرح راہ چلتے لیلیٰ سے بس ایک معمولی سی ملاقات ہوجائے۔۔۔!! آج پھر اس کے گھر میں کسی چیز کی کمی ہو۔۔۔!! اور وہ باہر نکل کر مجھ سے کہہ دے۔۔۔!! میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہوکر فوراً وہ چیز لاکر اس کے قدموں میں رکھ دوں۔۔۔!!'' اب وہ دل سے مسکرا رہا تھا۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ اپنے گھر والوں کی طرف چلا گیا۔ وہ سب مل کر ناشتہ کررہے تھے۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔ اس کے ابا نے اس کے تیار شیار حلیے پر ایک ناپسندیدہ نگاہ ڈالی، پھر اس کی ماں کو دیکھا۔ ماں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ آرام سے ناشتہ کرنے لگا۔ اس کا بھائی بہت تیزی سے ناشتہ کررہا تھا، اور اس کی بہن ناظمہ جیسے اس کو دیکھ کر کسی سوچ میں گم ہوگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

تو میری لیلیٰ، میں تیرا مجنوں
تو میری دنیا، میں تیرا جنوں
تو میرا نشہ، میں تیرا سکوں

''ہائے گانے ہے، اور تو ہے۔۔۔!! چھپ چھپ کر بے غیرت، تیرا باپ سنے گا، تو میری شامت آجائے گی۔۔۔!! کچن سے اماں نے ڈانٹ کر کہا۔ قیص نے رسوئی گھر کی طرف ایک نظر ڈالی۔ پھر وہ گہری سوچ میں گم ہوگیا۔

''ایک ملاقات نے میری دنیا ہی بدل ڈالی ہے۔۔۔!! پر وہ ظالم حسینہ دوبارہ مل کے ہی نہیں دے رہی ہے۔۔۔!! کاش، آج تو ایک معمولی سی ٹکر اس سے ہو ہی جائے۔۔۔!!'' قیص خاموش ہوگیا، مگر اس کا دل اب بھی ہائے وائے کررہا تھا۔

قیص خود سے دن بھر گانے کی مشق کرتا۔ اس کی آواز تو بے حد بری تھی۔ اماں نے جب بھی اس کے منہ سے لیلیٰ کا گانا سنا۔

لیلیٰ میری ہے، میری ہے لیلیٰ
میں مرمٹوں گا، میری ہے لیلیٰ
لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے لیلیٰ
میں پیار ہوں، میں ہی ہوں چیلا

اماں اسٹور سے باہر آکر کھڑی ہوگئیں، انہیں نے اپنی چپل اتار کر ہاتھ میں پکڑ کر قیص کے سر کا نشانہ باندھا، اور دے مارا۔ چپل قیص کے سر پر پڑی تو کچھ لمحوں کے لیے اس کے گانے کو بریک لگ گیا۔

''ہائے اماں، اب بندہ چین سے گا بھی نہیں سکتا؟'' قیص نے چپل کر کہا۔

''تو مجھے یہ بتا، تیری مینڈک جیسی بھدی آواز ہے، تو لیلیٰ والا گانا گا کر ذرا بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔ اور اگر گانے کا اتنا ہی شوق ہے، تو بیچ میں یہ لیلیٰ کا ذکر کرنا ضروری ہے؟ یہ لیلیٰ تیری کون سی نئی ماں ہے، جس کے بغیر تیرا گانا مکمل ہی نہیں ہوتا ہے۔'' اماں نے دوسری چپل نکال کر اسے دے ماری۔

''ہائے اماں، اس کی آواز تو بھینس جیسی بھاری ہے۔ مینڈک تو پھر بھی اچھا ہی گاتا ہے۔۔۔!! مینڈک کی ٹرٹر اتنی بری نہیں لگتی ہے، جتنی اس کی بے سری آواز بری لگتی ہے۔۔۔!! جیسا بھینسا ڈکراتا ہے۔۔۔!! بالکل اسی طرح ناک میں گنگنا کر یہ گاتا ہے۔۔۔!!'' اس کی بہن ناظمہ نے دہائی دی۔

''بھئی! تم دونوں کو میری آواز ایسے ہی پسند نہیں ہے۔۔۔!! انڈیا سے مجھے گانے کی آفر آئی تھی۔ ملکی حالات کی وجہ میں نے انکار کر دیا۔۔۔!!'' اور پھر قیص نے فرضی کالر جھاڑے۔

''چل جا خشکہ مارا۔۔۔!! یہ والی جُس جو تو نے ماری ہے، بڑی ہی بے مزے کی ہے۔۔۔!!'' اس کے بھائی نے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا کر کہا۔

''میں بھی جھگڑے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔۔۔!! کیونکہ آفٹر آل مجھے کالج کے لیے دیر ہورہی ہے۔۔۔!! تم لوگ تو بس مجھ سے جل

جل کر کڑھتے رہو۔۔۔!!'' قیص کمرے میں گھس کر اپنا کالج کا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔ اب وہ دوبارہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

''شکر ہے، اس بے غیرت کا باپ آج گھر پر نہیں ہے۔۔۔!! مجھے تو طعنے دے دے کر اس نے آج مار دینا تھا۔۔۔!! اس کا لیلیٰ نامہ ہی ختم نہیں ہوتا ہے۔۔۔!!'' اس کی ماں نے ناظمہ کو دیکھا۔

''ہاں اماں، پچھلے ہفتے سے اس کی حرکتیں مشکوک نظر آرہی ہیں، لیلیٰ نام کے جتنے گانے ہیں، اس کے موبائیل میں فیڈ ہیں، حتیٰ کے فارسی، انگلش، عربی، ایرانی، پشتو، اردو، رشیان، اسپینش، جتنے گانے بھی ہیں، ان سب میں لیلیٰ کا نام ضرور موجود ہے۔۔۔!!'' ناظمہ نے انگلی ٹھوڑی تلے رکھ کر سیانہ بننے کی کوشش کی۔ اس کی ماں ناظمہ کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''ناظمہ کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔۔۔!! اس کے منہ سے جب بھی میں نے گانا سنا، اس میں لیلیٰ کا ذکر ضرور تھا۔۔۔!! کہیں ایسا تو نہیں، اس پر کسی ڈائن کا سایہ پڑ گیا ہو۔۔۔!!'' اس کی ماں گھبرا کر کہہ رہی تھی۔ ناظمہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''میری بھولی اماں، ڈائن کا نہیں، لیلیٰ کا۔۔۔!!'' ناظمہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اماں نے پرسوچ ہوکر دونوں آنکھیں چھوٹی کر دیں۔

''میں اس کا سارا عشقیہ چکر کا ستیاناس کر دوں گی۔۔۔!! میرا نام بھی شاہین ہے۔۔۔!! آخر اس کی ماں ہوں، مگر صرف ایک بار اس لیلیٰ کے بارے میں پتہ چل جائے؟'' اماں نے غصے سے کہا۔ ناظمہ نے سنا، اور اٹھ کر وہاں سے کسک گئی۔

☆.....☆.....☆

گلی میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں قیص نے گانا شروع کر دیا۔

لیلیٰ میری جان، لیلیٰ میری شان
تجھ پہ کروں میں اپنی جان قربان

وہ اونچی آواز میں گانا گاتا رہا، مگر نور سپانس نے قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دیئے۔ وہ جب گلی سے نکل رہا تھا، تو کئی بار بھی لیلیٰ کے گھر کے گیٹ پر نظریں گاڑ کر مڑ مڑ کر دیکھتا رہا۔ مگر وہ دشمن جان باہر ہی نہیں آئی۔

''اب میں صبح صبح کالج جا رہا ہوں۔ مگر میرا چہرہ اترا ہوا ہے، کالج جانے کے بعد سارا دن دوستوں سے لیلیٰ کی باتیں کروں گا۔ وہ بھی نئے نئے لیلیٰ نامی گانوں کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں۔۔۔!! تبھی میرے موبائیل میں لیلیٰ نامی گانوں کی بھرمار ہوگئی ہے، جن میں سے اکثر مجھے زبانی یاد بھی ہوگئے ہیں۔۔۔!!'' وہ خود سے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ اب وہ کافی دور تک سڑک پر چلا آیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فری کلاس میں قیص اپنے دوستوں کے ساتھ گراؤنڈ میں بیٹھا ہوا تھا اور اس کے اردگرد اس کے دوست بیٹھے تھے۔ وہ بھی اس کے لیلیٰ سے واقف ہو چکے تھے۔

''قیص تیرا اور لیلیٰ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔۔۔!! پرانی داستان لیلیٰ کے کرداروں کی طرح ملتے ہیں۔۔۔!!'' میرے دوست کامی نے کان میں کہا۔ قیص اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

''یار قیص تو نے لیلیٰ مجنوں کی مووی دیکھی ہے؟'' احتشام کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

''نہیں آج سب سے پہلے جا کے یہی مووی دیکھوں گا۔۔۔!!'' قیص نے اسد کی طرف دیکھا۔

''یار تو لیلیٰ کی تصویر تو دکھانا۔۔۔!! ہم نے بس صرف تیری زبانی ہی اس کی تعریفیں سن رکھی ہیں۔۔۔!! ہمیں اس دن یقین آجائے گا۔۔۔!! جس دن تم اس کی تصویر دکھاؤ گے۔۔۔!!'' زلفی نے اسد کو کندھا مارا، قیص زلفی کو دیکھ کر سر ہلانے لگا۔

''کمینو جب لیلیٰ تصویر دے گی تو دکھا دوں گا۔۔۔!! اب اس میں اتنا اُتاوَلا ہونے کی کیا

اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ

پریشانیوں سے چھٹکارہ
ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر کونے میں اثر کرتا ہے۔

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو
جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح
اولاد کا نہ ہونا یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی
کاروباری بندش
جنات کا سایہ
دیگر مسائل

سید عالم شاہ

کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں
وہ ہمیشہ دکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو بگڑے کام بنائے

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک مرتبہ ضرور لیں عامل وہ جس کا علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر سے پتھر دل محبوب تابع ہو گا اولاد فرمانبردار خاوند سے بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید سمجھ کر سید عالم شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون کال نے ہماری زندگی بدل دی۔

سسرال میں بہو سب کی آنکھ کا تارا بن سکتی ہے ہر کام رازداری کے ساتھ کلام الٰہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تعویز سے آپکی اجڑی ہوئی زندگی میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

خواہش زندگی کی کوئی خواہش ہے یا کسی کو پانے کی تمنا اپنوں کی بے رخی سے دکھی ہیں یا میاں بیوی کی رنجش کو ختم کرنا ہے

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہو گی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملایئے اور آزما لیجئے
ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیاں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہو گی

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو وہ آنکھیں ہی کیا جن میں شرم نہ ہو وہ علم ہی کیا جس میں عمل نہ ہو، وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو

سیّد عالم شاہ
رام تلائی چوک جی ٹی روڈ گجرات
0300-6282386

ضرورت ہے؟''قیس نے زلفی پر آنکھیں نکالیں۔

''ہائے تو اس سے ایک بار ملا ہے اور اس کا دیوانہ ہوگیا ہے۔۔۔!! میں تو یہ بات مان ہی نہیں سکتا۔۔۔!!'' سعد عرف سعدی نے اس کی طرف دیکھا۔

''سعد۔۔۔!! اگر تو اسے دیکھتا تو زندگی جینے کا مطلب سمجھ میں آجاتا۔۔۔!!'' قیس نے زندگی لمبی کر کے کہا۔

''اچھا پھر تو تمہاری لیلیٰ سے ملنا ہی پڑے گا۔۔۔!!'' اسفر نے فوراً کہا۔ وہ سب گول دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''لیلیٰ سے کب مل رہے ہو؟ اس بار اس سے کہہ دینا کہ میرے دوست بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں؟'' نوید نے بھی خاموشی توڑ دی۔

''ارے تم لوگ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو کہ میں تم لوگوں کو لیلیٰ سے ملواؤں گا۔۔۔!! لیلیٰ کی میں تم لوگوں کو صرف تصویر ہی دکھاؤں گا۔۔۔!! یہ بھلا کیا بات ہوئی، اب میں تم لوگوں کا ٹبر اپنی گلی میں لیلیٰ کے گھر لے کر جاؤں گا۔۔۔!! ایسا لگے گا، جیسے میں وقت سے پہلے بارات لے کر چلا گیا ہوں۔۔۔!!''

''کیا تم ہمیں اس کی تصویر دکھاؤ گے؟ یا یہ بھی ایسا ہی سوشا چھوڑ رہے ہو۔۔۔!!'' اسفر نے سب کو دیکھا۔

''ہاں۔۔۔!! جب وہ مجھے اپنی تصویر دے گی تو میں دکھادوں گا۔'' قیس نے جھٹ ہامی بھرلی۔

''یار، اپنی لیلیٰ سے کہہ دینا کہ میرے لیے بھی ایک گرل فرینڈ ڈھونڈ لے۔۔۔!! اکیلے زندگی بہت بور سی لگ رہی ہے۔۔۔!! اس کی کوئی بہن یا کزن بھی تو ہوگی نا۔۔۔!!'' شاہ میر نے کہا۔

''یار یہ کام تجھے خود کرنا پڑے گا، میری لیلیٰ مجھ سے ناراض ہوجائے گی۔ وہ کیا سمجھے گی کہ میں کیسا بندہ ہوں۔ جو اپنے دوستوں کے لیے گرل فرینڈ ڈھونڈنے کی بات کر رہا ہوں۔ اور ہاں دوبارہ ایسی بات بھول کر بھی مت کرنا۔'' اچانک ان کے پاس سر معراج رک گئے، انہوں نے غالباً قیس کی بات سن لی تھی۔

''ادھر کیا ہو رہا ہے؟ اچانک سر معراج نے کرخت آواز میں کہا۔

''سر میں ان لوگوں کو کل کے کیے گئے کام کی باتیں بتا رہا تھا۔ یہ شاہ میر کل نہیں آیا تھا۔۔۔!!'' قیس نے سر معراج کی طرف دیکھا۔

''جانے کب یہ مصیبت آکر ہمارے پیچھے کھڑے ہوگئے ہیں۔۔۔!!'' قیس نے دل ہی دل میں کہا۔

''اچھا۔۔۔!! ویسے میں نے تو تم لوگوں کی گفت و شنید میں صرف لیلیٰ نامہ ہی سنا ہے۔ شاہ میر یہ لیلیٰ کون ہے؟ سر معراج تو بال کی کھال اتارنے میں ماہر تھے۔

''سر۔۔۔!! یہ لیلیٰ، کون سی لیلیٰ؟'' قیس نے جلدی سے اپنے دوستوں کی طرف دیکھا۔ سب کو آنکھ کے اشارے سے منع کر رہا تھا۔

''سر قیس فلمی لیلیٰ کی بات کر رہا تھا۔ جو آج کل بیماری کی وجہ سے اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔۔۔!!'' نوید نے جلدی سے بات بنائی۔

''اوہ، تم لوگ گروپ بنا کر فلم اسٹار لیلیٰ کی باتیں کر رہے تھے۔ ویسے تم لوگوں کو شرم سے ڈوب مرنا چاہیے۔۔۔!!'' سر نے عینک درست کرتے ہوئے کہا۔

''نن۔۔۔ نہیں سر۔۔۔!! کون سی فلمی لیلیٰ؟ قیس تو اپنی لیلیٰ کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے محلے میں نئی آئی ہوئی ہے۔۔۔!! جب سے اس کی قیس سے ملاقات ہوئی ہے۔۔۔!! تب سے یہ اسی کی باتیں کر رہا ہے۔۔۔!!'' شاہ میر نے بات کھول کر رکھ دی۔

''ہاں سر، شاہ میر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔!!'' نوید نے کہا۔ قیس کا دل کیا کہ نوید اور شاہ میر کے سر آپس میں پھوڑ دے۔

''کیا۔۔۔؟'' سر معراج نے کیا اتنا لمبا کردیا، جتنی ریل کی پٹری ہوتی ہے۔

''سر یہ تو بکواس کر رہا ہے۔ میں کسی لیلیٰ کو نہیں

جانتا۔۔۔!!'' قیص نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چٹخائیں۔سرمعراج نے غور سے قیص کو دیکھا۔

''اچھا۔۔۔!! ویسے اگر جانتے بھی ہو، تو سن لو۔جتنا یہ لیلیٰ نام ڈینجرس ہے۔اس سے زیادہ لیلیٰ خطرناک ہوتی ہے۔۔۔!! ان لیلاؤں سے جتنا ممکن ہوسکے۔۔۔!! بچنا چاہیے۔۔۔!! ورنہ انجام بہت برا ہوتا ہے۔۔۔!!'' سرمعراج نے قیص کو غصے سے دیکھا اور چلے گئے۔قیص نے نوید اور شاہ میر کے سر آپس میں ٹکرا دیے۔

''اوئی ماں۔۔۔!!'' شاہ میر نے سر پر ہاتھ رکھا۔

اوئے ابا۔۔۔!!'' نوید کو دن میں تارے دکھا دیے۔

''تم دونوں میری برائیاں کررہے تھے۔۔۔!! بدذاتو، تم دونوں کو میں کبھی بھی لیلیٰ کی تصویر نہیں دکھاؤں گا۔۔۔!! بلکہ آج کے بعد تم دونوں سے لیلیٰ کی کوئی بات بھی نہیں کروں گا۔۔۔!!'' قیص نے دونوں پر آنکھیں نکالیں۔

''دیکھ قیص۔۔۔!! ہم نے کچھ نہیں کیا ہے، ہمیں تو دکھاؤ گے؟'' باقی دوستوں نے معصوم بن کر پوچھا۔

''ہاں۔۔۔!! اسفر تو میری جان ہے۔۔۔!!'' قیص نے اسفر کو گلے لگایا۔اچانک فری کلاس ختم ہوگئی اور وہ سب گراؤنڈ سے کلاس روم کی طرف جانے لگے۔نوید اور شاہ میر دل ہی دل میں قیص کو گالیاں دے رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

کالج سے واپسی پر وہ ہزاروں بار لیلیٰ سے سامنا کرنے کی دعائیں مانگتا رہا۔اس بار جیسے ہی قیص اپنی گلی میں داخل ہوگیا۔وہ دشمن جان اپنے دروازے کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔اس بار تو وہ بھی قیص کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔وہ بھی مسکرانے لگا۔وہ ہاتھ ہلاتا ہوا تیز قدموں اس کے پاس آکر رک گیا۔

''ہیں۔۔۔!! تم کہاں گم ہوگئی تھی؟ میں نے تمہارا کتنا انتظار کیا ہے؟'' قیص نے اس کے قریب پہنچ کر شکوہ کیا۔

''یہیں تو تھی، مگر گھر کے اندر تھی۔میرے والد محترم غصے کے بہت تیز ہیں۔اس کی وجہ سے میں تم سے مل نہ سکی۔۔۔!! وہ اتنے دنوں گھر پر تھے۔۔۔!! اگر وہ مجھے گلی میں دیکھ لیتے تو مجھے مار کر دم لیتے۔۔۔!! وہ غصے کے بہت تیز ہیں۔۔۔!!'' اس نے ایک ادا سے کہا۔

''اچھا، مگر میں نے تو تمہارے علاوہ کسی کو بھی محلے میں نہیں دیکھا۔تم کتنے بہن بھائی ہو؟ اور تمہارے والد کو بھی نہیں دیکھا ہے۔۔۔!!'' میں وہیں کھڑا تھا۔اس سے پوچھ گوچھ کرنے لگ گیا۔

''ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔میرا بھائی اس وقت کام پر جاتا ہے۔والد بھی کام کرتے ہیں۔کل وہ نہیں گئے تھے۔تو میں گھر پر تھی۔کیونکہ وہ گھر کے سامان کو سیٹ کررہے تھے۔کل ہی گھر کا سارا سامان سیٹ ہوگیا ہے۔۔۔!!'' لیلیٰ نے ایک ہی سانس میں بہت کچھ بتایا۔

اچھا۔۔۔!! اور تمہاری والدہ محترمہ گھر پر ہوتی ہیں؟'' قیص نے بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

''نن۔۔۔نہیں تو ان کا تو میرے بچپن میں انتقال ہوگیا تھا۔۔۔!! ہمیں ہمارے باپ نے سخت اصول اپنا کر پالا ہے۔۔۔!!'' لیلیٰ نے دوپٹہ منہ پر لپیٹ لیا۔اب صرف اس کی خوبرو آنکھیں نظر آرہی تھیں۔وہ ایسا جان بوجھ کر رہی تھی۔

''تمہاری بہن کا کیا نام ہے؟ وہ تم سے بڑی ہے یا چھوٹی ہے؟ اور بھائی کہاں کام کرتا ہے؟'' قیص نے کئی سوالات ایک ساتھ کردیئے۔جو بے حد فضول تھے۔

''میری بہن کا نام شیلا ہے، اس کی شادی ہوچکی ہے۔بھائی شہر میں کام کرتا ہے۔تم کیوں پوچھ رہے

ہو؟'' لیلیٰ نے گردن گھمائی پھرائی۔اس کی گردن راج ہنس کی طرح بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''ہوں، ویسے تم اس وقت گھر پر اکیلی ہو؟'' قیص کے دل کی کلی جیسے کھل گئی۔

''ہاں۔۔۔!! کیوں؟'' اس نے ناز سے بتایا۔

''میں تمہارے گھر چل سکتا ہوں؟'' قیص نے کان کجھایا۔

''میں نے تمہیں گھر چلنے کو تو نہیں کہا؟'' قیص کو غصے سے کہا۔

''کیوں؟ اس میں کیا برائی ہے؟ میں کچھ دیر ٹھہروں گا۔۔۔!! پھر واپس آجاؤں گا۔۔۔!!'' قیص نے ابرو اچکایا۔

''اس لیے کہ کہیں میرا باپ یا بھائی آگیا تو پھر کیا ہوگا؟ تم تو لڑکے ہو، وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔۔۔!! مگر میری خیر نہیں ہوگی۔۔۔!!'' لیلیٰ اس بار جیسے گھبرا کر وضاحت دینے لگی۔

''کچھ نہیں ہوگا۔۔۔!! بس تم دروازہ کھول دینا۔۔۔!! میں چھت پر جا کر چھپ جاؤں گا۔۔۔!! پھر موقع دیکھ کر آرام سے باہر آجاؤں گا۔۔۔!!'' قیص نے شرارت سے کہا۔

''نہیں قیص ایسا نہیں ہوسکتا۔۔۔!!'' اس نے صاف انکار کردیا۔

''لیلیٰ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔۔۔!! وہ بھی اکیلے میں، میں تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔۔۔!! تمہیں اپنے دل کا حال بیان کرنا چاہتا ہوں۔۔۔!!'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔اس نے مچھلی کی طرح تڑپ کر میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔اس کا ہاتھ بے حد سرد تھا۔اچانک گلی میں قیص کا بھائی میکال نظر آیا۔لیلیٰ نے اپنا ہاتھ قیص کے ہاتھ سے چھڑایا اور گھر کے اندر چلی گئی۔وہ اب دروازہ بند کرچکی تھی۔میکال کو قیص غصے سے دیکھنے لگا۔میکال اس کے پاس آگیا، وہ اس کی طرف غصے سے دیکھنے لگا۔میکال حیران ہوگیا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' میکال نے پوچھا۔

''تم نے کیا دیکھا؟'' قیص نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''کچھ نہیں۔۔۔!!'' میکال نے اس کی طرف دیکھ کر دونوں کندھے اچکا دیئے۔

''سچ بتاؤ۔۔۔!! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔۔۔!!'' قیص ابھی تک شک بھری نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''میں نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔۔۔!! جب میں گلی میں آیا، تم یہاں اکیلے کھڑے تھے۔'' میکال نے کہا، اور آگے بڑھ گیا۔قیص سوچ میں پڑ گیا۔

''اگر اس نے میرے ساتھ لیلیٰ کو دیکھا ہوتا، تو یہ گھر میں ضرور میری شکایت کرتا۔۔۔!! شکر ہے، اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا ہے۔۔۔!!'' قیص لیلیٰ کے گھر کے دروازے کو دیکھتا رہا۔اس نے گھر کے دروازے پر دستک دی، مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔اس نے دو تین بار دروازے پر مزید دستک دی۔اندر سے کوئی آواز تک سنائی نہیں دی۔قیص آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

رات کے وقت قیص موبائیل میں فاریٰ لیلیٰ کا گانا سن رہا تھا۔اسے فاریٰ نہیں آتی تھی، پر اسے اتنی سمجھ تھی، اس گانے میں لیلیٰ کا ذکر موجود ہے، تو اسے وہ گانا اچھا لگتا تھا۔اس کی ویڈیو بھی دور کسی آئی لینڈ پر بنائی گئی تھی، جو کافی اچھی تھی۔موبائیل سینے پر رکھ کر وہ سو گیا۔آسمان کے ستاروں میں گھرے چاند کو دور سے وہ دیکھ رہا تھا۔لیلیٰ دور کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی دکھائی دی، وہ اس کی طرف دونوں بانہیں پھیلائیں کھڑی اُسے اپنی اور بلا رہی تھی۔

''قیص یہاں میرے پاس آجاؤ۔۔۔!!'' وہ دور کے کسی آئی لینڈ میں موجود تھی۔جیسے ہی قیص تک اس کی آواز آئی۔قیص نے اسی طرف دوڑنا شروع کردیا۔قیص پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا، جانے

لگا۔آگے آئی لینڈ کے گرد جمع پانی تھا۔وہ لیلیٰ تک پہنچنے کے لیے پانی میں کود گیا۔اب وہ تیرتا ہوا کنارے کی طرف جا رہا تھا۔اب وہ کنارے پر تھا۔کنارے پر موجود وہ ایک چھوٹا سا پہاڑ تھا۔جس کی چوٹی پر لیلیٰ کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔قیس نے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔وہ بمشکل چوٹی تک پہنچا،لیلیٰ ابھی بھی دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔قیس نے مسکرا کر اس کے بازوؤں میں سمانا چاہا۔اس کے پیچھے پورا چاند آدھا چھپا ہوا نظر آرہا تھا۔جیسے ہی قیس اس کے پاس پہنچا،لیلیٰ نے اسے زور سے دھکا دے دیا۔وہ پہاڑی سے نیچے گرتا چلا گیا۔اس کے منہ سے بہت خوفناک چیخ نکل رہی تھی۔

''آہ ہ ہ۔۔۔!!'' اچانک ہڑبڑا کر اس نے دونوں آنکھیں کھول دیں۔وہ اپنے پلنگ پر تھا۔وہ سب ایک خواب تھا۔جاگتے وقت اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔وہ پلنگ میں بیٹھ گیا۔اور اس نے لیمپ کی روشنی جلائی۔کمرے میں رات کے تین بجے کا وقت نظر آرہا تھا۔قیس نے پیر زمین پر رکھے اور بلی کی چال چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔اب وہ لیلیٰ کے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔گلی میں پہنچ کر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔وہ چلتا ہوا خوابیدہ انداز میں لیلیٰ کے گھر کے دروازے کے باہر رک گیا۔اس نے دروازے کے پاس کان قریب کر دیا۔مگر اندر گہری خاموشی تھی۔وہ کتنی دیر تک بے یقینی سے اندھیرے میں ڈوبے اس گھر کو دیکھتا رہا۔

''ایک تو لیلیٰ کے گھر والے بہت کنجوس ہیں۔۔۔!! اس اندھیری رات میں گھر میں کوئی بھی لائٹ نہیں جلا رکھی ہے۔۔۔!!'' قیس نے خود سے کہا اور مڑ کر گھر کی طرف جانے لگا۔

☆.....☆.....☆

صبح قیس نک سک انداز میں کالج جانے کے لئے تیار تھا۔اس نے باڈی اسپرے کسی کمرشل کی طرح اپنے اوپر خالی کر دی۔اب وہ ٹائی باندھ رہا تھا۔کمرے سے بیگ سمیت باہر نکلا،اور ناشتے کے ٹیبل پر بیٹھ گیا۔گھر والوں نے کچھ ری ایکشن نہ دیا۔سب اپنے ناشتے میں مصروف رہے۔وہ اب باہر نکلا۔اور گلی میں سیٹی کی دھن پر جانے لگا۔

کبھی تو پیاری لگتی ہے،کبھی دیوانی لگتی ہے۔
کبھی تو پہیلی لگتی ہے،کبھی تو لیلیٰ لگتی ہے۔

وہ گانے کی دھن پر جاتا ہوا لیلیٰ کے گھر کے دروازے کے باہر رک گیا۔اچانک دروازہ کھولا۔اور لیلیٰ نک سک انداز میں باہر نکلی۔آج تو جیسے وہ بھی دل لگا کر تیار ہوگئی تھی۔اس کو دیکھ کر قیس کا دل ڈوب کر ابھرا۔

''شکر ہے،صبح تمہارے حسین چہرے کا دیدار تو ہوا۔۔۔!! اب میرا سارا دن اچھا گزرے گا۔۔۔!!''

لیلیٰ دروازے میں کھڑی تھی۔اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں آج تمہاری خاطر دل لگا کر تیار ہوئی ہوں۔۔۔!! کیسی لگ رہی ہوں؟'' لیلیٰ نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''میرے دل سے پوچھو؟ آج قیامت لگ رہی ہو۔۔۔!!'' قیس نے شوخی سے کہا۔لیلیٰ مسکرانے لگی۔وہ بھی مسکرا دیا۔

''رات کو تم میرے خواب میں آئی تھی۔۔۔!!'' قیس نے آگے بات بڑھائی۔لیلیٰ کے چہرے کے تاثرات عجیب سے ہوگئے۔وہ پریشان ہوگئی۔

''جھوٹ۔۔۔!!'' لیلیٰ نے اسے گھمبیر آواز میں کہا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔!! تم دور کسی آئی لینڈ میں موجود پہاڑ پر کھڑی مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔میں جب تمہاری طرف آیا،تو آئی لینڈ کے ٹھنڈے پانی نے میرا راستہ روک لیا،میں پانی میں کود گیا اور تیرتا ہوا کنارے پہنچ گیا۔جب میں پہاڑ پر چڑھ کر تمہارے پاس تمہیں گلے لگانے پہنچا،تو تم نے مجھے پہاڑ سے دھکا دے مارا۔میں پہاڑ سے گرتا چلا گیا۔'' وہ رات کا خواب لیلیٰ کے گوش گزار کرنے لگا۔

''اور پھر کیا ہوا؟'' لیلیٰ نے ناپسندیدہ انداز میں پوچھا۔

''پھر میری آنکھ کھل گئی۔۔۔!!'' قیص نے جھٹ بتایا۔

''یہ خواب جھوٹا تھا۔۔۔!!'' لیلیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر آئے بال ہٹائے۔ اچانک قیص کی نگاہیں اس کے ہاتھ پر بنے ٹیٹو پر گڑ کر رہ گئی۔ اس انگوٹھے کے نیچے پر ایک چھوٹا سا بلی کا چہرہ بنایا گیا تھا۔ جو بالکل کالا تھا۔ اس بلی کے نیچے تکون بنا تھا، جس میں ایک انسانی آنکھ بند تھی۔ مگر یہ سب بہت چھوٹا تھا۔

''تمہارے ہاتھ پر ٹیٹو بنا ہوا ہے؟'' قیص نے پوچھا۔ لیلیٰ گھبرا گئی اور اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں۔۔۔!! یہ اصلی نہیں ہے۔۔۔!! مارکر سے بنایا ہے۔۔۔!! سوچ رہی ہوں۔۔۔!! کسی دن اصلی بناؤں گی۔۔۔!!'' لیلیٰ نے مسکرا کر وضاحت کردی۔

''مگر یہ سائن کیوں؟ یہ کچھ عجیب نہیں لگ رہا ہے۔۔۔!!'' قیص کی الجھن ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے پراسرار چیزیں اٹریکٹ کرتی ہیں۔۔۔!! یہ تو آپ پر ہوتا ہے، آپ کس طرح کی تصویریں اپنے جسم پر کھدوانا چاہتے ہیں۔۔۔!! اس میں کچھ بھی عجیب نہیں ہے۔۔۔!! ویسے آپ کی نظر بڑی تیز ہے۔ نہ دکھائی دینے والی چیزیں بھی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں۔۔۔!!! میرے گھر والوں نے ابھی تک یہ نہیں دیکھا ہے۔۔۔!!'' لیلیٰ آخر میں مسکرانے لگی۔ مجبوراً قیص کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔ وہ کچھ کنفیوژ ہو گیا تھا۔

''کیا آپ کو کالج جانے سے دیر نہیں ہو رہی ہے؟'' لیلیٰ نے اس کی طرف معصومیت سے دیکھا۔

''ہاں، مگر آج میری چھٹی کرنے کا من بن گیا ہے۔۔۔!!'' قیص نے کہا۔

''ویسے بلا وجہ چھٹی کرنا اچھی بات نہیں ہے۔۔۔!!''

''آپ کے گھر میں کوئی ہے؟''

''ہاں بھائی سو رہا ہے۔۔۔!!'' لیلیٰ نے کہا۔ تو قیص کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

''اچھا، میں چلتا ہوں۔۔۔!! واقعی کالج سے دیر ہو رہی ہے۔۔۔!! آج دوپہر کو میں آپ کے گھر آؤں گا۔۔۔!! میں آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔۔۔!!'' لیلیٰ نے شرما کر دروازہ بند کردیا۔ وہ بھی گلی سے باہر نکلتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

کالج میں وہ فری کلاس میں ایسے ہی بیٹھا ہوا تھا، کلاس روم خالی تھی، صرف وہی تھا اور اس کا دوست شاہ میر جو اسے کینٹین جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ مگر وہ کاغذ پر کچھ بنانے میں مصروف تھا۔ شاہ میر اس کے ساتھ والے چیئر پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پینسل تھی، جس پر وہ ٹرائنگل ڈرا کر رہا تھا۔ شاہ میر نے کچھ کہنا چاہا۔ قیص نے اسے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ شاہ میر اس کا ڈرائنگ دیکھنے لگا۔ اب وہ ٹرائنگل ڈرا کر چکا تھا۔ اس کے اندر انسانی ایک آنکھ اپ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو صحیح بن نہیں پا رہی تھی۔ اس نے بمشکل آنکھ بنائی، مگر وہ بلی کی آنکھ سے مشابہہ تھی۔ اب وہ اس ڈرائنگ کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''یہ تمہیں پتہ ہے۔۔۔!! تم کیا بنا رہے ہو؟''

''یار تم کچھ دیر کے لیے خاموش ہو جاؤ۔۔۔!! ابھی بھی یہ مکمل نہیں ہے۔۔۔!!'' قیص نے اس کی طرف بنا دیکھے کچھ کہا۔ اب وہ بلی کی شکل بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دو تین لائنیں ہی کھینچی تھیں۔ جب اس کے کانوں میں شاہ میر کی آواز آئی۔

''کیا تم اس کے نیچے یا اوپر بلی، یا دو انگلیوں اور ایک انگوٹھے کا نشان بنانا چاہتے ہو؟'' شاہ میر نے تیزی سے پوچھا۔ اس نے ڈرائنگ چھوڑ کر شاہ میر کو دیکھا۔

''ہاں، میں بلی کا چہرہ بنانا چاہتا ہوں۔۔۔!! مگر تمہیں کیسے پتہ؟'' اس نے شاہ میر

کو دیکھا۔اس کے چہرے پر حیرانی رقم تھی۔

''یہ ڈرائنگ تو شیطانی ہے۔۔۔!!اگر کوئی لڑکا یہ ڈرائنگ بناتا ہے،تو اس کے نیچے یا اوپر بند ہاتھ کی دو انگلیاں، بند اور باقی تین کھلی چھوڑتا ہے،اور اگر کوئی لڑکی یہ ڈرائنگ کرتی ہے،تو اسی ٹرائنگل کے اندر ایک انسانی آنکھ کے اوپر یا نیچے بلی کا چہرہ ڈرا کرتی ہے۔۔۔!!'' شاہ میر کی بات سن کر اسے جھٹکا سا لگا۔لیلیٰ کے ہاتھ پر یہی ڈرائنگ تھی۔وہ لڑکی تھی،اسی لیے اس کے ہاتھ پر ٹرائنگل کے نیچے بلی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔کچھ دیر وہ حیران ہوتا رہا۔پھر اس نے بنا کچھ اثر لیے شاہ میر کو دیکھا۔

''اس سب کا شیطان سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو بس ایک ڈرائنگ ہے؟'' شاہ میر مسکرانے لگا۔

''جو لوگ شیطانی طاقتوں کو مانتے ہیں،وہ یہ سب کرتے ہیں۔مجھے تم پر حیرت ہورہی ہے؟تم یہ سب کیوں ڈرا کررہے ہو؟مگر یہ سب تو جسم پر کندکیا جاتا ہے۔اس کا شیطان سے بہت گہرا مطلب ہے، ٹرائنگل کا مطلب ہے، تین لوگ، مطلب یہ ہے کہ فرض کرلیتے ہیں، یہ سیدھی صرف ایک لکیر ہے۔اس کے اوپر اب یہ دوسری میں نے ڈرا کردی، اس کا مطلب ہے، دو لوگ، دو لوگوں میں ایک مرد اور دوسری عورت ہوسکتی ہے، یا دو دوست بھی ہوسکتے ہیں، بہن بھائی بھی، مگر اب یہ تیسری لکیر ہے۔جو اس ٹرائنگل کو پورا کردیتی ہے۔'' شاہ میر نے پہلی ایک سیدھی لکیر کھینچ لی، پھر اس کے اوپر سیونٹی زاویے کی دوسری اور آخر میں مخالف سے نیچے تک کھینچ کر،تو اس سے ایک ٹرائنگل کا شیف بنادیا۔

''تیسری لکیر شیطان کی ہے۔شیطانی لکیر ہر انسان کے دل میں موجود اسے ایک برائی کی طرف ٹریٹ کردیتی ہے، اس کا مطلب ہے، ٹرائنگل میں شیطانی طاقت موجود ہے، جس سے وہ دل کے حال سے واقف ہوجاتی ہے، وہ دل کے حال کو برائیوں میں بند کردیتا ہے۔اسے برائیوں پر اکساتا ہے،اس کے اندر انسانی آنکھ سے مراد شیطانی قوت ظاہر کرتی ہے۔جو ہر وقت انسانوں کو دیکھ رہی ہوتی ہیں۔اس کی دلی خواہشات سے واقف ہوتی ہیں،اس کے نیچے بلی کی تصویر برائی پھیلانے کی علامت ہے۔وہ بلی جو باآسانی سے چالاک، چست، تیز، مکار اور چڑیل مانی جاتی ہے۔جو دوسروں کا شکار کرتی ہے۔وہ شیطان کے قریب ہوتی ہے۔اگر کوئی لڑکی یہ ٹرائنگل اپنے وجود پر کندکرواتی ہے،تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے۔وہ انسان نہیں، بلکہ انسان کے لبادے میں کوئی اور چیز ہے، جیسے کوئی بدکار روح، یا پھر ڈائن وغیرہ بھی ہوسکتی ہے،وہ انسان بھی ہوسکتی ہے،مگر برائی کی راہ پر مائل ہوگی، اور اگر کوئی لڑکا،اسی طرح کا ٹرائنگل اپنے ہاتھ یا جسم کے کسی بھی حصے پر کندکرواتا ہے،تو اس کا مطلب ہوتا ہے،وہ شیطانی پیروکار ہے۔اچھائی برائی میں وہ برائی کا ساتھی ہے۔انسانی بند ہاتھ کی تین انگلیاں شیطان کا سائمبل (نشان) ہے۔یہ شیطانی سائمبل تم نے عموماً سپر ہیروز والی تمام موویز کے کسی نہ کسی پارٹس میں ضرور دیکھا ہوگا۔اسپائڈرمین جب ہاتھ سے تار نکالتا ہے،تو یہ نشان ظاہر کرتا ہے۔سپرمین جب ہوا میں اڑتا ہے،تو اس کے ہاتھوں کا نشان بالکل اسی طرح ہوتا ہے۔ مارول کی جتنی بھی بڑی فلمز ہیں،جس میں برائیوں کو ہیرو شکست دیتا ہے، وہ کسی نہ کسی سین میں اس طرح کا نشان وکٹری کے انداز میں ضرور ظاہر کردیتا ہے۔'' شاہ میر خاموش ہوگیا۔دونوں کے درمیان کچھ لمحوں کے لیے خاموشی چھاگئی۔پھر قیس نے خاموشی توڑ دی۔

''اور یہ سب تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ یہ سب سچ ہے۔۔۔!! آج کل یہ سب پاکستان میں بھی ہونے لگا ہے۔۔۔!! اس سے پہلے کالا جادو بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔۔۔!! لوگ پہلے پرانی طریقوں سے دوسروں کی زندگیاں تباہ کردیتے تھے۔یہ طریقے بھی بہت پرانے ہیں، مگر پچھلے پانچ سالوں میں بہت تیزی سے عام ہوگئے ہیں، یہ انگریزی

ہیں۔ وہاں سے یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ انگریزوں کی سیکرٹ سوسائٹی میں پہلے یہ چھپے ہوئے تھے، مگر جب سے یہ اپنا کر ان کو کامیابیاں ملنے لگی ہیں، لوگ ان پر یقین کرتے چلے گئے ہیں۔ اگر ایک ٹرائنگل کو بنا کر دوسرے کو الٹا کر کے اسی میں لگا دیں، تو اس سے چھ کونوں والا ستارہ بنتا ہے۔ اس کے اندر آج کل شیطانی پیروکار بیٹھ کر جادو کے منتر پڑھتے ہیں۔ پہلے زمانے کے لوگ دائرے میں بیٹھ کر منتر جنتر پڑھتے تھے۔ جو شیطانی عمل تھا، آج کچھ چیزیں بدل گئی ہیں۔ اسی چھ کونے والے ستارے کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہ شیطانی ہے۔ اس کے اندر ایک شیطانی دجالی آنکھ ڈرا ہوتی ہے، جس کا مطلب ہے شیطان کا ساتھی ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔

کیونکہ دجال کی ایک آنکھ ہے، اور وہی آنکھ کو یہ لوگ شیطان سے جوڑ دیتے ہیں، اس کے اندر شیطانی طاقت سوگنا موجود ہو جاتی ہے اور اس چھ کونے والے ستارے کا ہر کونا ہر طرف دیکھ سکتا ہے۔ ایک شیطانی آنکھ جو آج کل جتنی بھی بڑی سپر ہیروز والی ہالی ووڈ کی موویز ہیں، اسی کے لاگو مونوگرامز، امریکن کرنسی، ٹرائنگلز کے شیف، چھ کونوں والے ستارے، ہالی ووڈ کی ساری موویز میں کسی نہ کسی سین میں موجود ہیں۔ تمہیں پتہ ہے، یہ سب شیطان کو مانتے ہیں اور یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم بھی شیطان کی راہ اپنائیں۔ جس کو دجال کہتے ہیں۔

وہ لوگ اسے اپنا مسیحا دجال سمجھتے ہیں، یہ سب اسی کے آنے لیے کرتے ہیں۔ برائیاں پھیلاتے ہیں، تاکہ دجال جلد سے جلد آجائے، پہلے لوگ شیطان کی عبادت کرتے تھے، مگر ان لوگوں کو پتہ چلا، شیطان تو موجود ہے، مگر کبھی سامنے نہیں آئے گا، اسی لیے ان لوگوں نے دجال کی عبادت شروع کر دی، آج کل نئی صدی میں دجال کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں، جو دجال کے پیروکار ہوں گے، جب دجال دنیا میں آئے گا، اگر وہ لوگ جو، ان کے پیروکار تھے، وہ مر بھی گئے ہوں، تو دجال ان کو بلائے گا نہیں، وہ ان کو دوبارہ زندہ کر دے گا۔۔۔!! اور پھر ان کی وہ ساری خواہشیں پوری کر دے گا۔ جو وہ اپنی زندگی میں نہیں کر پائے تھے۔''

''یہ سب تمہیں کس نے بتایا ہے؟'' قیص نے اسے دیکھا۔ وہ ڈر سا گیا تھا۔

''یہ سب مجھے کسی نے نہیں، انہی لوگوں نے فلموں، کہانیوں، مونوگرامز، ٹکٹس، ڈرائینگز، کارٹونز اور بہت ساری سپر ہیروز والی موویز میں دکھا دکھا کر ہم لوگوں کو وقت سے پہلے خبردار کر دیا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ شیطان کا دیدار حاصل کرنے کے لیے شیطان کی عبادت کر کے ساری زندگی شیطان کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ وہ لوگ شیطان کے لیے بلی دان تک دیتے تھے، مگر پھر بھی شیطان کا قرب حاصل نہ کر پاتے اور آخر میں ناکام ہو کر جہنم واصل ہو جاتے۔

آج کے لوگ ان لوگوں کی طرح نہیں سوچتے ہیں، آج کے زمانے کے لوگوں نے اپنی الگ منفرد سیکرٹ سوسائٹی بنائی ہے، اس سوسائٹی کا نام ایلومیناٹی ہے۔ اس سوسائٹی میں شامل ہونے کے لیے لوگ ایلومیناٹی کا سہارا لیتے ہیں، اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے وہ اسی طرح کرتے ہیں، جتنے بھی بڑے اور کامیاب اداکار ہیں۔ وہ بھی اسی چیز کو مانتے ہیں۔ میں ہالی ووڈ کی بات کر رہا ہوں، اس ووڈ میں اب بڑی بڑی فلم انڈسٹریاں شامل ہو رہی ہیں۔ بالی ووڈ کی فلم انڈسٹری بھی اب اس ووڈ میں شامل ہو گئی ہے، زیادہ تر ان کی فلمز میں بھی اسی طرح کے سائمبولز دکھائے جاتے ہیں، ان سب کا مطلب صرف ایک ہے، لوگوں کو ذہنی طور پر دجال کی آمد سے پہلے تیار کرنا ہے۔ کیونکہ دجال کے پیروکاروں کا ماننا ہے، اگر دجال آجائے، تو وہ ان کا آدھا کام آسان کر سکتے ہیں۔ تم کو اگر میری باتوں پر یقین نہ آئے، تو تم انٹرنیٹ پر جا کر سرچ کر سکتے ہو۔۔۔!! تب تمہیں یقین آئے گا۔۔۔!! اس سوسائٹی پر دجالی پیروکاروں نے ستر سال سے محنت کی

ہے۔ دو ہزار پندرہ میں پاکستان کے اندر یہ چیزیں ظاہر ہوگئی تھیں۔ مگر پہلے لوگ خاموش تھے۔ اب بولنے لگے ہیں۔ شاہ میر خاموش ہوگیا۔ قیص نے اپنی ڈرائنگ کے بہت سارے ٹکڑے کرڈالے اور اسے پھینک دیا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا۔ وہ وقت سے پہلے آج کالج سے جانا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ نیٹ کیفے میں آدھے گھنٹے سے موجود تھا۔ اس کے اندر بیٹھا وہ اسی چیز کے بارے میں سرچ کررہا تھا۔ وہ ایلومیناٹی کے اوپر بے شمار کالم پڑھ چکا تھا، اس کے دماغ میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ انسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسان اتنا بھی گر سکتے ہیں۔ وہ لوگ دجال کی آمد کے انتظار کے لیے کیا کیا نہیں کررہے ہیں، جتنی پورن فلمز انڈسٹری ہیں، یہ سب صرف اس لیے قائم کی گئی ہیں کہ دنیا میں برائیاں پھیل جائیں، لوگ لڑکیوں کو چھوڑ کر لڑکوں کی طرف متوجہ ہوجائیں، لڑکیاں لڑکیوں سے ہم جنس پرستی کی طرف مائل ہوجائیں، لڑکے آپس میں شادیاں کرکے دنیا کی پرانی تہذیب کو بلا کر نئے نئے کاموں سے انٹروڈیوس ہوجائیں، بیرونی دنیا نے تو رفتہ رفتہ اس چیز کو لیگل تک کردیا تھا۔ بلکہ ہے۔ وہ جتنا پڑھ رہا تھا۔ اتنا ہی مزید جیسے اس کو حیرانگی ہورہی تھی۔ 2018ء میں کچھ پاکستانیوں نے ماڈلنگ فوٹوشوٹ میں ماڈلز نے ایلومیناٹی سائمبولز کا استعمال کرکے نا صرف آج یہ ثابت کردیا تھا کہ وہ نہایت ہی کامیاب ماڈلز بن گئے ہیں۔ اس کے جیسے پسینے چھوٹ گئے۔

ایک ماڈل کھڑی تھی، اس کے کانوں میں ایک آنکھ والی بالیاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کے پیچھے جو بیک گراؤنڈ تھا۔ اس میں چھ کونوں والا ستارہ تھا۔ اس ہاتھ میں جو بریسلٹ تھا۔ وہ ٹرائنگل شیف میں تھا۔ عام طور پر یہ بالکل بھی نہیں لگ سکتا تھا، یہ ایلومیناٹی فوٹوشوٹ ہے۔ اس کے کندھے پر بھی بڑا سا ٹیٹو دکھائی دے رہا تھا۔ جو بلی کا چہرہ تھا۔ کتنے لڑکوں کا فوٹو شوٹ اس نے دیکھا۔ جو ایلومیناٹی تھا۔ یہ شوٹ انٹرنیشنل لیول کے تھے۔ اس میں بڑے نامور پاکستانی ماڈلز شامل تھے۔

''اوہ تو شاہ میر سچ کہہ رہا تھا۔۔۔!!'' یوٹیوب پر بہت سارے چینلز وہ سرچ کرچکا تھا۔۔۔!! وہ لوگ بھی ایلومیناٹی پر آدھے آدھے گھنٹے کی ویڈیوز بنا چکے تھے۔ وہ لوگ بہت سارے دلائل پیش کرچکے تھے۔

''یہ لوگ خود دجال کا کام آسان کرچکے ہیں۔۔۔!! سوسائٹی ایلومیناٹی کا صرف ایک ہی کام ہے۔۔۔!! وہ ایک ہی مشن پر کام کررہی ہے۔۔۔!! بے حیائی، اور برائی، اگر بے حیائی دنیا میں عام ہوجائے، تو لوگ برائی کو برائی کہنا چھوڑ دینگے۔۔۔!!'' قیص نے کمپیوٹر کو شٹ ڈاؤن کردیا۔ اب وہ کیفے سے باہر نکل رہا تھا۔ باہر آکر اس نے گھنٹے کے پیسے ادا کردیے۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔

''تو کیا لیلیٰ ایک ایلومیناٹسٹ ہے۔۔۔!! معاشرے میں برائی پھیلا رہی ہے۔۔۔!! شیطان کو مانتی ہے۔۔۔!!''

''ہاں۔۔۔!! بالکل کالم میں لکھا تھا۔۔۔!! ایلومیناٹی کی سب سے بڑی نشانی یہی ہے۔۔۔!! اس کے جسم پر شیطانی دجال کا نشان ہوگا۔۔۔!! یہ لوگ ہمیشہ نئے فتنے پھیلانے کے لیے دنیا میں پھیلتے ہیں۔۔۔!! جیسے نئے مذاہب بنا کر لوگوں کو اس کی طرف راغب کرتے ہیں۔۔۔!!'' قیص نے بے چینی سے نفی میں گردن ہلائی۔ اور گھر کی طرف آہستہ قدموں سے جانے لگا۔

☆.....☆.....☆

قیص اپنی گلی میں داخل ہوگیا، اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ گھوم رہا تھا۔ اچانک لیلیٰ کے گھر کا دروازہ کھلا، اور لیلیٰ باہر نکل آئی۔ قیص نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ قیص مسکرا بھی نہیں سکا۔ آج لیلیٰ ریڈ کلر میں غضب ڈھا رہی تھی۔ اس کی سرخ لپ اسٹک بہت گہری لگ رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھوں میں سرخ رنگ کی چوڑیاں بھی اچھا تاثر دے رہی تھیں۔

''اچھا ہوا، جو تم مل گئی۔۔۔!! میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔۔۔!!'' قیص نے مسکرا کر کہا۔ وہ ہنس دی۔

''ہاں میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔!! آج صبح سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔۔۔!! میں کیسی لگ رہی ہوں؟ آج میں خاص طور پر تمہارے لیے تیار ہوئی ہوں۔۔۔!!'' اس نے جلدی سے کہا۔ قیص نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ قیص کو جھٹکا سا لگا۔ وہ نشان ابھی تک اس کے ہاتھ پر موجود تھا۔ لیلیٰ کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

''لیلیٰ کیا تمہیں سردی لگ گئی ہے؟ تمہارا ہاتھ بے حد سرد ہے۔۔۔!!'' قیص نے اس کا ہاتھ غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔!! ہوسکتا ہے کہ ایسا ہو، مگر کیا تمہیں پتہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ سرد ہوتے ہیں، وہ وفا پرست ہوتے ہیں اور میں وفا پرست ہوں۔۔۔!! آج میں تمہاری خواہش پوری کردوں گی۔۔۔!! تم جو چاہو گے۔۔۔!! وہ ہوجائے گا۔۔۔!!'' لیلیٰ نے آخر میں اپنی بات کا مزہ لیا۔

''تمہارا موبائل نمبر کیا ہے؟'' قیص نے موبائل جیب سے نکالا۔

''میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔'' لیلیٰ نے بے چینی سے کہا۔ وہ اس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر ایک دم سے بے چین ہوگئی۔

''کیا؟ اس جدید دور میں تمہارے پاس موبائل نہیں ہے۔ میں تو یہ مان ہی نہیں سکتا؟'' قیص نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں....!! میرے والد اس چیز کے سخت خلاف ہیں۔ وہ ہمارے گھر میں موبائل نہیں چھوڑتے ہیں۔۔۔!! وہ سمجھتے ہیں۔۔۔!! موبائل لڑکے لڑکیوں کا آدھا مسئلہ حل کردیتا ہے۔۔۔!!'' لیلیٰ نے افسردہ ہو کر بتایا۔

''تو ان کا تم سے رابطہ کس طرح رہتا ہے؟'' قیص اپنے موبائل پر انگلیاں چلانے لگا، اس نے موبائل کو آن کردیا۔

''وہ دن میں کئی بار گھر کا چکر لگا لیتے ہیں۔!! ان کی تسلی اسی بات سے ہوجاتی ہے۔۔۔!! آج میں تمہیں گھر کے اندر لے جاؤں گی۔۔!! تم آج جو بھی کہنا چاہتے ہو۔۔۔!! وہ میں سنوں گی۔۔۔!!'' لیلیٰ نے غور سے قیص کے ہاتھوں کو دیکھنا شروع کردیا۔

''چلو، پھر تو ٹھیک ہے۔۔۔!! میں تمہاری ایک تصویر بنالوں۔۔۔!! میرے سارے دوست تمہاری تصویر دیکھنے کی فرمائش کررہے ہیں۔۔۔!!'' قیص نے موبائل اس کے چہرے کے سامنے کردیا۔ موبائل کا کیمرہ آن تھا۔ قیص موبائل میں نہیں اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیلیٰ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''یہ تم کیا کررہے ہو؟ مت کرو۔۔۔!!'' اس نے چہرہ پلو میں چھپایا اور دونوں ہاتھوں سے موبائل کو پرے ہٹانے لگی۔ جیسے یہ کوئی زہریلی چیز ہو۔

''لیلیٰ میں کسی کو نہیں دکھاؤں گا میں قسم کھاتا ہوں۔۔۔!! اپنے دوستوں کو بھی نہیں دکھاؤں گا۔۔۔!!'' قیص نے اس کو دیکھا، اس کے ہاتھ سرخ پڑ گئے تھے۔

''نہیں....!! یہ چیز بند کردو۔ ہٹادو۔۔۔!! دور کرو۔۔۔!!'' وہ جیسے غصے سے غرائی۔ اس کی آواز ایک دم سے بھاری پڑ گئی تھی۔

''اللہ پاک کی قسم۔ میں کسی کو نہیں دکھاؤں گا۔۔۔!! ہاں بس ایک تصویر کی بات ہے۔۔۔!!'' قیص نے قسم کھائی۔ اچانک اس نے کیمرے میں دیکھا۔ اسکرین پر لیلیٰ کے ہاتھ بنا گوشت کے نظر آرہے تھے۔ اس نے لیلیٰ کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ دوبارہ موبائل اسکرین کو دیکھا۔ وہ چہرہ چھپا کر

کھڑی تھی۔ قیص نے موبائیل کا کیمرہ اس کے پیروں کی طرف کردیا۔ پیر بھی بنا گوشت کے صرف ڈھانچے کے تھے۔ وہ کانپ کر رہ گیا۔ اس کے بال نہیں تھے۔ اچانک وہ ڈھانچہ بھی اسکرین سے غائب ہوگیا اور اس کی جگہ کالے دھویں نے لے لی، جو اسکرین میں مرغولے کی طرح اٹھ رہا تھا۔ قیص کے ہاتھ پیر کانپ اٹھے۔

''کون ہو تم؟'' قیص تھر تھر کانپ اٹھا۔ اچانک لیلیٰ نے اپنے چہرے سے پلو ہٹایا۔ موبائیل کی اسکرین میں اس کا چہرہ نظر آیا۔ وہ گوشت سے عاری ایک ڈھانچے کا چہرہ تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے، قیص کے ہاتھ تھر تھر، تھر کانپ کر رہ گئے اور وہ لرزنے لگا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ مگر وہ بال نہیں سانپ تھے۔ اس کی آنکھیں نہیں وہ گہرے گھڑے تھے۔ جو آگ کی طرح روشن تھے۔ اس نے کانوں میں جو بندے پہن رکھے تھے۔ وہ کھوپڑی کے بنے تھے۔ اس کے گلے میں انسانی ہڈیوں کی مالا تھی۔ اور جو لباس موبائیل میں نظر آیا۔ وہ بہت عجیب تھا۔ جیسے بہت سارے چمک کے رنگوں سے مل کر بنایا گیا ہو۔

''لیلیٰ۔۔۔!!'' اس نے پکارا تو وہ اپنی جگہ سے غائب ہوگئی۔ قیص نے موبائیل کے کیمرے کو پریس کیا اس نے تصویر اُتاری۔ پر وہ بلینک تھی۔ موبائیل اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر گیا اور وہ لرزنے لگا۔ گھر جاتے ہوئے اس کے پیر کئی بار لڑکھڑائے۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ بے ہوش ہوگیا اور گر گیا۔

☆.....☆.....☆

جب قیص کو ہوش آیا، تو کئی دن بیت چکے تھے، جب اس نے آنکھیں کھولیں، تو وہ گھر کے اپنے کمرے میں تھا۔

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔۔۔!! میں ایک چڑیل کے شکنجے میں پھنسنے سے پہلے بچ گیا۔۔۔!!'' جب وہ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ تو اس کے سارے گھر والے اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کررہے تھے۔ سب نے اسے واپس زبردستی کمرے میں لٹادیا۔ اگلے دن جب وہ ٹھیک ٹھاک ہوگیا۔ اس نے محلے والوں سے معلومات حاصل کرنی شروع کردی۔

اس خالی گھر میں پچھلے ہفتے کوئی شفٹ ہوا تھا۔ سب نے انکار کردیا۔ سب کا یہی کہنا تھا۔ یہ گھر تو بالکل خالی ہے۔ اس میں کوئی بھی شفٹ ہی نہیں ہوا ہے۔ وہ حیران سا واپس گھر کو آگیا۔ اس نے گھر والوں کو بتایا۔ مگر اس کا یقین کسی نے نہیں کیا۔ جیسے ہی اس کا بھائی گھر میں آیا، وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا، وہ اپنے بھائی میکال کے پاس بیٹھا اسے بتا رہا تھا۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔!! اس گھر میں ایک لیلیٰ نام کی لڑکی رہتی تھی۔۔۔!! جو اکثر مجھ سے ملتی تھی۔۔۔!! وہ بہت پیاری تھی۔۔۔!! مگر اصل میں وہ ایک ڈائن تھی۔۔۔!! اور وہ مجھے مارنا چاہتی تھی۔'' میکال نے اسے تاسف سے دیکھا۔

''لگتا ہے۔ تمہیں بے موسم گرمی چڑھ گئی ہے۔۔۔!! اس لیے تو تم بے ہوش ہوگئے تھے۔۔۔!! حالانکہ اس نئے سال کی آمد پر تم بے ہوش کیسے ہوگئے ہو؟''

''میں نے ایک چڑیل دیکھی تھی۔۔۔!!'' وہ میکال پر چیخا۔

''مجھے لگتا ہے، تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔۔۔!! بہتر یہی ہے، تم چڑیل کے بجائے اپنا علاج شروع کردو۔ ورنہ لوگ تمہیں پاگل سمجھ کر تم سے دور ہوجائیں گے۔۔۔!!'' وہ وہاں سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

''کسی نے میری بات کا یقین ہی نہیں کیا۔۔!! سب نے اسے میرے دماغ کا خلل سمجھا۔۔۔!! میں ان سب کو کیسے یقین دلاؤں۔۔۔!! جو کچھ میں نے دیکھا تھا۔۔۔!! وہ سب سچ تھا۔۔۔!!'' وہ پریشانی سے سوچ رہا تھا۔ وہ کئی دن تک کالج بھی نہ جاسکا۔

☆.....☆.....☆

ایک رات جب وہ سوگیا تو لیلیٰ اس کے خواب میں آئی۔ وہ اس کو دیکھ کر ڈر گیا۔ چیخ مار کر اٹھ بیٹھا۔

''قیس.....!! تم قسمت والے ہو، جو میرے شکنجے میں آنے سے پہلے نکل گئے۔ ہر سال میں کسی نہ کسی کو اپنا شکار بنا لیتی ہوں۔ اس نئے سال میں تم میرے پہلے شکار تھے۔ مگر تم نے میرا چہرہ دیکھ لیا اور یوں میں ناکام ہوگئی۔ اب میں اگلے سال آؤں گی۔ کسی کو اپنا شکار کرنے۔ جس جگہ خالی گھر ہوتا ہے۔ میں اکثر وہاں اپنا بسیرا کر لیتی ہوں۔ مگر میں شکار کو تب تک بے وقوف بناتی ہوں۔ جب تک وہ بنتا ہے، اس دوران اگر شکار کو شک ہو جاتا ہے کہ میں ایک انسان نہیں کچھ اور ہوں تو میں اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہوں۔۔۔!! تم میرے ہاتھ کا ٹیٹو دیکھ کر تمہیں شک ہوگیا تھا۔ یہ نشان اس کے ہاتھ پر ہوتا ہے، جو شیطانی قوتوں کا پیروکار ہوتا ہے۔ ہم بھی انسانوں کی طرح پہلے شیطان کو پوجتے تھے، مگر جب بہت پوجنے کے بعد بھی ہمیں شیطان کا قرب حاصل نہ ہوسکا، تو ہم نے تم لوگوں کی طرح دجال کا انتظار کرنا شروع کر دیا۔ دجالی قوتیں شیطان سے زیادہ خطرناک ہوں گی۔ ہم لوگ بھی پہلے ڈیول فاور پر یقین رکھتے تھے، مگر ڈیول صرف راہ سے بھٹکا کر چھوڑ دیتا ہے، اس لیے ہم نے مسیحا کا انتظار کرنا شروع کر دیا ہے، جیسے بہت سارے انسان مسیحا دجال کا انتظار کر رہے ہیں، اس طرح ہم بھی اسی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

ہم میں سے بھی بہت سارے لوگ ایلومیناٹی بن گئے ہیں، ہم اس سیکرٹ سوسائٹی سے جڑ گئے ہیں، جو انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے، وہ جب آئے گا، دنیا کو تباہ و برباد کر دے گا۔ ہر طرف برائی کا راج ہوگا۔ تم میرے شکار بننے سے بچ گئے۔ اس کا مجھے افسوس رہے گا۔ میں صرف ان لوگوں کا انتخاب کرتی ہوں۔ جن کا برج جدی capricorn ہوتا ہے، جو نئے سال کے آوائل میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم بھی اپنی تاریخ پیدائش دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہو۔ اب مجھے ایک سال انتظار کرنا ہوگا کیونکہ کل ہی جدی کی آخری تاریخ تھی۔ آج کے دن کے بعد دوسرا برج شروع ہو جائے گا اور مجھے تمہاری بلی دان کر کے اپنی زندگی اور دجال کی آمد تک کا ساتھ مانگنا تھا۔

''اگر میں مر بھی گئی، تو ہمارا مسیحا ہمیں پھر سے زندہ کر دے گا۔'' لیلیٰ اس کے خواب میں اپنی اصل صورت میں آئی تھی۔ اس نے چیخ مار کر آنکھ کھول لی۔

''آہ ہ ہ۔۔۔!!'' اس کی چیخ کی بازگشت کمرے میں گونج کی صورت میں سنائی دیتی رہی۔ کچھ بھی نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب وہ طنزیہ ہنس رہا تھا۔

''تم لوگوں کی طرح تمہارا دجال بھی جھوٹا ہے۔۔۔!! اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔۔۔!! وہ جب دنیا میں آئے گا، تو ہمارا مسیحا (امام مہدی۔ اور حضرت عیسیٰؑ) بھی دنیا میں آ کر اس کی تباہی کے لیے تیاری کر چکے ہوں گے۔۔۔!!

جس طرح شیطان کا قرب لوگوں نے حاصل کر کے کچھ بھی نہیں پایا۔۔۔!! اسی طرح دجال کا ساتھ پانے کے بعد بھی تم لوگ خالی ہاتھ رہو گے۔۔۔!! تم لوگ سراسر دھوکے میں ہو۔۔۔!! تم لوگوں کو کبھی دوبارہ اس دنیا میں زندگیاں واپس نہیں مل سکتی ہیں۔'' اس نے وضو کر کے پہلی بار تہجد کی نماز پڑھی۔ اب وہ دعا مانگ رہا تھا۔

''میری آئندہ لڑکیوں کے ساتھ دوستی کرنے سے توبہ۔۔۔!!'' اس دن کے بعد آج تک اس نے نہ خواب میں اور نہ کبھی حقیقت میں لیلیٰ کو دیکھا ہے۔

خیال رکھیے گا کہیں آپ کا لیلیٰ سے ٹاکرا نہ ہو جائے؟ کیونکہ ایلومیناٹی کی دنیا نے صرف انسانوں پر نہیں، جنات پر بھی اپنا اثر چھوڑ دیا ہے۔ جہاں پوری شدت سے دجال کا انتظار کیا جا رہا ہے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com